

عاشقِ حنا

نمبر 2018

شعاعِ حنا

URDU TUBE

HOME OF ENTERTAINMENT

www.urdu tubes.com

سرگپر کیلنٹ

ماہنامہ

حنا

جلد: 40 شماره: 11

نومبر 2018

قیمت: 70/- روپے

بانی: سردار محمود

مدیر اعلیٰ: سردار طاہر محمود

مدیرہ: تسنیم طاہر

نائب مدیران: ارم طارق

تحریر محمود

مدیرہ خصوصی: فوزیہ شفیق

قانونی مشیر: سردار طارق محمود

(ایڈوکیٹ)

آرٹ ایڈیٹر: کاشف گوریجہ

اشتہارات: خالدہ جیلانی

افراز علی لازش

URDU TUBE

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلامی ناول

اسلامیات

16 دل گزیدہ اہرم

7 اقبال عظیم
7 ریحہ امروہوی
8 ادارہ

حرف
نعت

پارے نبی کی پیاری بانیں

مکمل ناول

انشاء نامہ

28 تم میرے ہو دشمن بلال
64 محبت کافسوں سوناچہ ہدی
162 مجھے اڑنے دو مریم ہاضمہ

14 بادشاہت کی تلاش میں ابن انشاء

ناولٹ

افسانے

100 قصین اختر شہر دل کا راستہ
120 رابعہ انصار اک نام تمہارا
140 بشری سیال می رقصم
200 ریحانہ آفتاب تودھر مکن میں دل

219 حبشہ

تاشیر مسیحائی



انتباہ: ماہنامہ حنا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پیش کردہ تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، اور نہ کسی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹھیکیل اور سنسے وارڈ کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔



URDU LIBRARY

A HOME OF KNOWLEDGE

www.urduhub.com



229	تہنیم طاہر	بیاض	226	تحریک محمود	حاصل مطالعہ
239	افراج طارق	حنا کا دسترخوان	237	سانہ محمود	میری ڈائری ہے
241	کس قیامت کے یہ نامے	فوزیہ شفیق	235	بتیس بٹی	رنگ حنا
			233	عین عین	حنا کی محفل



سرمد طاہر محمود نے نواز پر ہنگ پرپس سے چھوڑا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرگرم روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: **ماہنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرگرم روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37310797, 042-37321690 ای میل ایڈریس:
monthlyphina@hotmail.com, monthlyphina@yahoo.com



قارئین کرام! نومبر 2018ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی ظالمانہ کاروائیوں میں تیزی آگئی ہے۔ گزشتہ دنوں ایسی ہی ایک کاروائی میں چودہ نہتے معصوم شہری شہید کر دیے گئے۔ اس کاروائی کے خلاف جب مقامی شہریوں نے احتجاج کیا تو ان پر بھی فائرنگ کر دی گئی جس سے متعدد لوگ شہید ہو گئے۔ ایسی ظالمانہ کاروائیوں کی رپورٹنگ روکنے کے لئے وادی میں انٹرنیٹ سروس بھی معطل کر دی گئی۔

ہماری حکومت نے مظلوم کشمیریوں پر روا رکھے جانے والے مظالم کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان کی حمایت کا اعادہ کیا ہے۔ کشمیریوں کے مطالبات اقوام متحدہ کے ضابطوں اور بین الاقوامی انسانی حقوق کے چارٹر کے عین مطابق ہیں۔ بھارت دنیا کے سامنے خود کو سب سے بڑی جمہوریت کے طور پر پیش کرتا ہے مگر کشمیریوں کے معاملے میں اس کا ریکارڈ انتہائی شرمناک ہے، کئی لاکھ کشمیری بھارت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں۔ مگر بھارت کشمیریوں کو استغواب رائے کا حق دینے کو تیار نہیں، مقبوضہ کشمیر میں ہونے والا کشمیریوں کا قتل عام مہذب دنیا کی توجہ چاہتا ہے۔ کشمیری لوگ غلط مطالبہ نہیں کر رہے وہ صرف اپنے بنیادی حقوق مانگ رہے ہیں۔ وہ حقوق جن کی ضمانت اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کمیشن دیتے ہیں آج نہیں توکل کشمیری اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، انشاء اللہ۔

اس شمارے میں:- درشن، سونیا چوہدری اور مریم ماہ منیر کے مکمل ناول، بشری سیال، تحسین اختر، رابعہ افتخار اور رجحانہ آقاب کے ناول، حنا بشری کا افسانہ اور ام مریم کے سلسلے وار ناول کے علاوہ حنا کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سرمد ارطاہر محمود

نعت رسول مقبول

حمد باری تعالیٰ

کس کا جمال ناز ہے جلوہ نما یہ سو بہ سو
گوشہ بگوشہ در بدر قریہ بہ قریہ کو بہ کو

اشک فشاں ہے کس لئے دیدہ مختل مرا
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

مری نگاہ شوق میں حسن ازل ہے بے حجاب
غنجہ بہ غنجہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

جلوہ عارض نئی رشک جمال یوسفی
سینہ بہ سینہ سر بہ سر چہرا بہ چہرا ہو بہ ہو

زلف دراز مصطفیٰ گیسوئے لیل حق نما
طرہ بہ طرہ خم بہ خم حلقہ بہ حلقہ مو بہ مو

یہ میرا اضطراب شوق رشک جنون قیس ہے
جذبہ بہ جذبہ دل بہ دل شیوہ بہ شیوہ خو بہ خو

تیرا تصور جمال میرا شریک حال ہے
نالہ بہ نالہ غم بہ غم نعرہ بہ نعرہ ہو بہ ہو

نام بھی تیرا عقیدت سے لیا جاتا ہوں
ہر قدم پر تجھے سجدے بھی کیے جاتا ہوں

کوئی دنیا میں مرا مونوں و غمخوار نہیں
تیری رحمت کے سہارے پہ بیٹے جاتا ہوں

تیرے اوصاف میں اک وصف خطا پوشی ہے
اس بھروسے پہ خطائیں بھی کیے جاتا ہوں

آزمائش کا عمل ہو کہ مسرت کا مقام
سجدہ شکر بہر حال کیے جاتا ہوں

زندگی نام ہے اللہ پہ مر مٹنے کا
یہ سبق سارے زمانے کو دیے جاتا ہوں

مہر کرنا ہے تری شان کریں کو عزیز
میں یہی سوچ کر آنسو بھی پیے جاتا ہوں

ہر گھڑی اس کی رضا پیش نظر ہے اقبال
شکر ہے ایک سلیقے سے بیٹے جاتا ہوں

رئیس امردہوی

اقبال عظیم

وہ بھاری بھاری باتیں

ادارہ

جل اور صفین اور قنہ عثمان اور شہادت حسین
رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے سوا بہت سے فساد جو
مسلمانوں میں ہوئے) (صحیح مسلم)

فتنوں کا بیان

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم
سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بیٹھے
ہوئے تھے، انہوں نے کہا۔

”تم میں سے کس نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کو فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے سنا
ہے؟“

بعض لوگوں نے کہا کہ۔

”ہاں ہم نے سنا ہے۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”شاید تم فتنوں سے وہ فتنے سمجھے ہو جو آدمی
کو اس کے گھربار اور مال اور ہمسائے میں ہوتے
ہیں۔“

تو انہوں نے کہا کہ۔

”ہاں۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ”ان
فتنوں کا لغوار تو نماز اور روزے اور زکوٰۃ سے ہو
جاتا ہے لیکن تم میں سے ان فتنوں کے بارے
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کس نے
سنا ہے جو دریا کی موجوں کی طرح اٹھ کر آئیں
گے؟“

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ

جب برائی زیادہ ہو جائے

ام المؤمنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا
سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نیند سے جاگے اور فرمایا۔

”لا الہ الا اللہ خرابی ہے عرب کی اس آفت
سے جو نزدیک ہے آج یا جوج اور ماجوج کی آڑ
اتنی کھل گئی۔“

اور (راوی حدیث) سفیان نے دس کا
ہندسہ بتایا، (یعنی انگوٹھے اور کلہ کی انگلی سے حلقہ
بتایا)

میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم! کیا ہم تباہ ہو جائیں گے، ایسی حالت
میں جب ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جب برائی زیادہ ہوگی۔“ (یعنی فسق و
فجور یا زانیہ اولاد زانیہ معاصی)

(صحیح مسلم)

فتنوں کا نزول

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ
کے غلوں میں سے ایک محل پر چڑھے پھر فرمایا۔

”تم دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں؟ بے شک
میں تمہارے گھروں میں فتنوں کی جگہیں اس
طرح دیکھتا ہوں جیسے بارش کے گرنے کی جگہوں
کو۔“ (یعنی بہت ہوں گے بوندوں کی طرح مراد

لوگ خاموش ہو گئے، میں نے کہا کہ میں نے سنا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”تو نے سنا ہے تیرا باپ بہت اچھا تھا۔“

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ۔

”فتنے دنوں پر ایسے آئیں گے ایک کے

بعد ایک، ایک کے بعد ایک جیسے بورے کی

تیلیاں ایک کے بعد ایک ہوں گی پھر جس دل

میں فتنہ رچ جائے گا اس میں ایک کالا داغ پیدا

ہوگا اور جو دل اس کو نہ مانے گا تو اس میں ایک

سفید نورانی دھبہ ہوگا یہاں تک کہ اسی طرح

کالے اور سفید دھبے ہوتے ہوتے دوسم کے دل

ہو جائیں گے، ایک تو خالص سفید دل چلنے پھرنے کی

طرح جس کو کوئی فتنہ نقصان نہ پہنچائے گا جب

تک کہ آسمان وزمین قائم رہیں، دوسرے کالا

سفیدی مائل یا لالے کوزے کی طرح جو نہ کسی اچھی

بات کو اچھی سمجھے گا، نہ بری بات کو بری مگر وہی جو

اس کے دل میں بیٹھ جائے۔“

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ

پھر میں نے سیدنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث

بیان کی کہ۔

”تمہارے اور اس فتنے کے درمیان میں

ایک دروازہ ہے جو بند ہے مگر نزدیک ہے کہ وہ

ٹوٹ جائے۔“

(صحیح مسلم)

شیطان کا فتنہ ڈالنا

سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔

”ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے

لفکروں کو دنیا میں فساد کرنے کو بھیجتا ہے، پس اس

سے مرتبہ میں زیادہ قریب وہ ہوتا ہے کہ جو بڑا

فساد ڈالے، کوئی شیطان ان میں سے آکر کہتا

ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام کیا، (یعنی فلاں

سے چوری کرائی، فلاں کو شراب پلائی) تو

شیطان کہتا ہے کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا، پھر کوئی آ

کر کہتا ہے کہ میں فلاں کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ

اس میں اور اس کی بیوی میں جدائی کرادی تو اس

کو اپنے پاس کر لیتا ہے کہ ہاں تو نے بڑا کام کیا

ہے۔“ اعرش نے کہا کہ۔

”اس کو چٹا لیتا ہے۔“

(صحیح مسلم)

فتنہ مشرق کی طرف سے ہوں گے

سیدنا سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے تھے۔

”اے عراق والو! میں تم سے چھوٹے گناہ

نہیں پوچھتا، نہ اس کو پوچھتا ہوں جو کبیرہ گناہ

کرتا ہو، میں نے اپنے والد سیدنا عبد اللہ بن عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، وہ کہتے تھے۔

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ

فتنہ ادھر سے آگے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا

جہاں شیطان کے دونوں سینک نکلتے ہیں اور تم

ایک دوسرے کی گردن مارتے ہو (حالانکہ مومن

کی گردن مارنا کتنا بڑا گناہ ہے) اور موسیٰ علیہ

السلام نے فرعون کی قوم کا ایک شخص مارا تھا اور وہ

غلطی سے مارا تھا (نہ بہ نیت، قتل کیونکہ کھونٹے

سے آدی نہیں مرتا) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا

کہ۔

”تم نے ایک خون کیا پھر ہم نے تجھے غم

سے نجات دی اور تجھ کو آزمایا جیسا آزمایا تھا (طہ ۴۰)۔

قیصر اور کسریٰ کے خزانے

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”جب کسریٰ (ایران کا بادشاہ) مر گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر (روم کا بادشاہ) مر جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا، (اور یہ دونوں ملک مسلمان فتح کر لیں گے) قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ان دونوں کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں گے۔“

(صحیح مسلم)

امت کی تباہی

سیدنا ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو لپیٹ لیا (یعنی سب زمین کو لپیٹ کر میرے سامنے کر دیا) تو میں نے اس کا مشرق اور مغرب دیکھا اور میری حکومت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک زمین مجھے دکھائی گئی اور مجھے دو خزانے ملے ایک سرخ اور سفید اور میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرے اور ان پر کوئی غیر دشمن ایسا غالب نہ کرے کہ ان کا حلقا ٹوٹ جائے اور ان کی جڑ کٹ جائے، (یعنی بالکل نیست و نابود ہو جائیں) میرے پروردگار نے فرمایا۔

”اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب میں کوئی حکم دیتا ہوں پھر وہ نہیں پلٹتا اور میں نے تیری یہ دعا میں قبول کی اور تیری امت کو عام

قحط سے ہلاک نہ کروں گا نہ ان پر کوئی غیر دشمن جو ان میں سے نہ ہو ایسا غالب کروں گا جو ان کی جڑ کاٹ دے، اگرچہ زمین کے تمام لوگ (مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے) اکٹھے ہو جائیں، (مگر ان کو تباہ نہ کر سکیں گے) یہاں تک کہ خود مسلمان ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قید کریں گے۔“

(صحیح مسلم)

تم اہل امتوں کی راہوں پر چلو گے

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”البتہ تم اہل امتوں کی راہوں (یعنی گناہوں میں اور دین کی مخالفت میں) پر چلو گے (نہ یہ کہ کفر اختیار کرو گے) بالشت برابر بالشت کے اور ہاتھ برابر ہاتھ کے، یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں گھسے تو تم بھی گھسو گے۔“
 ہم نے عرض کیا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اہل امتوں سے مراد یہودی اور نصاریٰ ہیں؟“
 آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ (اگر یہ نہیں تو) اور کون ہیں؟“

(صحیح مسلم)

قریش تباہ کرے گا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”لوگوں کو قریش میں سے یہ خاندان (یعنی بنی امیہ) ہلاک کرے گا۔“

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔
 ”پھر ہمیں کیا حکم ہوتا ہے؟“

لے جائیں پھر وہاں کوئی مجھے تلوار مارے یا تیر
آئے اور مجھے قتل کرے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”وہ اپنا اور تیرا گناہ سمیٹ لے گا اور
دوزخ میں جائے گا۔“

(صحیح مسلم)

مسلمانوں کی لڑائی

سیدنا اخف بن قیس کہتے ہیں۔
”میں اس ارادہ سے نکلا کہ اس شخص
شریک ہوں گا (یعنی سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا
سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلے میں
شریک ہوں گا) راہ میں مجھ سے سیدنا ابوبکر لے
کے گئے۔“

”اے اخف تم کہاں جاتے ہو؟“

میں نے کہا۔
”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
چچا زاد بھائی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔
”اے اخف! تم لوٹ جاؤ، کیونکہ میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جب دو مسلمان
اپنی تلوار لے لے کر لڑیں تو مارنے والا اور جو مارا
جائے دونوں جہنمی ہیں۔“

میں نے عرض کیا یا کسی اور نے کہا کہ۔
”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! قاتل تو
جہنم میں جائے گا لیکن مقتول کیوں جائے گا؟“
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
”وہ بھی تو اپنے ساتھی کے قتل کا ارادہ رکھتا
تھا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
”اگر لوگ ان سے الگ رہیں تو بہتر
ہے۔“
(صحیح مسلم)

فتنے میں حصہ لینا

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”بے شک کئی فتنے ہوں گے، خبردار ہو،
وہاں کئی فتنے ہوں گے، جیسے والا ان میں سے
چلنے والے (لوگوں سے) سے بہتر ہو گا اور
بھاگنے والے (لوگوں سے) چلنے والا بہتر ہو گا،
خبردار رہو، جب فتنہ اور فساد اترے یا واقع ہو تو
جس کے اونٹ ہوں، وہ اپنے اونٹوں میں چالے
اور جس کی بکریاں ہوں وہ اپنی بکریوں میں جا
لے اور جس کی (بھتی کی) زمین ہو، وہ اپنی
زمین میں چارے۔“

ایک شخص نے کہا۔
”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جس
کے اونٹ نہ ہوں اور نہ بکریاں اور نہ زمین ہو وہ
کیا کرے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”وہ اپنی تلوار اٹھائے اور پتھر سے اس کی
باڑھ کو کوٹ ڈالے، (یعنی لڑنے کی کوئی چیز باقی
نہ رکھے جو لڑائی کا حوصلہ ہو) پھر اپنے بچاؤ میں
جتنی ہو سکے جلدی کرے، الہی! میں نے تیرا حکم
پہنچا دیا، الہی! میں نے تیرا حکم پہنچا دیا، الہی! میں
نے تیرا حکم پہنچا دیا۔“
ایک شخص بولا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!
بتلائیے کہ اگر مجھ پر زبردستی کریں یہاں تک کہ
مجھے دو صفوں میں سے یاد کرو ہوں میں سے ایک

☆☆☆

بادشاہت کی فلاسفی میں

ابن انشاء

گزرتے۔

امیر تیمور کو ہم قائل کر لیتے، ہمارا خیال ہے کہ وہ ہماری بات نہ ٹالتے، لیکن یہ بھی گمان ہے کہ کچھ اس قسم کا عذر کر کے کہ ”آج میری ٹانگ میں درد ہے، کل الیکشن کی تاریخ کا اعلان کروں گا۔“ راتوں رات گھوڑوں کی ٹنگی پیٹھ پر بیٹھ کر لے کر ”علی علی“ کرتے خوارزم کی طرف نکل جاتے، بلکہ ان کا ایک اور گھوڑا جاتے جاتے ہماری پھوس کی گلی کو لات مار جاتا کہ اور دو مشورے صاحب قراں کو، اصولاً تو انگریزوں کو بھی حکومت سنبھالنے سے پہلے ہندوستان میں الیکشن یا استقواب رائے وغیرہ کرانا چاہیے تھا لیکن خیر! دوسرا طریقہ بھی حکومت بدلنے کا انتخابی مقبول اور مشہور ہے بلکہ ہمارے ہاں جمہوریت تو مدت سے کا فور ہے، اسی کا زیادہ دستور ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان دو محسوسے پنے طریقوں کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے جو پر امن بھی ہو، افسوس کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی بدعت رائج ہونے کے باعث لوگوں میں پرانے کلاسیکی ادب کا ذوق اٹھ گیا ہے، ہائے کیا زمانہ تھا کہ لوگ شب و روز داستانیں کہتے سنتے رہتے تھے، خوش جمال بادشاہوں اور ماہ پارہ شہزادیوں کی اور تین آنکھوں والے نابکار دیوؤں کی اور اڑتے قالینوں کی، داستان میں اس انہماک کا ایک ضمنی فائدہ یہ تھا کہ ملک میں افغلیشن (افراط زر) بھی پیدا نہ ہونے پاتی تھی۔

ان قصوں کہانیوں کے بموجب ایک بادشاہ

فی زمانہ حکومتوں کے بدلنے کے دو طریقے رائج اور مقبول ہیں، ایک بیلٹ یعنی الیکشن، دوسرا بیلٹ یعنی گولی کا، ویسے اب دودوں میں چنداں فرق نہیں رہا کیونکہ الیکشن میں بھی بیلٹ کے ساتھ ساتھ بلکہ بیلٹ سے زیادہ بیلٹ کا استعمال ہونے لگا ہے اور زیادہ موثر اور کامیاب پایا گیا ہے، ہم ذاتی طور پر الیکشن کے حق میں نہیں، یہ خون خرابے کی چیز ہے جسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کیا ہے، ہمارے بہترین بادشاہوں میں سے جن کا نام زریں حروف سے لکھتے لکھتے ہماری دوا میں خشک ہو گئی ہیں اور ملک کے سونے کے ذخائر میں معتد بہ کمی واقع ہو گئی ہے، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں وغیرہ، ان میں سے کون الیکشنوں کے ذریعہ برسر اقتدار آیا؟ عوام کی اکثریت کی رائے کی کوئی سند بھی نہیں۔

لوگوں کا بس چلتا تو بادشاہ غازی حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلے میں وہ ووٹ دارا شکوہ کو دیتے، حالانکہ ہم آپ جانتے ہیں کہ وہ بڑا بد عقیدہ آدمی تھا، ہمارے ممدوح کے مقابلے میں جو متدین ایثار پیشہ، درویش اور اپنے بھائیوں پر جان چھڑکنے والے تھے، اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ ایک بڑا عیب یہ تھا کہ کتابیں لکھتا تھا، اکبر اعظم تو الیکشن کا قارم بھی خود نہ کر سکتے تھے، ان کے نامزدگی کے کاغذات ابوالفضل کو پر کرنے پڑتے، بادشاہ بس نشان انگشت ثبت کرتا، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی سے بھی یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ اس کھٹ راگ سے

کہ اب جو ہمیں خدا نے یہ ملک دیا ہے تو اس میں ہمیشہ بادشاہت لا کر کسی کو بادشاہ یا خلیفہ بنانا چاہیے تاکہ یہ آئین دستور، چیلز پارلی، بی این اے وغیرہ کے جھگڑے نہ اٹھیں، یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ ہمیں بادشاہ بنایا جاتا، کسی اور کو بھی بنایا جاسکتا تھا، کیونکہ فی زمانہ اہلیت اور لیاقت کو کون دیکھتا ہے، تاہم ہماری شنوائی نہ ہوئی۔

انگلستان ہم اس لئے بھی آئے تھے کہ یہاں بادشاہت ہے، یہاں بھی نہ کبھی کوئی لو لاولد مرے گا کیا عجب یہاں صبح دم دروازہ شہر میں داخل ہونے والوں کے حقوق تسلیم کیے جائیں، لیکن یہاں آکر پہلی مایوسی تو یہ ہوئی کہ اس شہر میں نہ فیصل ہے، نہ کوئی دروازہ ہے، یہاں ہم مکمل لے کر پڑ جاتے اور ہر روز اخبار ٹائمز خرید کر سیاہ حاشیے کی خبروں کا مطالعہ کرتے ایک صورت یہ بھی تو تھی کہ لوگ در بدر تلاش کرتے تھے کہ شہر میں کوئی ایسا بھرے یا کاشغرا کا نوجوان تاجر ملے جس کا تعلق کسی پرانے شاہی خاندان سے ہو اور جو حسن صورت، لیاقت اور

فطانت میں یکٹائے زمانہ ہو، ہم نے اسی خیال سے ایچی ڈگریاں اس ڈگری کے علاوہ جو کہ آپریٹو قرضہ کی نادر ہندگی کے سلسلے میں ہم پر ایک دیوانی عدالت نے دی تھی (کوئی باہوش عدالت ایسا نہیں کر سکتی تھی) فریم کرا کے اپنے ڈرائنگ روم میں لٹکا دیں، جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، ایسے بھی جن کی پارلیمنٹ اور ہیکم پیلس تک پہنچ سکتے ہیں اور خود عمل تعمیر شروع کر دیا، قیامت یہ ہوئی کہ کسی نے ملکہ عالیہ کو بروقت ٹیلی پلاننگ کا لٹرچر نہ بھیجا تھا جس سے چند قباحتیں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھیں بلکہ قیامت در قیامت بھی، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شہزادی این کے ہاں اس عزیزہ کے پیدا ہونے کی ہمیں خوشی نہیں، جب اور سب

کے لاولد مرنے پر لوگ صبح دم شہر کے دروازے میں سب سے پہلے داخل ہونے والے مسافر کے سر پر تاج رکھ کر شادیانے بجا دیتے تھے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے شاہ مرحوم کا کانا وزیر اس پہلے آدمی کو پہلے ہی بنگلی دروازے سے یا فیصل کے برج سے دسی لٹکا کر شہر کے دروازے کے پاس اتار دیتا تھا اور وہ تڑکے تک سردی سے ٹھٹھرتا اپنے نو بادشاہی کے خوابوں سے گر ماتا وہاں دہکا پڑا رہتا تھا، لیکن ہم اسے محض بدگمانی سمجھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں ولی عہد پیدا کرنے کے معقول انتظام ہوتے تھے، خاصے معنجان حرم بیگیوں کے بھی، کینروں کے بھی، امراء، وزرا کی بہو بیٹیاں اس پر مستزاد اور اولاد نرینہ کی بشارتیں اور دعائیں دینے والے اہل اللہ بھی شہر کے باہر ڈیرے جمائے بیٹھے رہتے تھے، شہر سے باہر لیکن اتنی دور بھی نہیں کہ لوگوں کو نذر و نیاز کے ٹوکے وہاں تک لے جانے میں دقت ہو۔

علاوہ ازیں ان دعاؤں کو مستجاب بنانے اور اس معاملہ میں قدرت کا مکمل کو ظہور میں لانے کے لئے محل کے اندر جیٹی غلام بھی رہتے تھے جن کے سرکاری فرائض تو دن میں ختم ہو جاتے تھے لیکن اپنے آقا کی بیگمات کی فرمائش پر اور ٹائم بھی خوشی خوشی کر لیتے تھے، خواجہ سراؤں کی موجودگی اس میں مانع نہ ہوتی تھی، تاہم داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہوں کی لاولدی اور صبح دم مسافروں کو بیٹھے بٹھائے کچی پکائی بادشاہی ملنے کی وارداتیں خاصی ہوتی تھیں۔

☆☆☆

ہم بادشاہت کے تہہ دل سے قائل ہیں، اس وقت بالخصوص مسلمان ملکوں میں جو بادشاہ ہیں، وہ ہماری آنکھ کا تارا ہیں، ہم نے کئی بار لکھا

ہی کو ہے تو ہمیں بھی ہے، تاہم یہ ہوا کہ بادشاہت کی کیو میں ان کا نمبر لگ گیا، پانچواں۔ ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں پھر بھی اگر پہلے چار امیدواروں کو کچھ ہو جائے اور ان میں جو اولاد زرینہ ہے، وہ فائز الحفل نکل جائے یعنی سب کے سب امریکی منکوحہ عورتوں سے شادی کر کے وزیر اعظم وقت کو ناراض کر لیں، یا رومن کیتھولک، مسلمان یا کبیر پنتھی ہو جائیں اور یہ نومولود بچی تاج پہننے سے انکار کر دے کہ چبھتا ہے یا میرا ہنر ڈاس سے خراب ہوتا ہے تو سلطنت دست بدست ہم تک آ سکتی ہے، لیکن آج یہ خبر آئی کہ اس گھرانے میں ایک اور شزادی نے جنم لیا ہے، یہ ڈچس آف گلوستر کی صاحبزادی ہیں، ان کا بادشاہت کی قطار میں بارہواں نمبر ہے۔

ہم نے ایک ہمدرد سے ذکر کیا اور کہا کہ ”گلوستر پلٹس میں رہنے کی وجہ سے ہم بھی ایک طرح کے ڈیوک آف گلوستر ہیں کہ نہیں۔“ تو کہنے لگے۔

”صاحب من، اگر ملکہ الزبتھ ثانی کو ملکہ وکٹوریہ کی عمر ازانی ہوئی تو کچھ عجب نہیں کہ ایک سو بارہواں امیدوار بھی پیدا ہو جائے، بس سیدھے اپنے وطن واپس جاؤ، اپنا وقت مت ضائع کرو، امیگریشن کے رجسٹر کے مطابق تمہارا نمبر وارثت کے معاملے میں چھ کروڑ اٹھتر لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو پینتیسواں ہے، پھر تم کالے بھی ہو اور پرانی داستانوں میں بھی شاہی خون کی شرط ہوا کرتی تھی۔“

ہم نے بتایا کہ ”کالے تو ہم بیماری کی وجہ سے ہو گئے ہیں، جب وقت آئے تو اپنے ملک سے گورا کرنے والی کریم منگا لیں گے، جس کے استعمال سے چھٹی تک گورے ہو سکتے ہیں اور

رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ تک کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں، اب رہی شاہی خاندان کی بات ہم نے ایک پرانی کتاب میں دیکھا ہے کہ پراچین زمانے میں ہمارے جد امجد کا لٹجر کے قریب ایک ریاست کے ایک طرح سے راجہ تھے، وہ یوں کہ بظاہر راجہ ان کے چھوٹے بھائی تھے لیکن وہ بڑے بھائی یعنی ہمارے جد امجد کا اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کی کھڑاؤں تخت پر تو نہیں، تخت پر جگہ ہی کہاں ہوتی ہے، تخت کے نیچے رکھتے تھے۔“

ہمارے ان مہربان نے فرمایا۔
”یہ انگلستان ہے، یہاں انگریزی خون یعنی سفید خون کی شرط ہے، کا لٹجر کا حوالہ نہیں چلے گا۔“

ہم نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔
”اچھا تو اور ملکوں کے نام بتاؤ جہاں بادشاہت ہو اور جہاں جو ہر قابل کی قدر ہوتی ہو، اسلامی ملک ہو تو اور اچھا ہے، کیونکہ ہمیں اسلام کا بول بالا کرنے کا بھی شوق ہے۔“

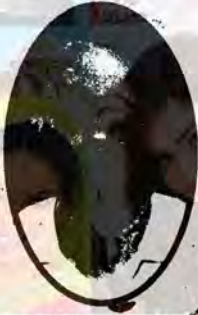
ہمارے ان دوست نے چند ملکوں کے نام بتائے لیکن یہ بھی کہا کہ ”آج کل وہاں ویزا کی پابندی ہے اور پاکستانوں کو تو بالکل نہیں ملتا۔“ اس کے بعد جیب سے پی آئی اے کا ٹائم ٹیبل نکال کر کہنے لگے۔

بتاؤں، لندن سے کون کون سی فلائیں سیدھی کراچی جاتی ہیں۔“
ہم نے متغض ہو کر کہا۔

”رہنے دو، ہم خود دیکھ لیں گے، آدمی گزرنے دے، گڑ کی بات تو کرے۔“

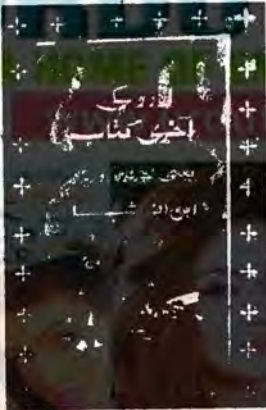
ہم بادشاہ ہوتے تو کیا کرتے، اس باب میں ہم نے ایک منشور چھاپ رکھا ہے جسے خرچا ڈاک کے لئے دس روپے بیچ کر ہم سے طلب کیا جاسکتا ہے، مختصر یہ کہ ملک سے ساری بری بری

شائستہ شائستہ رواں دواں



اردو کی آخری کتاب

طنز و مزاح



لاہور اکیڈمی

پہلی منزل محلہ اہن سید، پتہ لاہور 207 سرگرم روڈ لاہور
فون: 042-37321690، 042-37310797

باتوں کا قلع قمع کرتے پہلے قلع پھر قلع، جسے کی
چھٹی کرتے تھے، لیکن افسوس وہ پہلے ہی ہونے
لگی ہے، خیر جسے کی دو چھٹیاں گردیں گے،
ہمارے عہد محدث عہد میں ہفتے میں دو جمعے ہوا
کریں گے تاکہ لوگ دل جمعی سے عبادت کرتے
رہیں، جمہوریت اور سوشلزم وغیرہ کے شیطانی
وسوسے ان کے دل میں پیدا نہ ہوں، شراب کی
ممانعت کرنے کا نکتہ بھی ہمارے منشور میں تھا، وہ
بھی ہو چکی، لیکن ہرج نہیں، ہم مزید ممانعت کر
دیں گے تاکہ جو لوگ نہیں بیٹے وہ مزید نہ بیٹیں،
یہاں تفصیل کیا دیں، آزمائش شرط ہے، ”محکم
آنت کہ خود بویہ۔“

☆☆☆

تاریخ انگلستان ہم نے اس خیال سے لکھنی
شروع کی تھی کہ آخر میں اپنے عہد کا حال اپنے قلم
سے لکھ جائیں تاکہ آنے والے مورخ غلطیاں نہ
کریں، لیکن قارئین کرام شاعر کہہ گیا ہے۔
”جب وطن از ملک سلیمان خوشتر۔“

اب ہم فرنگستان کے راج پاٹ پر لات مار
کر وطن واپس آنے اور ایک رحم دل اور بیدار مغزو
تاجدار کے طور پر اپنے ملک اور رعایا کی خدمت
کرنے کے لئے بے تاب ہیں، جو بی امراء اور
عمائد کا کوئی وفد ہمیں لینے کے لئے آئے گا، ہم
لندن کے درو دیوار پر حسرت سے نظر کرتے
ہوئے روانہ ہو جائیں گے، اس کالم کی کٹنگ
سنبھال کر رکھیں، اپنے سب قارئین کو ہم خلعت و
انعام دیں گے اور لوگوں کا منہ موتیوں سے بھر
دیں گے، خصوصاً ان کا جو کٹہ چینی کے لئے منہ
کھولنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

دل کنزیرہ

ام مریم

اڑتیسویں قسط کا خلاصہ

حرم کو اغواء کروانے والا عباس ہے مگر اس کی دست راست شانزے ہے، دونوں کو مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی، سرد شاہ جو حجاب کا منکبتر ہے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے حرم کو با عزت بازیاب کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
قدر شانزے سے خائف ہے اور اس خوف کا تذکرہ حمدان سے کرتی ہے مگر حمدان کان نہیں دھرتا۔

جرم ثابت ہو جانے پہ عباس کے ساتھ شانزے کو بھی سزا ملتی ہے، شانزے کو فیض چوہدری کے گھر سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا جاتا ہے، مگر شانزے اپنی فطرت سے باز آنے والی نہیں، اب اس کا اگلا حدف حجاب ہے۔

افتالیسویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے





انکشاف ایسا تھا کہ شانزے کو سانسب سوگھ گیا، وقتی سہی مگر اس کی شاطرانہ فطرت کو دھچکا لگا اور کچھ بولنے کے قابل نہ رہی، البتہ اولیس کو ضرور آگ لگ گئی، اس کے اندر تو جیسے بھانجڑ جل اٹھے تھے ایسے ہی بھڑکا تھا وہ۔

”آپ کو یہ بات کس نے بتائی.....؟ آپ کے ذہن و فطین قابل و ممتاز چھوٹے بھائی نے.....؟“ اس کا انداز طنز یہ تھا، جھگڑا لڑتا تھا، تاؤ جی یوں آرام سے بیٹھے رہے گویا انہیں نہیں کسی اور کو مخاطب کیا گیا ہو، وال صاف کرتی خاموش تماشا شانی تائی نے بھی خار کھائی نظروں سے انہیں دیکھا البتہ کچھ بولنے سے گریز برتا، جب سے اولاد جوان ہوئی تھی وہ محاذوں کی کمان ان کے ہاتھ میں دے کر خود بس مگرانی پہ مامور ہو چکی تھیں، اولاد ہی اتنی پوری تھی کہ انہیں مشورے کی بھی ضرورت نہ رہی، ایسے کارنامے سرانجام دیئے جا رہے ان میں کامیابی کا لیول نہ رہا تھا، سو وہ پوری طرح مطمئن تھیں۔

”آپ سے پوچھ رہا ہوں اباجی! کچھ ارشاد فرمائیں گے؟“ اولیس کا دماغی تاؤ نقطہ عروج پہ پہنچا تو تمللا کر آگے بڑھتا ان کے منہ میں ان کی آنکھوں میں کھس کر پہنچا، تاؤ جی کی مونچھیں پھڑ پھڑائیں، انہوں نے ناگواری سے چھوٹے مگر غلے سپوت کو دیکھا تھا۔

”اوے بے ہدایت..... عقل پھڑ..... بندے دا پتر بن، پیو دے نال گل کرن دا اے کیڑا طریقہ اے؟“ انہوں نے برہمی کے پردے میں راز کی حفاظت کرنی چاہی مگر سامنے بھی ان کا ہی بیٹا تھا، ان کا اپنا عکس، بے دید بے لحاظ۔

”وہی جو آپ نے ہمیں سکھایا، شکایت یا گلہ تو بننا ہی نہیں، مجھے سب اچھی طرح یاد ہے جیسے آپ دادے سے بات کرتے ہوئے تھے، پوٹھیاں چھلاں (اٹنی چھلائیں) مارتے نہیں تھکتے تھے اور یہ منہ بیا چا چا، اس سے تو آپ کی بھی نہ بنی مگر اب وہی آپ کو ہم سے زیادہ عزیز ہو گئے، دراصل تم سب بہن بھائی نا ابا..... ایک ہی تھالی کے پٹے بٹے ہو، تھپار اصل ایک ہے تمہارا خون ایک ہے تمہاری گل دی ایک ہے، ہم اولادوں کو تو تم سب نے مل جل کر بے وقوف بنایا ہے، چاہے وہ چاہے منہ پر کی اولاد ہو چاہے شانزے یا پھر ہم، لو کر لو گل، رشتہ منہ پر چاہے دے گھر طے ہو یا اطلاواں ساڈے بیٹوں ایں.....“ وہ اپنے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنس رہا تھا، انداز دکھ بھرا بھی تھا چڑا ہوا بھی، تاؤ جی کچھ نہ بولے، نظریں چرائے حق کر گزرتے رہے، جس سے ساری اگر نہیں بھی تو کسی حد تک اولیس کی باتوں کی ضرورت تصدیق ہوتی تھی۔

”ہور کچھ دن یمیں (گزریں) گے اور منہ بیا چا چا اپنی ساری آل ویاہ کے ویلا ہو جائے گا، ہاں..... حالانکہ وہ سب ہم سے چھوٹے ہیں عمر میں، اک ہم ہیں بد نصیب کہ ساڈا ابا سانوں اک نوں وی کسی کھونٹے نال نہ بن سکیا، سکوں (بلکہ) جو رشتے طے کیے تھے وہ بھی تروا دیتے، واہ آبا حیر باں بالیسیاں توں شاداوشے۔“

بھینسوں کے وٹے کے لئے سوکھی روٹیاں، بگوتی سعد یہ بھی کیوں پیچھے رہتی لعنت و ملامت کے اس سلسلے میں، تاؤ جی کا رنگ اس کی بات پہ غیرت کے جوش سے سرخ ہوا، انہوں نے اک نظر سعدیہ کو گھورا انداز تنبیہ تھا پھر اسی تند انداز میں حق کی لے ہاتھ سے پرے جھٹکتے ہوئے تائی کو

ملاستی دھکا پتی نظروں سے دیکھتے گر جنے لگے۔

”اسے کچھ تو شرم حیا دی ہونی بد بختے، پیو کے سامنے ایسی گھاں کرتے اسے ذرا لج نہ آئی، قف ہے، قرب قیامت ہے، اک ہم ہوتے تھے جی دار مرد ہو کے ماں پیو کے سامنے اپنی شادی کے تذکرے پہ شرمایا جاتے گردن نہ اٹھاتے، یہ عورت ذات ہو کر، اسے بتا اس کی عمر نہیں لنگ گئی جو فکر میں دبی ہو رہی ہے، نصیب میں ہو گا تو برل جائے گا۔“ ہاتھ کا چھجا سائیٹا کرتا کی کے منہ کے آگے لہراتے وہ آپے سے باہر ہو چکے تھے، تانی نے نخوت سے ان کا ہاتھ پرے جھٹکا اور مغر سے منہ پھیر لیا، انداز صاف کہتا تھا انہیں شوہر کی کسی بات سے اتفاق نہیں، بیٹی سے البتہ ضرور ہے، سعد یہ کو اسی انداز نے مزید حوصلہ دیا یا وہ واقعی اتنی بے حجاب بے لحاظ تھی کہ بجائے بات چیتانے کے اور باپ سے متالگائے بیٹھ گئی۔

”ہاں ہاں..... نصیب میں ہو گا تو مل جائے گا بر مجھے، پر تو نے تو کوئی کوشش نہ کی نہ ابا، ویسے تو بڑا دعویٰ تھا تجھے ہم سے محبت کا..... اور نصیب چا چا جس نے نہ دعویٰ کیا اولاد سے محبت کا نہ بھی کر کے ہی دکھائی مگر اس نے وقت آنے پہ ثبوت فراہم کر دیئے اور جہاں تک تو اپنی صفیں بیان کر رہا ہے تا، تو نہ کر، ورنہ میرا منہ اور کھلے گا، داوے دادی کے سامنے جیسے تو اماں کا ہاتھ پکڑ کر بے شرمی سے اماں کی حمایت میں بولتا تھا لڑتا تھا ناں..... اور ان بڑھوں کو جھوٹا کہتا تھا، سب یاد ہے مجھے۔“ سعد یہ جذبات میں آ کر پہ نہیں کون کون سے پول کھولنے کے درپے ہوئی تو اب کی بار تانی نے اٹھ کر اسے دھکا مار کر وہاں سے ہٹایا۔

”سچ کہتا ہے باپ تیرا، لک مک گئی ہے تو اڑی بے دیدو۔“ انہوں نے کمرے میں لا کر گھر کا، پھر مزید دھچکڑ مار کر بولی تھیں۔

”جس دن دا حمان دے ویاہ داسنا ہے پاگل ہوئی جائی ہے، تیرے کھوپر میں یہ بات کیوں نہیں آندی بے وقوفی کہ اس نے تیرے سے مر کے دی ویاہ نہیں کرنا تھا، اری اتنی خوش نصیب ہوئی تو، تو آج پیو کے بوجے (دروازے کی چوکت) پہ نہ بیٹھی ہوتی، ابویں پونک پونک کے پیو پرادی نظراں سے بری نہ بن، میرا مال کم لے۔“

وہ سرگوشیاں کر رہی تھیں، سمجھا رہی تھیں، سعد یہ کے چہرے کا تغیر بڑھتا جا رہا تھا، تاپا کو دکھ تھا اولاد کے ترتر زبان چلانے کا مگر وہ یہ بھول گئی تھیں کہ ماں باپ سے سلوک اور رویہ وہ باب ہم رقم کر رہے ہوتے ہیں جو ہماری اولاد کل اٹھ کر ہمیں پڑھ کر سنائی ہے، تو اب ان کل شروع ہو چکا تھا اور اولاد وہی سبق سنار ہی تھی جو انہوں نے بھی لکھا تھا، تحریر کیا تھا۔

☆☆☆

شام غم کی سحر نہیں ہوتی
یا ہمیں کو خبر نہیں ہوتی
ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں
بے کلی اس قدر نہیں ہوتی
اک جاں سوز و نامراد خلش

اس طرف ہے ادھر نہیں ہوتی
رات آ کے گزر بھی جاتی ہے
زندگی مختصر نہیں ہوتی
اک دن دیکھنے کو آ جاتے
یہ ہوں عمر بھی نہیں ہوتی
حسن سب کو خدا نہیں دیتا
ہر کسی کی نظر نہیں ہوتی

زندگی پہ اک جمود طاری ہو گیا تھا جیسے، حمدان کو روز و شب طویل اور بے معنی لگنے لگے تھے،
قدر محدود بھی اور شاید اس سے بے نیاز بھی، اسے اس کی ضرورت ہی نہ تھی تو پھر یہ شادی بھی نہ
ہوتی، کبھی بکھار وہ مایوسی کی انتہا کو چھوئے لگتا، وہ اس کی مجرم بھی اس کے بچے اس کی نسل کی قاتل
مگر جمال ہے جو ذرا برابر بھی شرمندگی یا ملال محسوس کرتی ہو، وہ متاسف تھا اور افسردہ بھی، کل شام
اسے اس شخص کا فون آیا تھا۔

”گھر آؤ پہلی فرصت میں یا رمن..... ضروری بات کرنی ہے؟“

”جی بہتر پاپا!“

وہ ضروری بات سننے کو راضی ہو گیا اس کے باوجود کہ ان کے فیصلوں سے اسے اکثر اختلاف
ہو جایا کرتا مگر اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا وہ نا فرمانی پہ اتر آتا۔

رات جب وہ سونے کی تیاری میں تھا، سرسلیمان کو اس کی یاد آ گئی۔
”کیسے ہو بیٹے، کبھی فون ہی نہیں کیا۔“

اور وہ جی بھر کے شرمسار ہو گیا جانتا تھا وہ اس سے زیادہ بیٹی کے رویے سے دل برداشتہ ہیں
مگر انہیں تو خیال کرنا چاہیے مگر وہ انہیں کیا بتاتا، کہ ان سے بچی باہمی ملاقات کو کیا اتفاق ایسا گھر
پہ نہیں ملے، اس پہ ستم وہ خاتون جسے ان کی زوجہ ہونے کے قابل فخر اعزاز حاصل ہو چکا تھا، ہر بار
اس کے متھے لگی تھیں، انداز ایسا عجیب اور ملتفت تھا کہ وہ خائف ہو گیا، ڈر سا گیا، یہ اتفاقی انداز
اس کی سمجھ سے بالاتر تھا، وہ الجھتا تھا مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا تھا، بس ایک ہی خیال شدت سے
دامن گیر ہوتا سر سے انتخاب میں غلطی ہو گئی۔

”اس کو تا ہی یہ شرمندہ ہوں سر، ایک دو بار آپ کو ڈرائی بھی کیا مگر آپ کا نمبر آف جا رہا تھا۔“
وضاحتی اور شرمندہ انداز، وہ مضطرب سا مسکرانے لگے، جانے کیوں وہ بہت تیزی سے تھکتے جا رہے تھے۔
”تو آپ گھر آ جاتے بیٹے۔“

”جی..... میں حاضر ہو جاؤں گا انشاء اللہ۔“ حمدان کے پاس سوائے رضامندی کے راستہ نہ
تھا، انہیں وہ اپنی الجھن نہیں بتا سکتا تھا بہر حال۔

”قدر کیسی ہے؟ اس کی ناراضگی کچھ کم ہوئی؟“ اگلا سوال حمدان کے لئے اعصاب شکن تھا،
اس نے سرد آہ بھری۔

”جی سر، ڈونٹ وری ٹھیک ہو جائیں گی، میں کوشش کروں گا، انہیں ساتھ لے کر آؤں۔“ وہ

بہت صبر کر کے مسکرایا تھا، سلیمان خان نے ہنکارا بھرا۔

”جیتے رہو۔“ انہوں نے سلسلہ کاٹ دیا، حمدان اندر آیا تو اسے سی کی کوئنگ میں وہ کسی شہزادی کے انداز میں بستری پر جو استراحت تھی، بٹھرے ہوئے ریشمی بال ریشمی شب خوابی کا لباس اور لود پتا ہوا خوبیدہ حسن، حمدان پہ سحر طاری کرنے لگا، ہر اختلاف بھلائے یہ اسکاٹنے لگا، آج جب وہ ڈیوٹی سے آیا تو اسے خاناماں پہ برستے دیکھا تھا۔

”سالن میں مرچیں کم جمھونکا کرو، کوئی ٹیٹ ہی نہیں ہوتا سوائے مرچوں کے۔“

”سرفاسٹ پسند کرتے ہیں میم.....!“ کک مودب ہو کر بولا تو اسے تپ چڑھ گئی تھی۔

”مگر یہ کھانا صرف تمہارے ڈیئر سر نے نہیں کھانا ہوتا، مجھے بھی زہر مار کرنا ہوتا ہے، آئندہ مرچی ہرگز زیادہ نہ ہو کجھے؟“ وہ اپنے مخصوص نخوت زدہ شاہانہ انداز میں حکم سے کہہ رہی تھی، پلٹی تو اس سے مگر ہوتے ہوئے رہ گئی، وہ ایک دم سامنے آیا تھا، قدر تو اس کے لیے چوڑے طویل وجود کے سامنے جیسے بے معنی ہو کر رہ گئی، چھوٹی سی گڑیا کی طرح نازک مہین اور کامنی سی، اس کے وجود کی لباس کی خوشبو نے اس کے گرد حصار سائنا ڈالا تھا۔

”ایک کپ چائے بہت استراٹک قسم کی بنا کر میرے کمرے میں پہنچا دیں، جھینکس۔“ وہ خاناماں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا، قدر کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا اور وہ جو اسے دیکھ رہی تھی گھور رہی تھی، عجیب سے توہین آمیز مسکی بھرے احساس سے ہمکنار ہوئی۔

”بتی کے بجائے ان کی چائے میں مرچی ڈالنا، تیز مرچوں کا شوق ایسے پورا کیا کریں گے یہ اب۔“ اس کی چوڑی پشت کو گھورتی وہ خاناماں سے کہہ رہی تھی، حمدان نے سنا تھا البتہ پلٹ کر نہیں دیکھا، قدر جل کر خاک ہوئی۔

”سچ مرچیں ڈالنا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ وہ بھر خاناماں سے بولی، انداز تملایا ہوا تھا، خاناماں مسکراہٹ دیا گیا۔

وہ پیر پختی ہوئی وہاں سے گئی تھی اور راہداری سے گزرتے اس کی کارنس پہ بھی بے حد قیمتی فریم کی تصویر جان بوجھ کر ہاتھ مارتے ہوئے نیچے گرا دی، جس میں وہ پرائیڈ آف پرفارمنس کی شیلڈ اعلیٰ پولیس آفیسر سے وصول کرتا مسکرا رہا تھا، حمدان شام کو اپنے کمرے سے نکلا وہاں سے آگے نہیں بڑھ سکا، ٹھک گیا، مدد سے اس کی آنکھیں سیلر ڈالیں۔

”یہ..... یہ کیسے نیچے گر گئی، آپ لوگوں کو اندازہ ہے کس قدر قیمتی تھا یہ فریم۔“ ایک کے بعد دوسرے ملازم کو غصے میں بکارتا وہ سب کو لائن حاضر کر گیا تھا، سب لاعلم تھے اور خائف بھی۔

”نوسر..... سوری ہمیں تو پتا ہی نہیں، ہم تو ابھی دیکھا۔“ ملازم وضاحتیں اور صفائیاں پیش کر رہے تھے جب قدر غصے سے بھری وہاں آٹھری، بلکہ ٹھکاری۔

”کیا شور مچا رکھا ہے، یہ بھی نہیں احساس کہ کسی بھلے مانس کی نیند بھی خراب ہو سکتی ہے اس سچ سچ سے۔“ کیا شک اس کا مزاج نازک تھا، یہ نزاکت عارضی طور پہ کم ہوئی تھی مگر آج کل پھر سے سوانیز سے پہنچ گئی تھی۔

”یہ فریم کیسے ٹوٹا؟“ حمدان نے اب کے اسے گھورا، قدر کو سخت گراں گزری یہ تفتیش۔

”یہ گھر ہے، اسے اپنا تھا نہ پکھری سمجھتے ہوئے باز پرس کرنے کا کیا مطلب ہے؟ ویسے اطلاعاً عرض کر دوں، یہ مجھ سے ٹوٹ گیا تھا، کوئی اعتراض؟“ بے نیازی و لاپرواہی چمکا تا بلکہ طیش دلاتا انداز حمدان کا خون کھولا گیا۔

”تم..... تم ہو کیا آخر؟“ متضام سمجھنے ذہ اس کی جانب دو قدم بڑھا، قدر بالکل بھی خائف ہوئے بغیر اسے دیکھتی رہی پھر جیسے اس کی بے بسی محسوس کر کے مسکرائی تھی۔

”تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ایسا کرنے والی کون ہوتی ہوں، تو مسٹر حمدان منصف میں اپنی مرضی کی مالک ہوں، جودل کرتا ہے وہ کرتی ہوں، کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ مجھ سے سوال کر سکے، یہ پکچر مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی تو ہادی اینڈ دیش آل۔“

مطمئن مگر مخالف کو چھل سا دینے والا لہجہ حمدان کی آنکھوں میں خون کا سا سرخ رنگ بکھیر گیا، اسے دیکھتا وہ ذہنی انداز میں مسکرایا۔

”بجا فرمایا آپ نے محترمہ، آپ کچھ بھی کر سکتی ہیں کسی کا دل توڑنے سے لے کر کسی کی جان لینے تک آپ کچھ بھی سفاک عمل کر سکتی ہیں اور آپ کو ذرا سا بھی ملال نہیں ہوتا، یہ بات میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔“ اپنی بات کھل کر کے وہ رکائیں تھا لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا، وہ کیا جانے بعد میں قدر کی کیا حالت ہوئی وہ کتنی دیر تک خود کو نہ سنہال سکی۔

”قدر نہیں آئی؟“ اسے اکیلے پا کر سلیمان خان کا اضمحلال بڑھ گیا تھا، حمدان نرمی سے مسکرایا۔

”اسی بہانے آپ تشریف لائے گا، آپ اسے ملنے آجائیے۔“ سلیمان جواباً کچھ نہ بولے اور جب وہ ان سے آدھے گھنٹے کی نشست کے بعد واپس لوٹ رہا تھا تو لاؤنچ سے روشنی نے اسے آواز دے لی تھی۔

”صرف اپنے سر سے ملنے آتے ہو بیک مین، یہ کیوں نہیں سوچتے کوئی اور بھی آپ کے راستے میں پلکیں فرش راہ کے رکھتا ہے۔“ اس کی گفتگو اس کے ذہن جیسی ہی تھی، عامیانہ اور سچی۔

”جی.....؟“ حمدان ٹھنک گیا، صرف ٹھنکا نہیں خائف بھی ہو گیا تھا۔

”میں چلتا ہوں۔“ اس کے پاس راہ فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کچھ رشتے اپنے مقام اور درجے کے تقدس کا بھی خیال نہیں رکھ پاتے اور بہت پستی میں گر جاتے ہیں، اتنی پستی میں کہ انہیں دیکھنے کے لئے خود بھی پستی میں جانا پڑے، حمدان کا اس کے لئے یہی خیال تھا۔

برائٹ پنک کلر کی شاندار نقیص ساڑھی میں اس کا جاذب نظر سراپا پورے لاؤنچ میں خوشبو بکھیرتا جا رہا تھا، ساڑھی کی رنگت سے بچ کر تامیک اپ اور خوب صورت نازک ڈائمنڈ کی جیولری ان کے سجے سجائے روپ کو اور بھی پرکشش بنا رہی تھی، سیاہ نازک ہائی ہیکل میں مقید دو دھیا نازک پاؤں جن کی انگلیوں کے تراشہ ہاتھوں نے برائٹ پنک شیڈ کی ٹیل پالش لگی تھی، نوک پلک ہر دم سنورے وہ بتائیں اتنا اہتمام کیوں کیئے رہتی تھی۔

”چلیز دو گھڑی روک میں چائے بخوانی ہوں۔“ اصرار میں پوکھلا ہٹ شامل ہوئی، حمدان ٹھہرا نہیں۔

”تو صحت مند، میں پی چکا، سر سے ملاقات کو آیا تھا جو ہو گئی۔“ وہ جیسے طوعاً و کرہاً جواب دے

رہا تھا مگر پلٹے بغیر۔

”حمدان!“ اس نے حمدان کو دروازے پہ جالیا، حمدان اس سے ٹکراتے بچا تو ماتھے پہ ہل پڑ گئے، اسے کہاں اس سے ایسی توقع تھی۔

”میں اگر تم سے ایک خواہش کا اظہار کروں تو تم پوری کر دو گے؟“ وہ ایک دم لہجہ تبدیل کر کے بولی، حمدان کی ناگواری، اکٹھاٹ میں اضافہ ہوا، اسے یوں روکا جانا اور بات کو طول دینا پسند نہیں آیا تھا مگر سامنے والا سمجھے بھی۔

”مجھے افسوس ہے میں آپ کی کسی خواہش کی تکمیل سے معذرت کر رہا ہوں۔“ اس کا لہجہ روکھا سرد اور بے دل کر دینے والا تھا، مگر سامنے موجود ہستی بے دل ہونے والوں میں شامل نہیں تھی۔
”لیکن میں پھر بھی تم سے خواہش ظاہر کروں گی، تم اس پہ سوچ کر بعد میں جواب دے سکتے ہو حمدان میں..... تم سے میرا مطلب ہے تمہیں گلے لگانا چاہتی ہوں پلیز۔“ حمدان کے چہرے پہ پہلے تعجب اظہار پھر بے یقینی اس سے اگلا اور مستقل تاثر ملامت کا تاثر تھا، سرخ چہرے کے ساتھ ایک لفظ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر وہاں سے نکلا تو خون اس کے دماغ میں ٹھوکریں مارتا تھا۔

☆☆☆

خود سے روٹیوں تو کئی روز نہ خود سے بولوں
پھر کسی درد کی دیوار سے لگ کر رو لوں
تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت ہی رکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

حرم اور حجاب کا نکاح ایک دم سے بغیر پلاننگ کے طے ہو گیا تھا، ظاہری بات ہے قدر کی شرکت لازم تھی، غانیہ خاصی پر جوش اور سرگرم تھیں، عمر سے تو خصوصی لگاؤ تھا ہی سرمد نے بھی اپنے فیصلے اپنے کارنامے سے ان کا دل جیت لیا تھا، انہوں نے خود کال کر کے حمدان کو تاکید کی تھی۔
”قدر کو دو دن پہلے ہی لے آنا، تم نہ بھی آ سکو، تو بچی کو چھوڑ جانا ادھر، لیکن ساری تیاری کے ساتھ، شاپنگ اسے ساتھ لے جا کر کروانا بیٹے، آپ سن رہے ہو میری بات؟“ اس کی خاموشی کے جواب میں وہ آخر میں ذرا جھلا گئیں۔

”جی جی..... میں نے تو سن لیا ہے، یہ بات بہتر ہے آپ براہ راست اسے ہی سنا دیتی تو میرا بھلا ہو جاتا، کہ محترمہ میرے ساتھ کہیں جانا تو کجا بھی گھر میں بھی اکٹھا بیٹھنا پسند نہیں کرتیں، ناشتہ کھانا تک۔“ وہ بھی جھلا گیا ان سے بڑھ کر آج کل ویسے ہی جھلایا رہتا تھا، بات بات پہ کاٹ کھائے کی دوڑتا۔

”میں قدر سے بات کر چکی ہوں، اسے تو اعتراض نہیں کوئی۔“ اس جواب نے حمدان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا، جیسی کچھ ٹانیوں کو بول بھی نہ سکا، فون بند کیا اور اسی وقت ملازمہ سے کہہ دیا قدر کو شاپنگ کے لئے چلے کو، یہ حیرت بھرا دن تھا، حیرت میں مبتلا کرنے آیا تھا، وہ بھی حیران رہ گیا جبکہ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر آ بھی گئی۔
”چلیں۔“

اور حمدان جیسے ایک فیصد بھی امید نہ تھی اس تعاون کی اس تابعداری کی جیسی صوفی نے نیم دراز گھریلو حلیے میں بیوی دیکھتا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا، بے اختیار گھبرا کر اٹھ بیٹھا، نظروں کی حیرت چھپائے نہ جھپتی تھی۔

”یعنی تم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ اس کا مذاق اڑاتی ہنسنے لگی، حمدان خفیف سا ہو گیا، چائے کا گم رکھا، بیوی آف کیا اور گاڑی کی چابی اٹھالی، پوریکو میں آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا جب اس کی آواز سنی۔

”پاپا مجھے کہیں بھی ساتھ لے کر جاتے تو گاڑی کا دروازہ ہمیشہ خود میرے لئے کھولتے تھے۔“ وہ باہر کھڑی تھی، مقصد صاف ظاہر تھا، حمدان کو وہ کچھ طول بھی لگی، وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر اٹھا، باہر آ کر اس کے لئے فرنٹ ڈور اوپن کیا، وہ بیٹھ گئی تو دروازہ بند کرتا اپنی جگہ پہ آ گیا، گاڑی حرکت میں آ گئی، آدھا گھنٹہ سڑکوں پہ پھاگتی رہی قدر باہر کے نظاروں میں گمن گمن کی، دونوں کے درمیان خاموشی اور بیگانگی کی دیوار بنی ہوئی تھی، تب حمدان نے ہی تھک کر گردن موڑی، عین اسی پہل قدر نے بھی اسے دیکھا تھا، نگاہوں میں عجب سی پیش گئی، قدر کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔

”فرصت مل گئی باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے سے.....؟“ یہ شکوہ بناتا تھا مگر جانے کون سے استحقاق آمیز زور آور خیال نے نوک زباں سے پھیلا دیا، حمدان چونک کر ٹھک کر اسے دیکھنے لگا، گویا یقین نہ آتا ہو وہ ایسا کہہ سکتی ہے۔

”کیا آپ کو کوئی فرق پڑتا ہے، ان باتوں سے خان زادی؟“ حمدان جی بھر کے زہر خند ہوا، قدر نے ہونٹ سمجھ لے۔

”اپنے پاپا کو معاف کر دیں، انہوں نے بہر حال آپ کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔“ ”سب سے بڑا ظلم تو تم جو حمدان منصف جو انہوں نے مجھ پہ کمایا۔“ وہ لفظ چپا گئی، کچھ دیر قبل بے اختیاری میں جو منہ سے نکلا تھا اس کا اثر بھی تو زائل کرنا تھا، حمدان کا رنگ بیچکا پڑا، وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا، شاپنگ کے دوران بھی دونوں کے بیچ اجنبیت اور خاموشی حاظر رہی، قدر جوتے پسند کر رہی تھی جب اسے ایک ریک کے نزدیک ساکت کھڑے دیکھا، یہ چھوٹے بالکل نواز بندہ بچوں کے جوتوں کا ریک تھا، قدر اس کا انداز دیکھتی خود ساکن ہو گئی، حمدان کے چہرے پہ پھلکتی درد کی کیفیت اور آنکھوں کی نمی وہ اتنے فاصلے سے بھی دیکھ اور محسوس کر سکتی تھی۔

”آئی ایم سوری، میں آپ کا ناقابل حلائی نقصان کر چکی ہوں۔“ وہ اس کے پاس آ گئی تھی، اس کی آواز پہ حمدان یوں چونکا گویا ابھی اس کی موجودگی سے آگاہ ہوا ہو، گہری نیند سے جاگا ہو، کی اور دکھ صرف اس کی آنکھوں میں نہیں تھا، قدر کی بھی تھا، صرف دکھ اور نمی نہیں، کھودینے کا ملال بھی بچھتا دا بھی، اذیت بھی عداوت بھی، حمدان نے ہونٹ سمجھ لے، سرائیے جمع کیا جیسے ہر کیفیت اس کی ہر بات جھٹکتی ہو۔

”میں اس موضوع پہ اب کبھی بات نہیں کرنا چاہتا، جو ہوا..... وہ ساری زندگی کے لئے سبق سکھانے کو کافی ہے، ساری عمر کے لئے محتاط ہونے کو کافی ہے، دکھ اس بات کا رہے گا، ہے بھی کہ میں آپ کو شازدے سے الگ سمجھا تھا، مگر میں نے جانا انسان نصیب سے نہیں بھاگ سکتا، اگر

میرے نصیب میں ایسی عورت لکھی تھی تو کیسے بھاؤ کر سکتا تھا، نام اور شکل کے تبدیل ہو جانے سے نہیں فرق فطرت کی تبدیلی سے آتا ہے۔“ اتنا لکھیلی اتنا کھیلو جواب، قدر کا رنگ پھیکا پڑ گیا، چودہ طبق روشن ہو گئے، وہ لکٹی دیر ساکن کھڑی اسے دیکھتی رہی، پھر آنکھوں سے بہت سارا پانی دھیلے ہوئے گردن اور نظریں جھکا لیں، ابھی تو اس کی بات ہی مکمل نہ ہوئی تھی، ابھی تو اس نے اسے بتانا تھا اس کے ساتھ کیا ظلم ہوا، وہ اتنا بدگمان تھا کہ کچھ سنے بغیر فیصلے نہ کیا تھا اور دیکھا جاتا تو غلط وہ نہ تھا، اس کا اپنا تصور تھا، کیوں اس نے جذبات میں غصے میں اول فول بکا، کیوں بھلا اس نے اس سانچے کے بعد بھی اسی کی اپنے متعلق غلط فہمی دور نہ کی، دشمن نے تو اس کا فائدہ اٹھانا تھا، سراٹھایا، یہ جرم اس کے کھاتے میں درج ہوا تھا اور وہ حمدان کی عدالت سے بری نہ ہوئی تھی۔

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی اور سورج کا رنگ نارنجی تھا جب وہ گاؤں پہنچے، سائے لمبے ہو کر اپنا اثر کھو رہے تھے، یعنی دھوپ رخصت ہوئی دم توڑ رہی تھی، حمدان نے محسوس کیا وہ ضرورت سے زیادہ خاموش تھی، مگر دھیان نہیں دیا، وہ اپنی الجھنوں میں کچھ اس طور الجھا ہوا اور پریشان تھا کہ ان معمولی باتوں پہ اس کا دھیان جا بھی نہیں سکتا تھا، مگر پہنچے ہی وہ نہانے کھس گیا تھا، باہر آیا تو قدر کمرے میں نہیں تھی، اس نے پھر دھیان نہیں دیا۔

”بھائی جانے تیار ہے آ جا میں۔“ حرم نے دروازہ بجا کر اطلاع دی، حمدان نے ہمیر برش رکھ دیا اور پلٹ کر کمرے سے باہر آ گیا، قدر وہیں سب کے ساتھ موجود تھی، غانیہ تو خاص کر اس کے داری صدمے ہوئی نہ تھک رہی تھیں۔

”آپ کو چکن پکڑا پسند ہیں تو میں ابھی بنا لاتی ہوں چکن تو ہے کمر میں موجود.....“ حجاب ایکدم اٹھی، قدر نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ارے..... رے..... میں نے تو ایسے ہی کہا تھا، تمہارے ہاتھ کا کھاؤں گی مگر پھر کسی دن، ابھی تو کام نہیں کروا سکتی نا ہونے والی دہن سے۔“ خلاف عادت خلاف مزاج وہ اسے چھیڑ رہی تھی، حجاب کے ساتھ باقی سب نے بھی چونک کر دیکھا، حمدان تو باقاعدہ متعجب ہو کر رہ گیا تھا

”پیا کب تک واپس آئیں گے؟“ قدر سے نظریں پھیرتا وہ غانیہ کو مخاطب کرتا ہوا گھڑی دیکھنے لگا۔

”کیوں بٹے، جلدی میں لگتے ہو، کیا ابھی واپس چلے جاؤ گے؟“ انہیں نئی فکر لاحق ہوئی، حمدان خفیف سا مسکرایا۔

”آف کورس ماما اتنی لیو تو نہیں مل سکتی، یہ تو آپ نے کہا تھا انہیں چھوڑ جاؤں تو.....“

”تو کیا تم صرف قدر کو چھوڑنے آئے ہو، رگو کھسے نہیں؟“ انہوں نے مضطرب ہوتے سوال کیا، باہر اندھیرا کھل چکا تھا، ان کی تشویش بے جا نہیں تھی، وہ بہت متع کرتی تھیں رات کو سفر نہ کرو مگر یہ لڑکا سستا کہاں تھا۔

”ہے تو ایسا ہی..... مگر میں ابھی نہیں جاؤں گا، ارلی مارننگ نکلوں گا ڈونٹ دری۔“ ماں کی فکر مندی دور کرنے کو وہ نرمی و رسان سے کہتا مسکرایا تب کہیں جا کر غانیہ ذرا ریلیکس ہوئی تھیں، اسی

وقت غیب وہاں آیا تھا، قدر کو خصوصی اہمیت سے نوازا۔
 ”کیسی ہو بیٹے؟“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا، قدر کی جانے کیوں آنکھیں بھیگ گئیں اور محض سر اثبات میں ہلا دیا۔

”میرے لئے چائے اسٹڈی میں بھجوا دیں، یارمن آپ بھی وہیں آ جائیں۔“ کوٹ اتار کر ہاتھ میں پکڑتے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے وہ پہلے غانیہ پھر حمدان سے مخاطب ہوئے، دونوں ہی فی الفور سر گرم ہوئے، غانیہ چائے بنانے کو کچن کی سمت گئیں حمدان ان کے پیچھے اسٹڈی میں اسے خود ان سے بات کرنے کی جلدی تھی گویا۔

”بیٹھ جاؤ، میں جانتا ہوں تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو۔“ اپنے کمرے سے اندر آتے پا کر انہوں نے جس انداز میں کہا حمدان گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

”جہاں تک حرم کے معاملے میں غفلت کا مظاہرہ آپ کر رہے ہیں سمجھ میں بات آتی ہے مگر پیا..... حجاب کی شادی اتنی اچانک.....“

”اتنے رشتے روز روز نہیں ملتے، خاص کر اعتماد کے لوگ۔“
 ”مگر عرتو.....“

”عمر بہت اچھا لڑکا ہے ہر لحاظ سے، میں تو بہت پہلے سے اس کے لئے ایسا سوچتی تھی مگر تمہارے پیا کو اختلاف تھا، صد شکر اب وہ خود راضی ہیں۔“ غانیہ ٹرے سمیت اندر آئی تھیں اور جس انداز میں غفلت بھری مداخلت کی حمدان مزید ٹھنک گیا چونک گیا، اسے سمجھ نہ آ پائی کہ پس پردہ معاملہ ہے کیا۔

”حرم کی شادی کر دیں، مگر حجاب کو تو تعلیم مکمل کرنے دیں ابھی۔“ دے ہوئے لہجے میں کبھی مگر وہ اختلاف کر رہا تھا، یہ بات غانیہ تو محسوس کر رہی تھیں، غیب چوہدری بھی کر گئے، انہوں نے بغور بیٹے کی صورت دیکھتے کچھ اخذ کرنا پڑھنا چاہا مگر ناکام رہے تو اپنا پوائنٹ آف ویو اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”حدیث کا مفہوم ہے مومن ایک بل سے دوسری بار ڈسائنیں جاتا تو بیٹے عقل مندی کا تقاضا ہے کہ ہم ایک وار سے اگر خدا کے فضل سے بچ گئے ہیں تو دوسرے وار کا موقع ہی فراہم نہ کریں، تم سمجھ لو میں بہت ڈر گیا ہوں بیٹی کی عزت آگینے سے نازک تر ہوتی ہے، اس کی حفاظت کی خاطر چوکنے ہی نہیں ہونا پڑتا بروقت اور درست فیصلے بھی ضروری ہیں، مجھے اس اعتراف میں عار نہیں کہ ماضی میں میں غلط فیصلے کر چکا ہوں، جن کا نقصان بھی میرے حصے میں آچکا۔“ حمدان نے محض سر ہلایا، مگر اس کی آنکھوں میں سوال ہنوز تھے۔

”آپ کی بات بجا پیا..... مگر میں حجاب کی بات کر رہا ہوں، حجاب کے معاملے میں کیوں جلدی کر رہے ہیں؟“

”میں بھی حجاب کی ہی بات کر رہا ہوں بیٹے، حرم والے معاملے نے مجھے ڈرا بھی دیا ہے اور محتاط ہونے پہ بھی اسکا یہاں ہے، حرم کا مجرم بھلے سلاخوں کے پیچھے چلا گیا مگر بھلا کا ایک بیٹا ابھی آزاد گھوم رہا ہے جس کی بجز مانہ ذہنیت سے مجھے خطرہ لاحق ہے، مجھے دکھ ہے ہم بھائیوں میں بھلے

اتفاق نہ تھا مگر ہم کبھی یوں کسی کی عزت پہ حملہ آور نہ ہوئے تھے، بھر جائی نے بچوں کو تربیت کے نام پہ ایک بھی سکہ نہ دیا، بچوں میں لحاظ اور حیا نام کو نہیں۔“ اب کے وہ بے حد افسردہ مصلح اور یاس زدہ نظر آئے، غانیہ سر جھکائے تب سے بالکل خاموش بیٹھی تھیں، ان کی لائی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی، باپ بیٹا دونوں ہی اس جانب متوجہ نہ تھے۔

”آپ پڑھے لکھے ہو کر باحیثیت اور قانون دان ہو کر ایک معمولی لڑکے سے خائف ہو رہے ہیں بپا، آئی کانٹ بلیوٹ، اگر یہ فیصلہ اولیس کے خوف کے باعث ہے تو مجھے پھر بالکل پسند نہیں آیا۔“ حمدان نے جو ناگواری اور مخموس کی کمی ان کی بات پہ وہ بلا تردد ان کے سامنے رکھ دی، غانیہ کچھ بے چین ہوئیں مگر مداخلت نہیں کی، منیب چوہدری کا انمخلال اور یاس اس بات پر مزید بڑھا۔

”پڑھا لکھا ہوں باحیثیت اور قانون دان ہوں جیسی مجبور اور بے بس بھی ہو گیا ہوں بیٹے، کیا کرتا عباس کی اس بیچ حرکت کے بعد؟ عدالت میں کیس چلاتا یا پھر تھانوں میں پرچے کٹاتا؟ بیٹی کی عزت کو اپنے ہاتھوں اچھالتا پھرتا اور ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آسکتا تھا سوائے بدنامی و رسوائی کے، میری تو آنکھیں بند تھیں، رشتوں پہ ایسا ہی اندھا اعتماد تھا، یہ آنکھیں تو کھولی ہی شانزے اور عباس کے رویے نے ہیں۔“ ان کی آواز شدت جذب سے لرزے لگی تو یکدم خاموش ہو گئے، وہ پتھر تھے چٹان تھے اب اس چٹان میں دراڑیں پڑ رہی تھیں تب بھی ناقابل برداشت تھا غانیہ کے لئے، وہ بے قرار نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں، گویا بس نہ چلتا ہو سینے سے لگا لیں، آنسو پونچھ دیں، ڈھارس بندھائی، جان لٹائیں مگر اس شخص کا غم غلط کر دیں۔

”تم جانتے ہو جب سرمہ نے حرم کے لئے بات کی تو میں نظریں اٹھانے کے قابل نہ رہا تھا اس کے سامنے، اس نے پتا ہے کیا کہا مجھ سے، انکل حرم بے گناہ بھی ہے اور پاکیزہ بھی، ان کی پاکیزگی و پاک دامنی کا صرف میں گواہ ہوں، صرف میں ہوں جس کے سامنے نظریں بھی اٹھا سکیں گی اور وقار سے جی بھی سکیں گی، کوئی بھی تیسرا شخص اگر یقین کرے گا بھی تو مشکوک ضرور رہے گا، حجاب کو تو کوئی بھی اور متبادل شخص مل سکتا ہے مگر حرم کے لئے میں ناگزیر ہوں۔“

”میں تو بس اتنا جانتا ہوں بیٹے سرمہ کو اللہ نے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔“ مدان نے گہرا سانس بھرا وہ خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”حجاب کے لئے عمر..... میرا دل پتا نہیں کیوں آمادہ نہیں، عجیب سا خوف ہے پپا جسے کوئی نام بھی نہیں دے سکتا۔“ وہ مضطرب سا ہاتھ مسل رہا تھا، غانیہ اسے چونک کر بغور دیکھنے لگیں۔

”وہ اچھا نیک اور شریف بچہ ہے، بس کچھ خاموش طبع، جن لوگوں کو میرے بے جا غضب کا شکار ہونا پڑا ان میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے، بہر حال میں احسان مند ہوں اس کا کہ ہماری ضرورت کے وقت اس نے روایتی اتا نہیں دکھائی اور بھرم رکھ لیا ہمارا، خدا اسے جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔“ وہ مطمئن تھے، حمدان انہیں مطمئن ہی دیکھنا چاہتا تھا، جیسی کچھ نہیں بولا۔

”پپا کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے والدہ.....“ ماں کی طرف دیکھ کر وہ ناچاہتے ہوئے بھی مسکرایا، دل کا بوجھ ذرا سا بھی نہیں سرکا تھا، بلکہ جیسے بڑھ گیا تھا، غانیہ چونکیں۔

”ہاں..... آپ کی بھی ہو گئی ہے ٹھنڈی، میں گرم کر کے لاتی ہوں، آپ بیٹھو۔“
 ”میں ماما، اک دوست سے ملنا تھا، انتظار کر رہا ہوگا۔“

”جائے پی کے چلے جانا بیٹے۔“
 ”واپس آ کے کھانا کھاؤں گا اب ماما، پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔“ وہ گھڑی دیکھ رہا تھا، غانیہ نے مسکرا کر سر ہلا دیا، دونوں آگے پیچھے باہر آئے تھے۔

”مجھے لگتا ہے ماما آپ نے پیا کو نہیں بتایا کہ عراب میرا ہے، مجھے اختلاف ہی اصل میں یہ ہے اور ممکن ہے عمر نے پہلی بار انکار کو اپنی توہین سے تعبیر کیا ہو، غاب کے لئے کوئی اور مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔“ اس کے انداز میں بڑے بھائی سے زیادہ اک باپ کی سی تشویش تھی ٹھکر تھا، غانیہ بے ساختہ مسکرانے لگیں، پیار لڑائی نظریوں سے اسے دیکھا۔

”وہ شادی تو بس ایک داغ تھی جو بچے کو لگا، کچھ نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے، بہر حال وہ بندھن اب قائم نہیں، بی جان کے بتانے یہ ساری بات کھلی، عمر ہمیشہ سے جھٹوں کا ترسا ہوا ہے، اس شادی کی صورت اسے سب کچھ ہی میسر آ جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں استخارہ کر چکی ہوں، تمہارے پیا کو نہ بتانے کا مقصد یہی تھا، اک بات ختم ہو گئی اس کے تذکرے کا فائدہ۔“
 ”آپ مطمئن ہیں؟“ حمدان انہیں بغور دیکھ رہا تھا، غانیہ کھل کر مسکرائیں۔

”بالکل مطمئن ہوں، ڈونٹ یو وری۔“ ان کی مسکراہٹ بے ساختہ و بے اختیار تھی، حمدان کے دل سے صحیح معنوں میں جیسے بوجھ اترتا۔

”جھنجھ کا ڈ، اللہ کرے آپ ہمیشہ ایسے ہی مطمئن رہیں اور حجاب کے لئے کیا گیا آپ کا یہ فیصلہ آپ کو سرخ رو کر کے آمین۔“

”شم آمین، جیتے رہو بیٹے، اللہ تمہیں جلد اولاد کے بھاگ لگائے۔“ ان کی آخری دعا نے جو انہوں نے بے ساختہ دی تھی، حمدان کے چہرے کا رنگ خنجر کر ڈالا تھا۔

☆☆☆

کاش ایسا ہو کہ اب بے وفائی میں کروں
 تو پھرے قریب بہ قریہ کو بہ کو میرے لئے
 میں لاکھود ہو جاؤں سمندر کی طرح
 تو نہ بہ دریا بہ دریا جو بہ جو میرے لئے

”اتنا سارا کچھ؟ بیٹے ہم نے تو سب کچھ بنا رکھا تھا، آپ نے کیوں تکلف کیا۔“ حمدان واپس لوٹا تو وہ سب سامنے والے کمرے میں موجود تھے، سوٹ کیس کھلا ہوا تھا بیش قیمت سامان پھیلا ہوا، پرس جو تے بیش قیمت چمچوری اور بہت خوب صورت ڈریسز جو اتنے قیمتی تھے کہ غانیہ اور لڑکیاں ان کا بس تصور کر سکتی تھیں، غانیہ متذبذب تھیں، لڑکیاں البتہ خوش بھی تھیں اور متاثر بھی، حمدان دروازے پہ آ رہا۔

”قدر کی اس کی جانب پشت تھی اس کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی اسے۔“
 ”اتنا بہت کچھ تو نہیں، کم از کم اتنا جتنا بڑی بہو اور بھابی کی حیثیت سے ہونا چاہیے تھا، سچ

پوچھیں تو یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ میں نئے سرے سے تو کچھ کر ہی نہ سکی جو گھر میں موجود تھا وہی لا پائی۔ ”وہ خفیف سی کہہ رہی تھی، حمدان تو البتہ اس کے پہلے فخرے میں ہی اٹکا ہوا تھا۔“

”بڑی بہو اور بھابھی کی حیثیت.....“ اللہ اللہ یہ تہدیلی، اسے تو اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا یہ قدر لی لی کے ہی الفاظ ہیں اور وہ اتنی سیانی کب سے ہو گئی کہ یہ سارے رشتے اور تقاضے بھانے لگی۔

”بیٹے..... یہ آپ کی چیزیں ہیں اور سب کی سب بہت زیادہ قیمتی..... ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق بیٹوں کے لئے جہیز تیار کیا ہے، اللہ آپ کو یہ سب پہنا اوڑھنا نصیب کرے، تمہارا“ طرف سے ہم وہ تحائف رکھ رہے ہیں جو ان کا بھائی لایا ہے، آپ یہ سب سنبھالو شاباش۔“ غانیہ نے بہت پیارا اور رساں سے ایسے اسے سمجھایا کہ اسے کچھ بھی محسوس نہ ہو برا نہ لگے، حمدان بالکل خاموش تھا اور ہونٹ سینچے کھڑا تھا۔

”مگر میں تو ایسی ہیوی جیولری اور ڈریسز پہنتی ہی نہیں، میرے لئے تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، آپ پلیز رکھ لیں گی تو مجھے اچھا لگے گا۔“ اب کے وہ بولی تو اس کے لہجے میں اس کی عمر کالا ابالی پن اور بچپن تھا، غانیہ بے ساختہ مسکرائیں۔

”بیٹے نہیں پہنتی تھی تو اب پہنوں گی، شادی کو دن ہی کتنے ہوئے خیر سے، اب ہی تو موقع ہے۔“ حمدان نے قدم واپسی کو موڑ لئے تھے، اس کا موڑ قد کی حماقت و بے وقوفی کے باعث خراب ہو چکا تھا۔

”کہاں جا رہے ہیں بھائی! بیٹھیں نا، ابھی تو کورم پورا ہوا ہے۔“ حجاب کے مسکرا کر کھڑا لگانے پر قدر نے چونک کر پلٹتے ہوئے دیکھا اور اسے موجود پا کر جیسے خفیف سی ہو گئی۔

”جھپٹیں..... پھر سہی..... بہت تھکا ہوا ہوں گڑیا، پلیز آرام کرنے دو۔“ وہ حجاب کو زری سے ٹال رہا تھا، قدر اسے دیکھے گئی، جانے کیوں ایک شعر شدت سے یاد آیا۔

روٹھ جاتے ہو تو کچھ اور حسین لگتے ہو ہم نے یہ سوچ کر تم کو خفا رکھا ہے اس نے گہرا سانس بھرا، حجاب نے سر ہلا دیا تھا، وہ پلٹ کر جا رہا تھا، قدر اسے دیکھتی رہی گھورتی رہی، پھر نظر پھیر لی۔

خود پہ اتنا مان ہے مڑ کر نہیں دیکھتی جسے کہہ دوں کہ میرا ہے اسے ہونا بھی پڑتا ہے عجیب سازم اترا آیا تھا اس کے دل میں، یہ زعم ہمراہ تھا جب وہ سونے کو کمرے میں آئی تو حمدان کو جانتے اور سگریٹ پھونکتے پایا تھا، اسے دیکھتے ہی خود بھی سلگ اٹھا۔

”آپ نے یہ کیسے سوچا خان زادی کہ میں اپنی بہنوں کے لئے آپ کی خیرات قبول کروں گا، جاتے ہوئے یاد سے اسے سمیٹ کر لے جائیے گا، اس کے حقدار آپ کو اور بہت مل جائیں گے۔“

حملہ اچانک اور شدید تھا، وہ تو جیسے اس کے گلے پڑ گیا تھا، پھٹ پڑا تھا، قد، گھبراہٹ، شاک

زده اسے دیکھنے لگی، یہ تو اس کے گمان تک بھی بات نہ تھی، جو وہ کر رہا تھا، اس نے تو بس ایک احسن قدم اٹھانا چاہا تھا غلطی سے۔
 ”میرا یہ مقصد نہیں تھا، میں تو.....“

”شٹ اپ..... آپ کا جو بھی مقصد تھا قدر ہیگم اپنی فیاضی و سخاوت کی چادر کو سمیٹ لیں، آپ بہت مالدار ہیں جانتا ہوں مگر ہم کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے۔“
 وہ پھنکار رہا تھا، رنگ بالکل سرخ ہو رہا تھا دہک کر، قدر کا چہرہ متغیر ہوا تھا، ہونٹ کلیجی وہ آنسو روکنے لگی، حمدان تو جانے کب کب کا غصہ اس پہ ایک ہی ساتھ نکالنے بیٹھ گیا تھا، یا پھر اس کا دل ہی بیچ کر اسے خوار کر رہا تھا۔

”میری ماں اور بہنیں بہت خوددار بھی ہیں اور روادار بھی آپ کی طرح بے لحاظی پہ کبھی نہیں اتریں گی، سو بہتر ہے ان کے جذبات سے بھی نہیں کھیلیں، یہ جو آپ نے ڈرامہ لگایا ہوا ہے نا محبت کا اسے بھی بند کریں، آپ کے پل میں ملنے والے مزاج سے ہر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔“

حمدان کا لہجہ و انداز ہنوز تھا، وار مسلسل جاری تھے اور مقابل اس کا نازک دل، پتا نہیں وہ اتنا کٹھور کیونکر ہو گیا تھا کہ لحاظ مروت ہی بھلا بیٹھا، قدر اب بھی کچھ نہ بولی، البتہ آنسوؤں پہ اختیار نہ تھا، سواٹھ کرواں روم میں بند ہو گئی، کبھی قسمت تھی اس کی، محبت اسے اپنی جھلک دکھا کر آگے آگے بھاگنا شروع کر دیتی تھی، پہلے پاپا..... بچپن میں کیسے جان لٹاتے تھے اس پہ، وہ ان کے سینے پہ سوئے پشت پہ سوار ہونے اور کاندھوں پہ جمونے کی عادی ہو گئی تو انہوں نے اپنی بے جا بڑھ جانے والی مصروفیات کی بناء پہ کبھی مگر اسے وقت کم دینا شروع کر دیا، پھر علی شیر آیا، یا وہ خود اس کی سمت متوجہ ہو گئی، علی شیر کی اسے دی گئی خاصیت، اہمیت اور بے پناہ ذہنی ہم آہنگی اسے علی شیر کے قریب کر گئی، وہ اسے اپنا سب کچھ سمجھنے لگی، دوست مہربان نجات دہندہ تک، مگر وقت نے ثابت کیا وہ نہ اس کے نصیب میں تھا نہ زندگی میں، اس نے اسے کھوتا تھا سو کھو دیا، یہ سانحہ شدید تھا ویسے ہی جیسے سلیمان کی عدم توجہی سے وہ بہت عرصہ سمجھوتہ نہیں کر سکی تھی، علی شیر اس کی زندگی سے پوری طرح نکلا نہیں تھا کہ حمدان منصف کی دستک شروع ہوئی، حمدان منصف، جو علی شیر کے مقابلے میں ظاہر اے حد وجہہ سمارٹ اور گنڈ لنگ تھا، اعلیٰ عہدے پر تھا، کوئی کمی نہ تھی مگر بات تو دل کی تھی، اس کا دل اس سے نہ ملتا تھا، پھر علی شیر کی پڑھائی پٹیاں اور باپ کا مسلط کیا گیا جبری فیصلہ، اسے حمدان منصف سے مزید متفر اور بدگمان کر گیا، اس بدگمانی کی حاسد لو کو منصف حیات کی اجارہ داری نے اور بڑھا دیا جسے وہ محبت کا نام دیتا اور محبت کا پرچار کرتا رہا مگر محبت کا درس اسے دینے والا خود محبت پہ قائم نہ رہ سکا اور وہ اس کے ساتھ رہتے رہتے اس سے نفرت کرتے کرتے جانے کب کیسے اسے پہلے قبول کر گئی اور پھر دل میں گنجائش محسوس کرتی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی، اس محبت کا انکشاف اس روز اس پہ ہوا تھا جب اس نے حمدان کے بچے کو دنیا میں لانے کا فیصلہ کیا، اس نے جانا تھا وہ اس بندے کو دکھ نہیں دے سکتی جس کی محبت کی نشانی اس کے لپٹن میں سانس لے رہی تھی، محبت صرف انکشاف نہیں ہوتی، محبت اگر سمجھا جائے تو حادثہ ہوتی ہے، سانحہ ہوتی ہے، عذاب ہوتی ہے، اس کے دل میں آ جانے کے بعد سکون رخصت ہونا شرط ہے، جتنی بے قراری مقدر ہوتا

شرط ہے، محبوب کی رضا اولین ٹھہرتی ہے، حکم کی بجا آوری لازم قرار پاتی ہے، وہ ان عذابیوں سے ہی گزر رہی تھی، حالانکہ مذاحمت کر رہی تھی، حمران کو بدلتی کیفیت کی ہوا نہ گلنے دینا چاہتی تھی جیسی دانستہ اس سے ابھتی، بدتمیزی سے بات کرتی، اکڑتی، مقصد یہی تھا، اسے پسائی گوارا نہ تھی، نادان تھی، حالانکہ پسپا تو ہو گئی تھی، ہار تو لینی تھی منہ سے بھلے نہ کہتی مگر اب چوری چوری اسے دیکھتی تھی، اس کی بے نیازی پہ کڑھتی اور لاشعری پہ دل کو کڑھتا ہوا محسوس کرتی تھی، باپ کی محبتوں سے لی گئی اسنے لئے قیمتی اشیاء وہ بے یقینی تھوڑی اٹھا لاتی تھی، کہیں نہ کہیں دل میں خواہش دہی تھی شاید وہ پتھر پھٹکے، ہو سکتا ہے وہ تنگ کر اس کی اس ادا پہ ہی شمار ہو جائے، مگر وہ تو الٹا جھگڑنے لگا تھا، مرنے مارنے پہ آگیا تھا، پتا نہیں غلط ہوئی یا حمران تھا، اس نے تو اپنی مختصر سی دانائی استعمال کی تھی، جس کے نتیجے میں ہونے والی عزت افزائی نے دل پارہ پارہ کر ڈالا تھا، وہ رورور کر تھک رہی تھی، خاص دیر بعد واش روم سے نکلی تو کمرے میں حمران کے خرائے گونج رہے تھے، اس کا زخمی دل مزید لہو لہان ہونے لگا۔

”بھئی بھلا اس بندے کو اس کے جذبات و احساسات کی ذرا بھی پرواہ حالانکہ کبھی اس سے محبت کا دعوے دار تھا، اب وہ محبت کہاں چلی گئی، اس کا جی چاہا بے خبر سوئے خور و نظر آتے حمران کو جھنجھوڑ کر پوچھے۔“ اس نے سرد آہ بھرتے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

تیرے قریب رہ کر تجھے تلاش کروں
محبتوں میں میری بدحواسیاں نہ کریں

☆☆☆

یہ جملہ عروسی کا منظر ہے، کمرہ سادگی کا اعلیٰ نمونہ، دلہن کے استقبال کو ایک پھول تک موجود نہیں، دلہن بھی روایتی انداز میں بیڈ پہ سکرسمٹ کر سر جھکائے بیٹھنے کی بجائے اپنا بھاری لباس سنبھالے گھبراہٹ میں بوکھلاہٹ میں جھلا روتے ہوئے بچے کو سنجال رہی تھی، بچہ زار و قطار روتا ہے، دلہن کو بچوں کے متعلق بالکل معلومات نہیں، وہ سمجھ نہیں پاتی بچے کی بے قراری کی وجہ، بچے کو گود میں لئے کاندھے سے لگائے وہ ادھر ادھر ٹپکتی ہے، معاً اک خیال اسے ٹھٹھکا دیتا ہے۔

بچے کی بھوک کا خیال، بچے کو کاندھے سے لگائے وہ فیڈر کی تلاش میں کمرے سے باہر آتی ہے، اس سمت آتا ہوا دلہا تھک جاتا ہے، دلہن کا مگر دھیان اس پہ نہیں، وہ بچن کا رخ کرتی ہے، بچے کے رونے کی آواز تیز ہو رہی ہے، دلہن بچن میں فیڈر تیار کرتی ہے، بچہ اس نے وہیں ٹیبل پہ لٹا دیا ہے، گھر کی خاموش اور نیم تاریک آئینہ میں دلوار پھیلا گ کر کچھ سائے اندر کودتے ہیں، ان کے لباس کی سرسراہٹ دلہا کو چونکا دیتی ہے، مگر اسے پلٹنا نصیب نہیں ہوتا، اسے پیچھے سے قابو کر لیا جاتا ہے۔

”تم اسے سنبھالو، بلکہ باندھ ڈالو، دلہن کو میں دیکھنے کو میں خود کافی ہوں۔“ اسلحہ اور نقابوں سے لیس وہ غنڈے دلہا کی مشقیں کتے جملہ عروسی میں لاپھٹکتے ہیں، چٹختی بدحواس سر اسامیہ دلہن کو ہٹا کٹا جوان قابو کیے اندر لاتا ہے، بچہ وہیں ٹیبل پہ ہاتھ پیر مارتے بلک رہا ہے، دودھ کی بوتل فرش پہ لڑھکتی ہے اور دودھ بے دریغ زمین میں بہہ رہا ہے، دلہا کے منہ پہ کپڑا کس کے باندھ دیا گیا ہے،

دلہن کے صرف ہاتھ اور پیر باندھے گئے ہیں، وہ جیتی ہے اور مدد کو پکارتی ہے، دلہا کی سمت آنسو بھری فریادی نظروں سے دیکھتی کر لاتی ہے، وقت ختم کیا ہے، فضا ساکن ہے، پرندے سہم کر چپکنا بھول گئے ہیں، جملہ عروسی میں شیطان کا کھیل شیطان کا رقص جاری ہے، بے بسی آئیں بھرتی ہے، جو اس مردی اپنی طاقت کی لا چاری پہ شرمسار پڑی ہے۔

چاند سیاہ بدلیوں میں منہ چھپائے ماتم کنٹاں ہے، صحن میں ساکن کھڑے درخت کی شاخوں میں گھونسلہ بنائے چڑیا ملول ہے اور بے قراری سے چوں چوں کرتی ہے، شاید اس کا نوزائیدہ بچہ بھوک سے مر گیا ہے، اس کی پکار میں ہوگ ہے، کر لاہٹ ہے، آسمان برسنے کو تیار ہے، شیطان کا جال گہرا ہے، کامیاب ہے، ایک فیصلہ وہ شخص کرتا ہے بچاؤ کا، ایک وار تقدیر کرتی ہے گھبراؤ کا اور تقدیر کا وار کاری ہے۔

☆☆☆

سب امتحان عشق کے اپنے کڑے رہے
ہم کوزہ گر کے چاک پہ برسوں پڑے رہے
ان کی نگاہیں شوخ تھیں ہم تھے حیاء پسند
مشتاق وہ ہم اپنے کہے پہ اڑے رہے
بیٹھے رہے ہم رات کی راہوں کے خواب اگر
دل مرحلہ دید میں حائل کھڑے رہے

اشملال ان کی ذات کا حصہ بننا جا رہا تھا، فیصلے غیر پائیدار ثابت ہوں تو بچھتاوئے میں ڈھل جاپا کرتے ہیں، روشنی کیا تھی شادی کے بعد ان پہ کھلا، وہ شوق دھرا رہ گیا کہ اسے بدل سکیں گے، وہ تو انہیں بدلنے کے درپے ہو گئی تھی، انہیں اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہتی تھی، ان کی آنکھوں سے سب خواب نوج کر انہیں مفلوج کر کے خود ان کی جگہ یہ آ جانے کو بر قول رہی تھی، ایک بار پھر فیصلے کا کٹھن مرحلہ درپیش تھا اور ان کے شکستہ اعصاب، سب سے زیادہ انہیں آ پایا د آئیں، ٹوٹ کر آئیں کیسے کیسے نہ تڑپی اور ملکی تھیں وہ ان کے سامنے کہ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لے، مکر وہ تو جیسے ضد پہ اڑ گئے تھے۔

”آپ.....“ بے قراری و ندامت کا ایسا غلبہ چھایا کہ وہ ان سے رابطہ بحال کرنے سے خود کو روک نہ سکے۔

”وہ تو نہیں ہیں، ہاسپٹل ہوتی ہیں آج کل، آپ کو ان کی یاد کیسے آگئی، بیگم صاحبہ سے فرصت مل گئی جناب کو.....؟“

یہ علی شیر تھا، خطر کے تیر چلاتا ہوا بے لگائی کی انتہا کو چھوتا، سلیمان کا دکھا ہوا دل بالکل پھوڑا بن گیا مگر ضبط کا کمال تھا، حوصلہ غضب کا رکھتے تھے، اس وقت بھی برداشت رکھا گئے، اس کا رویہ نظر انداز کر گئے۔

”کون سے ہاسپٹل میں.....؟“

”آپ وہاں جانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟ معذرت ایسی حماقت نہیں کیجئے گا براہ کرم، بڑی

مشکل سے ان کی طبیعت ذرا سی سنبھلی ہے، میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“ وہ ایسے بولا جیسے ماں کی سنبھلی ہوئی طبیعت میں اس کی ہی تو دعاؤں اور خدمتوں کا سارا کردار رہا ہے۔

سلیمان خان خاموش ہو گئے، انہوں نے کال کاٹ دی، لیکن دھیان بٹا سکے نہ ذہن، آپا بیمار تھیں، وہ ماں جانی تو تھیں مگر ماں کی طرح تھیں، ماں سے کم نہ تھیں بلکہ حقیقت یہ تھی سلیمان کو ماں کا پتا ہی نہ تھا، انہیں تو ماں کے احساس سے روشناس ہی آپا نے کروایا تھا، ان کے ہر دکھ پہ ترپ اٹھنے والی، ان کی خوشی پہ دعا دینے والی ان کی آزمائش پہ خدا سے مناجات کرنے والی ان پہ ہونے والی عطا پہ تشکر بجالانے والی، سستی آپا کی تھی، انہیں کیا ہو گیا تھا، وہ ان سے بے اعتنائی کا مظاہرہ کر گئے، ان سے بے رخی برت لی، جن کے اتنے احسانات تھے کہ وہ شمار نہ کر پاتے، یہ کیسا جادو چل گیا تھا، کیسا غضب ہو گیا تھا، انہیں دکھ ہوا، انہیں ملال گھیر گیا۔

اس بچھتاؤے کے بعد اگلا مرحلہ فیصلہ کرنے کا تھا، انہوں نے ان سے ملنے کا فیصلہ کیا اور اگلے دن وہ ان کے دروبرو تھے، وہ ایسے ہی تھے، جو کرنے کی ٹھان لیتے پھر کسی مائی کے لال میں جرات ہوتی بھلا کہ انہیں روک سکے، ان کا راستہ تو دریا کے دھارے اور بلند و بالا پہاڑ نہ روک پاتے تھے، کسی انسان کی ایسی ہمت کہاں۔

”آپا..... مجھے معاف کر دیں، آپ کو دکھ دے چکا ہوں۔“ ہاسپٹل کے بیڈ پہ جو وجود تھا، وہ نحیف و نزار تھا، حالات کا دھکیلا ہوا، غم کا منظر..... سلیمان پہلے کیا طول تھے جواب ہوئے، آپا کچھ نہ بولیں، بچکیاں بھرتی رہیں، ہاتھ کے اشارے سے انہیں گلے لگنے کا اشارہ کیا۔

”اگر تم لوٹ آئے ہو سلیمان تو اب بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

کبھی بات تھی، سلیمان کے دل میں شکاف پڑ گئے، محبت بڑی ظالم و سفاک کیفیت کا نام ہے، جس کے نصیب میں درج ہو جائے تباہی کے دھانے تک پہنچائے بغیر دم نہیں لیتی، انہیں اس بات سے اس فقرے سے اک اور ہستی کا خیال بھی آیا، ہجر کا روگ جس کی روح کو بیمار کر گیا تھا مگر وہ اس خیال سے دامن چھڑا لینا چاہتے تھے۔

”کمال ہے، ایک انسان بھی دوسرے انسان کے لئے آسجمن کا کام دے سکتا ہے، یہ انکشاف بھی آج ہو گیا، اگر اتنا ہی لازم و ملزوم تھا آپ کو اپنا بھائی تو اس دن انہیں کیوں نہ بلوایا، ہمیں خواہ خواہ پریشان اور خوار کیے رکھا۔“ یہ ممکن نہ تھا کہ علی شیر سامنے ہو اور زہر نہ اگلے، یہ ممکن نہ تھا، سودہ زہرا گلی رہا تھا، حالانکہ یہ حقیقت تھی کہ اس نے نہ تو پریشانی سہی تھی نہ خواری برداشت کی، ماں ہاسپٹل میں تھی تو تھی، وہ کبھی حال پوچھنے نہ آیا، اب باخبر ذرا رخ سے سلیمان کی آمد کا معلوم ہوا تو ضرور بھاگا آیا تھا، مقاصد تو بہت تھے پیش نظر جن میں ایک سلیمان کو پریشان کرنا بھی تھا۔

آپا کی آنکھوں میں عجیب سی بے بسی آگئی، بیٹے کی بدتمیزی بھائی کے لئے قابل برداشت نہ تھی مگر وہ دفاع کی پوزیشن میں تھیں نہ ہی اسے روکنے کی ہمت رکھتی تھیں، سلیمان نے خاموشی اختیار کی، اس سے کہیں بڑھ کر تنفیک آمیز توہین برداشت کی تھی، جو بیڑا انہوں نے اٹھایا تھا، جو مقدمہ لے کر چلے تھے، اس میں قدم قدم پہ آزمائش تھی، ہمت ہارنے والے ہوتے تو بیس سال اس شعبے میں ثابت قدم نہ رہتے، اس وقت بھی الٹا بہن کو حوصلہ دیا، نرمی سے خاموشی سے ان کا

ہاتھ دبا دیا۔

”سنا ہے آپ نے قدر کے ساتھ زبردستی کی، اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کی، جو انسان خود اپنے معاملے میں اتنا شدت پسند ہے کہ اپنے شریک زندگی کے انتخاب پہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا، رشتوں کا لحاظ نہیں کرتا، وہ اپنی اولاد پر ایسا جبر کرنے کا حق کہاں سے نکال لایا۔“ مزید کچھ ٹائم آپا کے ساتھ گزار کر جب سلیمان واپس جا رہے تھے، علی شیر ان کے تعاقب میں لپکتا ہوا آیا تھا، اس کا انداز سراسر اسٹریٹ زنی کا اور آگ لگانے والا تھا۔

”یہ حق مجھے میرے تعلق نے دیا، باپ ہونے کی حیثیت سے میں اس کے لئے بہترین کے انتخاب کا حق محفوظ رکھتا تھا، تمہیں غلط لگتی ہوئی، میرے اس فیصلے سے وہ ہرگز غیر آسودہ نہیں۔“ ”یہ بات قدر نے آپ سے خود کہی؟“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے حقارت زدہ انداز میں استفسار کرنے لگا، سلیمان نے صبر کا گھونٹ پھر بھرا۔

”میری بیٹی اب کسی کی بیوی ہے اور غیرت مند مردوں کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عزت کے متعلق کسی کے منہ سے حرف نہیں نکلنے دیتے، کیا مجھے تمہیں بتانا پڑے گا کہ تم حد سے بڑھ رہے ہو؟“ انہوں نے سرخ نظروں سے اسے دیکھتے گویا بہت کچھ جتایا، اب کے علی شیر کچھ نہ بولا، خاموش کھڑا اسلگتی نظروں سے دور ہوتے سلیمان خان کی پشت کو نظروں کے شراروں سے داغ غار بنا پھر زہر خند سے مسکرایا۔

(بہت دعویٰ ہے تمہیں خان کہ تمہاری بیٹی بہت عزت دار ہے اس عزت کو بیچ چورا ہے یہ بے عزت نہ کیا تو علی شیر نام نہیں)۔

اس کی رگ رگ میں زہر دوڑ رہا تھا، اس کی سوچوں میں شغور اور بغاوت کے سوا اگر کچھ تھا تو وہ شیطانیت بھی اور بس.....

☆☆☆

www.urduubooks.com

بہت سی بے سبب باتیں

نظا تمہید ہوتی ہیں

جو اکثر تم سے کہتا ہوں

سنو اور کیسے ہو.....؟

سنو سردی بہت ہے تا

نہیں موسم تو اچھا ہے

چلو اچھا میں چلتا ہوں

دوبارہ فون کر لوں گا

یہ ساری بے سبب باتیں

اور اس تمہید میں جاناں

گزر جاتے ہیں سب لمحے

گزر جاتے ہیں جب لمحے

تو پھر میں سوچتا ہوں کہ
ذرا سی بات ہی تو ہے
تمہیں جلدی سے کہہ دوں گا
مجھے تم سے محبت ہے

کمرے کی کھڑکی سے وہ کب کی اسے دیکھ رہی تھی، سفید کاٹن کا سوٹ جواب تک لٹکھا سا ہو چکا تھا، ممکن آلود ہو رہا تھا، پہنے وہ بیرونی دروازے میں کھڑا کام کرنے والے لڑکے کو کچھ سمجھا رہا تھا، پھر وہاں سے پلٹ کر سڑکیاں چڑھتا اور چلا گیا، اس کی مصروفیات ختم ہی نہ ہوئی تھیں نہ اتنا ناظم تھا کہ نگاہ بھر کے اسے دیکھ ہی لیتا، خیر جب ناظم ہوتا تھا تو نگاہ بھر کے دیکھتا تو تب بھی وہ اسے چھوڑ چکا تھا، دل نے فی الفور شکایت جڑ دی تو سر دآہ اس کے ہونٹوں سے خارج ہوئی تھی، حالانکہ یہ وہی تھا جس نے بھی کتنے جذب سے کہا تھا۔

”ایسی باکمال خوب صورت لڑکی کہ جسے دیکھتے ہی عشق ہو جائے جو کوئی بھی تم سے ملے تمہاری دلکشی اور جا زبیت کا اسیر ہو کر اٹھے جیسے میں، ایسا با اثر حسن و جمال کہ مقابل ہاں ہاں کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکے، تمہاری مجال کہ آپ کے سامنے انحراف کر سکیں کی بات سے۔“

گو کہ اس کا انداز شوخی و شرارت کا تھا مگر کیا شک کہ متاثر کن تھا، حقیقت یہی تھی جبکہ وہ اثر لئے بغیر اسے گھورتی رہی تھی، اس کے گلے بڑھ گئی تھی، وقت کتنی جلدی پلٹ جاتا ہے، کتنی جلدی بدل جاتا ہے، حیران کہ انداز و اطوار دیکھتے اسے یقین نہ آتا تھا اس کا وہ بھی اتنا اسیر بھی رہا تھا۔

”بیٹے آپ کا ناشتہ یہاں لا دوں یا.....؟“
دو ہی لڑکیاں تھیں گھر میں دونوں ایک ساتھ رخصت ہوئیں تو گھر جیسے خالی ہو گیا، سارا بوجھ ہی آکر غائب ہے آ گیا تھا، پچھلے کئی دنوں سے شادی کی تیاریوں کا سلسلہ اور کل سے اور کئی ذمہ داریوں کا بوجھ، انہیں تو صحیح معنوں میں چکر بنادیا تھا، قدر ایک دم شرمندہ ہو گئی، بجائے ان کا کچھ ہاتھ بٹانے کے وہ ان پر اپنا بھی بوجھ لا دے بیٹھی تھی۔

”نہیں نہیں آئی، میں وہیں آ رہی ہوں۔“ خفت بھرے انداز میں کہتی وہ ان کے ساتھ ہو لی، لیکن کا زیادہ کام وہ کام والی لڑکیوں کے ساتھ مل کر سمیٹ چکی تھیں، قدر کی مدد کروانے کی آفر پہ نہال ہوتے دعاؤں سے نوازنے لگیں۔

”نہیں بیٹے..... تم کھاؤ پہنو اوڑھو، میرا دل یوں ہی بہت خوش ہو جائے گا تم سے، کام تمہارے کرنے کے نہیں، بس ناشتہ کرو تو حیران کو چائے دے آنا، صبح سے بریڈ کے دونوں لے کر بھی محوم رہا ہے بچہ بیچارا۔“ ان کے اندر میں بیک وقت دونوں کے لئے محبت بھری ہوئی تھی، جو بات کہی جو ذمہ داری سوچی اس نے قدر کی ساری دلچسپی سمیٹ لی، ناشتہ یونہی بے دھیانی سے کیا، بس دل عجیب حماقت میں جا پڑا تھا، عجیب تقاضا تھا وہ سامنے ہو، اس کی توجہ حاصل ہو، کوئی بات کرے، چاہے لڑائی ہی۔

کل وہ اس کی اسی توجہ کی خاطر ایک عرصے بعد اتنا دل لگا کر تیار ہوئی تھی، بلڈ ریڈ کلر کی ساڑھی پہ کہیں کہیں تارہ جھلکتا تھا، ساڑھی سے میچنگ کرتے بڑے بڑے جھکے جو اس کے معصوم

بیضوی چہرے پہ ایسے ججے تھے کہ اسے خود اپنے اوپر پیار آ گیا، ان کا سرخ عکس اس کے گلے کے اوپر دودھیا گردن پہ گویا خون جھلکانی شعلے میں بکھر رہے تھے، ایک کلائی میں نازک برید سلت اور دوسری میں خوب صورت ٹککتے ٹککن اس کے دل میں انوکھی سی خواہش جگا رہے تھے، حمدان کے دیکھنے میں بہت ہونے اور سراہے جانے کی خواہش مگر اسے یہ سب نصیب نہ ہوا، اللہ جانے حمدان مصروف ہی اتنا تھا کہ اس پہ دھیان نہ دیا یا پھر دانستہ وہ اس پہ توجہ نہ کرتا ہی نہ چاہتا تھا، بہر حال جو بھی تھا اس کا دل زخمی ہوا جا رہا تھا۔

”یہ آپ کی چائے۔“ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی چھت پہ آئی تھی جہاں وہ فرصت انجوائے کرتا سرکٹ سلگائے کش لینے میں مصروف تھا، اس کی اچانک آمد پہ چونکا اور چائے سمیت موجود پا کر ماتھے پہ تیوری چڑھائی۔

”آپ کو کیا ضرورت تھی زحمت کی؟“ کہ اس کے ہاتھ سے لے کر منڈیر پر پختا ہوا وہ کتنی رکھائی سے بات کر رہا تھا، قدر کا دل مجب سے رخ سے لبریز ہوتا چلا گیا۔

”اگر ایسی بات تھی تو پھر خود خیال کیا ہوتا، میں نے تو آپ کی والدہ کو زحمت سے بچانے کو ان کے حصے کا کام کیا، خوش فہمی میں جھلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“

پتا نہیں کیا بات تھی، وہ پھل ملی تھی، ہار ملی تھی، مگر شکست تسلیم کرنے پہ آمادہ نہ ہوتی تھی، اکثر کے جواب میں اکثرے جاتی تھی۔

”میں انہیں منع کر دوں گا، شہزادی صاحبہ سے ایسے کام نہ لیں۔“ وہ زہر خند سے بولا تو قدر پھر سی گئی۔

”تو پھر آپ کو اپنے معیار کے مطابق بیوی لانی چاہیے تھی، جو آپ کی غلام اور آپ کی ماں کی خدمت گار ثابت ہو سکتی۔“

”بے فکر ہیں، جو حالات ہیں، ایسا بھی ہو ہی جائے گا۔“ حمدان کے جواب نے قدر کو ایک دم ساکن کر دیا، اس نے بے ساختہ اسے دیکھا، نظروں میں جو ہم اتر اس سے حمدان بھی واقف ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔

”اگر آپ کی بچی سوچ تھی تو پھر آپ پہلے ہی ایسا فیصلہ کر لیتے، میرے باپ کو بے وقوف بنانے کی کیا ضرورت تھی۔“ اس کی آواز رندہ گئی تھی، حمدان نے سرکٹ پیچک کر جوتے سے مسلا، اک نگاہ اس پہ ڈالی۔

”میں نے کسی کو بے وقوف نہیں بنایا۔“ اس کا انداز غوت آمیز تھا، قدر کچھ دیر اسے غم نظروں سے دیکھتی رہی، پھر جھکے سے چلتی تھی کہ وہ بے اختیار پکار بیٹھا۔

”کمرے میں آپ کی مطلوبہ اشیاء موجود ہیں، لے لیجئے گا۔“ قدر کے وجود کو جھٹکا لگا، کل رات تقریب کے بعد وہ اسے محض زنج کرنے کی خاطر کہہ آئی تھی کہ اسے کل کے سوٹ کی میچنگ سینڈل چاہیے، مگر سے تو لانی تھی مگر اب ادھر ادھر ہو گئی مل نہیں رہی، ایک فیصلہ بھی امید نہ تھی وہ لا بھی دے گا مگر اب یہ خوشخبری ایسے وقت میں سنائی تھی کہ بجائے خوشی کے اسے آگ لگتی محسوس ہوئی تھی دل میں۔

”مجھے نہیں چاہیے آپ کی یہ خیرات، اسی کے لئے رکھ لیں سنبھال کر جس سے آنے والے وقتوں میں گھر بسانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔“ جلا کر خالصتا مشرقی بیویوں والا جواب حمدان کو پہلی بار چونکانے کا باعث بنا، چائے کا کپ اٹھانا بھول کر وہ اسے بغور دیکھنے پہ مجبور ہوا۔

”جب اس کا وقت آئے گا اس کے نصیب کا اسے مل جائے گا، یہ آپ کے لئے ہی لایا ہوں۔“ مسکراہٹ ضبط کرتا وہ اسے اور جلال دلانے کو بولا، قدرنے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی البتہ الفاظ نے ضرور دل توڑ دیا، کچھ کہے بغیر آنسو ضبط کرتی وہ جلدی سے نیچے چلی گئی۔

(میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے، جو خود کو ہار سے نہ بچا سکیں انہیں ذلیل ہونا ہی پڑتا ہے، میں اس بندے کے سامنے ہاری ہی کیوں؟) اس کے آنسو بے اختیار بہہ رہے تھے، بے بسی سے بہہ رہے تھے۔



اسی خود فریبی کی آڑ میں بھلا کب تک شب غم سے بھاگو گے دور موسیٰ کے طور تک وہ جو چھپ کے بیٹھا ہوا ہے دل کے کواڑ میں وہی دیکھنا کہیں نہ کہیں سے بجلی گرائے گا

وہ سیاہ رنگ کا پہاڑ ہے
وہ بولتا ہے جل بھی سکتا ہے بھاگ بھی
دل غم زدہ ذرا جاگ بھی
اسے جاگ جاگ کے جموتے ہوئے دیکھ بھی
بڑی احتیاط سے غور کر

اسے چھاؤں بننے سے روک دے
ابھی ٹوک دے

وہ پہاڑ ہے
کوئی بے قرار سا شجر نہیں
دل غم زدہ یہ بھی یاد رکھ
تیرے پر نہیں

ایک قیامت تھی تو ٹوٹی تھی، ایک طوفان تھا جو آیا تھا اور اپنی بربادی کے تمام اثرات چھوڑ کر رخصت ہو گیا، ایسا کھاؤ لگا تھا ذہن و روح پہ کہ مندر ہونے والا ہی نہ تھا، نقصان ایسا جس کی مٹائی ممکن نہ تھی، بربادی کے احساس نے ذہن و دل پر ایسے نقوش مرتب کئے کہ وہ حواس سلامت نہ رکھ سکی، وحشت و ہجیان کا ایسا غلبہ چھایا کہ وہ خود کو ختم کرنے پہ تل گئی، عمر اگر بروقت حرکت میں نہ آتا تو لازماً وہ اسی وحشت میں اپنی گردن پہ ہلینڈ پھیر دیتی۔

(باقی اگلے ماہ)

چہرے کو مزید ذوم کرتے ہوئے نوید نے بے ساختہ کہا تو شاہ ویر نے میسرہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا، دول کا گرم یلو شاکس سا اور کورٹ پہنے جنمو کے ساتھ لاگ شو، سر پہ یلو ہی پھولوں والی گرم دول کی ٹوپی پہنے وہ ”ساحرہ“ اپنے دونوں بازو پھیلائے آسمان سے گرتی برف کو اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ہتھیلیوں میں جمع کر رہی تھی، اس سے قدرے فاصلے پہ کھڑی دو تین لڑکیاں جو برف سے سنومین بنانے میں مصروف تھیں انہوں نے نیچے گری برف اکٹھی کر کے ایک گولہ سا بنا کر اس ساحرہ کی جانب اچھالا تھا، جو ابادہ ہستی ہوئی ان لڑکیوں کی طرف ہنسی تھی، لیکن چند قدموں کے بعد ہی اس کے پاؤں برف میں ڈھنس گئے تھے اور وہ لڑکھڑا کر گر گئی تھی، اس کے کرتے ہی وہ لڑکیاں ہسنے لگی تھیں وہ ساحرہ خود بھی ہنسیا کر ہنس رہی تھی۔

شاہ ویر اپنے دوستوں کے ساتھ ہیوی بانکس پہ تادرن ایر پاز سیر و تفریح کے لئے آیا ہوا تھا، مری..... نتھیا گلی اور گردو نواح کا علاقہ سفید برف سے نظارہ کرنے، مری، نتھیا گلی پہنچ چکے تھے۔

شاہ ویر اپنے دوستوں کے ساتھ Snow falling انجوائے کرنے کے لئے نتھیا گلی کے Elites Hotel میں قیام پذیر تھے، سٹوفا لیک شروع ہوتے ہی وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ ہوکل سے باہر نکل آیا تھا، لوگوں کا رش بڑھ رہا تھا، شاہ ویر کا دوست کیمبرہ ہاتھ میں لئے گردو پیش کے حسین مناظر کیمبرے کی آنکھ میں محفوظ کر رہا تھا کہ اچانک ان مناظر کو شوٹ کرتے ہوئے نوید نے بے ساختہ کہا تھا۔

”واٹ آ بیوٹی بار، قسم سے آفت ہے قیامت ہے۔“ اس کے کیمبرے کی زد میں آئے

مکمل ناول



فرح سرور ولسی

دُشمنِ بلال



”واٹ نان سینس؟“ اس نے غصے میں اسے کھاجانے والی نگاہوں سے دیکھا۔
 ”آئی ایم سوری۔“ وہ جلدی میں ہٹلایا تھا۔

”خوبصورت لڑکیوں سے جان بوجھ کر ٹکرانے کے یہ گھٹیا طریقے ناب خاصے پرانے ہو چکے ہیں۔“ خنکسنگنگا ہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا گیا تھا جو اب ایک دمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ٹھہر گئی تھی، یعنی اسے اپنی خوبصورتی کا بخوبی اندازہ تھا۔
 ”آپ ہی بتا دیجئے کچھ نئے طریقے؟“
 ”جسٹ شٹ اپ۔“ وہ غصے میں دھاڑ کر آگے بڑھی۔

”ارے آپ تو برا ہی منا گئیں، رکیے تو۔“ وہ اس کے پیچھے آیا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“
 ”مجھ سے دوستی کر لیں۔“ سینے پہ بازو لپیٹتے ہوئے شاہ ویر نے اسے آفر کی۔
 ”آپ جیسے لوگوں کی میں شغل دیکھنا پسند نہیں کروں، دوستی تو دور کی بات ہے۔“ وہ اسے خنکسنگنگا ہوں سے گھورتی آگے بڑھی۔
 ”پچھتاؤں گی آپ۔“ عقب سے شاہ ویر نے آواز لگائی، تو وہ رک گئی۔

”دھمکی دے رہے ہو مجھے؟“
 ”نہیں..... آپ کی قسمت پہ افسوس ہوا، مجھ جیسے ڈسٹنگ اور دولت مند شخص کو رنجش کر کے نقصان اٹھائیں گی۔“ شاہ ویر نے لفظ دولت مند پہ زور دیا، جیسے وہ عموماً لڑکیوں کو پٹانے کے لئے کیا کرتا تھا۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں تم پہ اور تمہاری دولت پہ، مجھے عام لڑکیوں سے کمپیئر کر کے دولت سے متاثر نہیں کر سکتے، سمجھے تم؟“ وہ اسے

برف پہ گرتے ہی اس کی گرم ٹوپی اتر گئی تھی اور اس کے گم کو چھوتے براؤن ریشمی بال اس کے شانوں پہ بکھر گئے تھے، دفعتاً ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا جسے تمام کردہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”یار اب ادھر لاناں، آنکھوں کے ذریعے دل میں اتارے گا کیا؟“ نوید نے ہنستے ہوئے کیمروہ اس کے ہاتھ سے لیتا چاہا۔
 ”جو دل میں خود اتر جائے، اسے کوشش سے کیا اتارنا؟“ اس کے لبوں پہ ایک خوبصورت مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”لو جی یہ تو کیا اب کام سے۔“ حارث نے سر وادھ بھری۔

”یار پتہ کروا یہ کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟“ شاہ ویر نے حارث کو مخاطب کیا۔

”مجھے تو لگتا ہے کسی کانٹنٹ ٹریپ کے ساتھ آئی ہے۔“ نوید نے قیاس کیا۔

”میری جان تو ٹیمپشن کیوں لیتا ہے کروا لیں گے پتہ۔“ حارث نے اس کا شانہ تھپکایا تھا۔

دوسری بار شاہ ویر نے اسے رات گئے Elites ہوٹل کی لابی میں دیکھا تھا، وہ اپنی دوست کے ساتھ کاؤنٹر پہ شاید کوئی

Complain کرنے آئی تھی، وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے ہی دھیان میں ہوٹل داخل ہوا تو اسے کاؤنٹر پہ کھڑا دیکھ کر حیرت و خوشی سے ٹھٹک گیا۔

”واہ اسے کہتے ہیں حسین اتفاق۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

اگلی صبح شاہ ویر کے روم کا اسٹرکام ٹھیک نہیں تھا وہ کافی کا آڈر دینے کے لئے اپنے ہی دھیان میں لفٹ میں داخل ہوتے لفٹ سے باہر نکلتی اس سارہ سے ٹکرایا تھا۔

ساحرہ سے ٹکرایا تھا۔

”تیرا دماغ خراب ہے، دوستی کے نام پہ
بھڑک اٹھی تھی وہ..... فون نمبر مانگ لیتا تو سر
پھاڑ دیتی وہ میرا۔“ شاہ ویر نے مسکراتے ہوئے
بتایا، اس کی نگاہوں میں اس سارہ کا چہرہ گھوم گیا
تھا۔

”سچ کہتے ہیں دل سے دل کو راہ ہوتی ہے،
اصرہ دیکھو۔“ نوید نے مسکراتے ہوئے سامنے کی
جانب اشارہ کیا تھا، حارث اور شاہ ویر نے حیرت
سے دیکھا تو وہ اٹھ دس لڑکیوں کے گروپ میں
بلوچنر پہ بے نی پٹک ہای ٹیک جرسی پہنے سامنے
چیز پہ بیٹھ رہی تھی۔

شاہ ویر پہ نظر پڑتے ہی ایک غصیلی نگاہ
ڈالتے ہوئے اس نے نشست بدل لی تھی۔
”یہاں تیری دال نہیں گلے کی شاہ ویر۔“
نوید نے اس لڑکی کا ایٹنی ٹیوڈ دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ہمت ہارنے والوں میں نہیں ہوں،
میرے پار، اپنی محبت میں جتنا نہ کیا تو میرا نام بھی
شاہ ویر نہیں۔“ شاہ ویر نے دعوے سے کہا۔
”دیکھتے ہیں پھر، اس انٹرٹیننگ لواسٹوری
کا انجام۔“ حارث مسکرایا۔

اگلے دن ناشتے کے بعد وہ تینوں بیوی
پائیکس پہ کشمیر پوائنٹ آئے تھے، اونچے اونچے
چیز کے درختوں پہ سفید جی ہوئی برف خوبصورت
نظارہ دے رہی تھی ایسا لگ رہا تھا وہ کسی خوابوں
کے منظر جالکے ہوں، کشمیر پوائنٹ کی طویل سڑک
اور گرد و نواح کے علاقے کو دھند نے اپنی لپیٹ
میں لے رکھا تھا، لوگ بڑی تعداد میں اس حسین
موسم کو انجوائے کر رہے تھے، جگہ جگہ مقامی
باشندے گھوڑے لئے کھڑے تھے سیاح ان
گھوڑوں پہ بیٹھ کر تصاویر بنوا رہے تھے۔

اچانک اس خوبناک ماحول میں ایک
نسوانی چیخ کی آواز نے وہاں موجود تمام لوگوں کو

ڈپٹ کر اپنے روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔
اسی دن شام کو مری کے مال روڈ پہ ٹھنڈ کو
بھگانے کے لئے وہ ایک مشہور کافی شاپ میں
کافی پی رہے تھے۔
”ویسے شاہ ویر تیرے ساتھ ہوئی بہت بری
ہے۔“ حارث نے مذاق اڑایا۔
”کچھ اس نہ کر۔“ وہ کافی پیتے ہوئے

مسکرایا۔
”ویسے آج تک تجھ پہ کسی لڑکی نے لعنت
نہیں بھیجی۔“ نوید نے شرارت سے اسے چھیڑا۔
”تھوڑی ٹیڑھی ہے وقت لگے گا اسے
پٹانے میں۔“ شاہ ویر نے گویا خود کو تسلی دی۔
”یہاں تیری دال کتنی نظر نہیں آئی مجھے۔“
نوید نے رائے دی۔

”شاہ ویر کے لئے کوئی بھی کام ناممکن نہیں
ہے میری جان۔“ شاہ ویر نے دعویٰ اور یقین
سے کہا۔
”دیکھتے ہیں پھر۔“ حارث مسکرایا۔

”تو نے کاؤنٹر سے پتہ کیا ان لوگوں کا
ٹریپ کتنے دن اور کے گا یہاں؟“ شاہ ویر نے
نوید سے پوچھا۔

”دو دن اور ہیں گے۔“
”ویسے آئے کس شہر سے ہیں؟“
”اپنے ہی شہر سے۔“ نوید نے بتایا۔
”دیر کی گڈ یعنی لاہور سے۔“ شاہ ویر
مسکرایا۔

”کالج کا نام کیا ہے؟“ اس نے کافی کا
مگ نمیل رہ رکھا۔
”گوئین میری۔“ نوید نے کالج کا نام
بتایا۔

”یہ فون نمبر ہی مانگ لیتا؟“ حارث نے
یاد دلایا۔

متوجہ کیا تھا، وہ تینوں جواب پیدل چل رہے تھے، انہوں نے بھی آواز کی سمت دیکھا۔

سڑک پہ سر پیٹ دوڑتا ہوا گھوڑا اور گھوڑے پہ بیٹھی لڑکی چیخ رہی تھی لوگ خوف سے سڑک سے ادھر ادھر ہو رہے تھے لیکن گھوڑے کی ٹکیل پکڑنے کی ہمت کسی نہ نہ کی تھی، گھوڑے کے پیچھے اس کا مالک بھی سر پیٹ دوڑ رہا تھا اور اس شخص کے پیچھے آٹھ دس لڑکیاں ہانپتی کا ہنپی ہوئی بھاگ رہی تھیں۔

”ہیلپ..... ہیلپ۔“ گھوڑے پہ بیٹھی لڑکی چیخ رہی تھی، شاہ دیر کی نظریں اپنے قریب آتے گھوڑے پہ مرکوز تھیں، وہ ساحرہ اس گھوڑے پہ بیٹھی چیخ رہی تھی اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور پھر اگلے ہی لمحے شاہ دیر نے نہایت پھرتی سے دوڑ کر گھوڑے کی ٹکیل پکڑ لی تھی اب وہ تقریباً گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہا تھا، وہ جب اپنی سن میں تھا تو بہترین گھوڑ سوار رہا تھا، سو چند ہی لمحوں کے بعد وہ ٹکیل کھینچ کر سر پیٹ دوڑتے گھوڑے پہ قابو پا چکا تھا، اس ساحرہ کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور وہ سخت خوفزدہ تھی، شاہ دیر نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تھا، جسے نا چاہتے ہوئے بھی تمام کردہ نیچے اتر آئی تھی، گھوڑے کا مالک اور اس کی درجن بھر سہیلیاں بھی ان تک پہنچ چکی تھیں۔

”ٹھیکس۔“ نا چاہتے ہوئے بھی دھیرے سے اسے شکریہ کہنا پڑا، اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”پلیز ریلیکس۔“ شاہ دیر نے اسے تسلی دی تھی اور وہ اپنی فرینڈز کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ رات تینوں شاہ دیر کے کمرے میں موجود تھے۔

”واہ بار کمال کر دیا تو نے، کسی فلمی ہیرو کی طرح اس سنسنی خیز سین میں اٹری مار کر حیران کر دیا سب کو۔“ نوید نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پہ دھپ رسید کی، تو شاہ دیر بھی مسکرا دیا۔

”تو نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، میں کسی ہیرو سے کم ہوں۔“ اس نے کار جھاڑے۔

”لالے اب تو تیری اس سے دوستی کیا۔“ حارث نے دعوے سے کہا۔

”دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟“

”واپسی کب ہے ان لوگوں کی؟“ شاہ دیر نے پوچھا۔

”کل شام۔“ نوید نے اطلاع دی۔

”تیار کر لیتا تم دونوں بھی۔“

”کیا مطلب؟“ حارث اور نوید نے حیرت سے شاہ دیر کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ..... ہم ان کے ساتھ جائیں گے۔“ اس نے اطمینان سے بتایا۔

”مگر ہمیں تو کل نار ان جانا تھا؟“ حارث نے یاد دلایا۔

”پھر کبھی جائیں گے، یہ مسئلہ زیادہ اہم ہے۔“ شاہ دیر بیڈ پہ چت لیٹے ہوئے بولا۔

”مسئلہ؟“ حارث ہنسا۔

”ہاں جب تک مجھ سے دوستی نہیں کرتی، میں اسے پٹانہ لوں، یہ لڑکی ایک ایٹو ہے میرے لئے، مسئلہ ہے میری ذات کے لئے۔“

”ہاں بھئی ایسا ہو سکتا ہے بھلا، تو کسی لڑکی کو دوستی کی آفر کرے اور وہ ٹھکرا دے۔“ نوید نے کشن اٹھا کر سر کے نیچے رکھا اور وہ بھی شاہ دیر کے بیڈ پہ آڑھ ہاتھ چھالٹ گیا۔

”کچھ خاص ہے اس لڑکی میں، دل کھینچتا

رہی ہو کہ۔“ انوش نے نمل کو گھورا، اس کی سرگوشی پہ شاہ ویر بیچ دتا ب کھا کر رہ گیا۔

”تم سے اتنا ہنڈسم لڑکا اگر مجھے کہتا تو میں تو فوراً اس کے ساتھ چلی جاتی۔“ طائید بھی انوش کے قریب آئی۔

”ہاں تمہاری تو کیا ہی بات ہے۔“ انوش نے طر کیا۔

”یار کیا ہے اتنا ایٹی ٹیڈ کیوں دیکھا رہی ہو، کل اسی شخص نے تمہاری جان بچائی تھی، اگر وہ سر پٹ دوڑتا ہوا گھوڑا تمہیں کسی لکائی میں جا گراتا تو؟“ نمل نے اسے یاد دلایا تو وہ نا چاہتے ہوئے بھی ایک سائیڈ پر چل دی۔

”جلدی بتائیے کیا کہتا ہے آپ کو مجھ سے؟“ اس کے انداز میں بے زاری تھی۔

”میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“ سینے پہ بازو لپیٹتے ہوئے اطمینان سے خواہش ظاہر کی گئی۔

”اور میں لعنت بھیجتی ہوں آپ کی دوستی پہ، اس دن بتا چکی تھی میں آپ کو۔“

”آپ خود کو بہت اعلیٰ و ارفع سمجھتی ہیں شاید، مجھے کھلے کا ایک عام سالوئڈ امت سمجھئے گا، میرا نام شاہ ویر ہے، میں جس باپ کا بیٹا ہوں اسے پورا شہر جانتا ہے، لاکھوں اور کروڑوں میں کھیلنا معمولی بات ہے میرے لئے۔“ اب کے شاہ ویر نے اسے اپنی دولت سے مرغوب کرنا چاہا۔

”دیکھو میں نہیں جانتی تم کون ہو، کس کے بیٹے ہو اور مجھے جاننے کی کوئی خواہش بھی نہیں اور رہی بات دولت کی تو مجھے ان چیزوں سے متاثر کرنے کی کوشش بھی مت کرنا، میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو دولت کے لالچ میں تم جیسے آوارہ اور بد معاشوں کے ہاتھوں اپنا سب کچھ لٹا

ہے اس کی جانب۔“ وہ چھت کو گھورتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

”اور اللہ کی رضا دیکھ، بار بار تجھ سے سامنا ہو رہا ہے اس لڑکی کا۔“ حارث نے موبائل سے نظریں ہٹا کر شاہ ویر سے کہا۔

”کچھ بھی ہو..... ٹھاکر..... تجھے اپنا استاد تب مانو گا جب اسے گرل فرینڈ بنا کر چھوڑے گا۔“ نوید نے اسے چیلنج کیا تو وہ جو بستر پہ لیٹا ہوا تھا اٹھ بیٹھا۔

”مجھے چیلنج مت کر، تو اچھی طرح سے جانتا ہے میرے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں یقین تھا۔

”چل دیکھتے ہیں پھر۔“ نوید نے اس کے کندھے پہ دھپ رسید کی مٹی اٹکلے دن انہوں نے اسے St. Melhew shurch کی حسین عمارت کے باہر درجن بھر لڑکیوں کے جمرٹ میں دیکھا تھا وہ سب کی سب تصویریں بنوا رہی تھیں کچھ سلیٹی لے رہی تھیں، شاہ ویر بلا جھجک ان کے پاس جا کر اس لڑکی سے مخاطب ہوا تھا۔

Can i talk to you”
-alone?

جواباً اس نے کہا۔
You can talk to me”
-here اس لڑکی کا جواب سن کر شاہ ویر کی بھنوں سکو گئیں تھیں۔

”انوش چلی جاؤ ناں، یہ کون سا تمہیں پر پوز کرنے والا ہے۔“ نمل نے اسے ٹھوکا مارا۔
”انوش!“ وہ زیر لب مسکرایا۔

(کیا خوبصورت نام ہے موصوفہ کا) اس نے دل میں سوچا۔
”شکل سے ہی پورا لو فر لگتا ہے اور تم کہہ

”او پہلو محترمہ! مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے آپ جیسی خوشدست لڑکی کو محض چند دن کے لئے ہی سبکی اپنے نکاح میں لانے کا۔“ وہ بھی انزک آفاق تھا غصہ اس کی ناک پہ دھرا رہتا۔

”پلیز مسٹر انزک..... آپ بیٹھے تو سبکی، کیوں خواہ خواہ جذباتی ہو رہے ہیں۔“ می می نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا تھا۔

”مس مریم، میں ان محترمہ کا ملازم نہیں ہوں، یہ بلاوجہ مجھ پہ چلائیں گی اور میں ستار ہوں گا، ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی ان کے غلط اور ٹھیک کی وجہ سے مجھے اور میرے بائیک کو اچھا خاصا نقصان پہنچا ہے اور یہ۔“

”تو مسز وہ بھی تمہاری غلطی تھی۔“ پری نے تریخ کر جواب دیا تھا۔

”آپ کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا؟“

”جب میری غلطی تھی ہی نہیں تو احساس کیسا؟“

”گاڈ سیک، خاموش ہو جائیے آپ دونوں۔“ می می نے انہیں ٹوکا۔

”ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچئے، آپ دونوں ہی اس وقت ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔“ مریم نے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا۔

”کم از کم مجھے اس بدتمیز شخص کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔“ پری کے دو ٹوک انداز پہ انزک پہلو بدل کر رہ گیا تھا، اسے واقعی اس وقت ردیوں کی ضرورت تھی۔

”بری پلیز۔“ می می نے سرزنش کی تو وہ بھی خاموش ہو گئی۔

”کیا تم اس وقت سیر کو یہاں لا سکتی ہو؟ تاکہ انزک سے اسے ملو کر تمام معاملات طے کر

دیتی ہیں۔“ غصے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا، وہ چند لمحے اس مشکل لڑکی کو دیکھتا رہا۔

”دوستی نہ سہی شادی تو کرو گی نا؟“ اس کی آفر پہ انوش نے از حد حیرت سے اسے دیکھا۔

”شادی اور تم جیسے لوڑ کر یکٹر شخص سے؟ امپاسیبل۔“

”دوستی تم نہیں کرنا چاہتی، شادی تے تم نے منع کر دیا، جائز ناجائز دونوں آفرز کو ریجیکٹ کر دیا، اب بتاؤ کیا کروں؟“ اسے سامنے کھڑی اس خوبصورت لڑکی پہ غصہ آ رہا تھا، جو نا جانے خود کو آسمان کی حور سمجھ رہی تھی۔

”تم صرف ایک کام کرو، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔

”اور اگر نہ جاؤ تو؟“

”تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ انوش نے قدم آگے بڑھائے اور اپنے گروپ کی طرف جانا چاہا، لیکن شاہ ویر نے اسے ٹکائی سے تھام لیا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ چھوڑو میرا بازو۔“ وہ غصے میں غرائی۔

”یہ بازو اقرار سن کر ہی چھوٹے گا۔“

”تم چھوڑتے ہو یا.....“

”یا.....؟“ شاہ ویر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، اگلے ہی لمحے انوش نے دوسرا ہاتھ بھیج کر اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔

تپشور کی آواز پہ سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے، شاہ ویر کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی انوش تیز تیز قدم اٹھائی اپنے گروپ کی جانب بڑھ گئی تھی۔

”ہو گئی عزت افزائی؟“ نوید نے مسکراتے ہوئے کم صم سے شاہ ویر کے کندھے پہ بازو رکھا، ساٹ چہرہ لئے وہ کچھ بول ہی نہیں پایا تھا، اس کے اندر غصے کا آتش فشاں بڑھک رہا تھا۔

”اور جب اولاد باقی ہو جائے تا فرمائی پہ
اتر آئے تو مجبوراً ایسا قدم اٹھانا پڑتا ہے۔“ عارفہ
بیکم سیلوئس ساڑھی میں ملبوس صوفے سے اٹھ کر
اس کے مقابل آکھڑی ہوئی تھیں۔

”مام میں کوئی بیٹھ بکری نہیں ہوں، جسے
آپ جدمرچا ہیں گی تاکہ دیں گی کسی بھی کھونٹے
سے باندھ دیں گی، جیسے آپ کا فیصلہ کسی صورت
قبول نہ ہوگا۔“ وہ بھی حتی انداز میں بولی۔

”غلطی کی معافی صرف ایک پارلٹی سے
لیکن جب غلطیوں کی عادت پڑنے لگے تو ممد
نہیں ملا کرتی۔“

”اس بار تم نے میری مرضی کے خلاف
فیصلہ سنایا، تو یاد رکھنا ہمیشہ کے لئے میں تمہیں اپنی
جائیداد سے عاق کر دوں گی اور کسی قسم کا کوئی
تعلق واسطہ نہیں رکھوں گی۔“ عارفہ بیکم اپنا فیصلہ
سنا کر کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں اور وہ وہیں
کھڑی مئی حیرت کا بت بنی۔

☆☆☆

لڑکیو!

محبت کے خواب دیکھتی کیوں ہو؟

تم کو کیا معلوم نہیں

خواب دیکھنے والی

جو بھی آنکھ ہوتی ہے

وہ اداس رہتی ہے

وہ زراش رہتی ہے

آنکھ کے درتے میں

جو چراغ رکھتے ہیں

بدگمان راتوں کا ڈانٹتے وہ جھکتے ہیں

ان کے دل کی راتیں بھی

بے نشان رہتی ہیں

بے امان رہتی ہیں

ان کے کمرے کے دروازے

لیئے جائیں؟“ مئی نے اس سے پوچھا تو وہ تھمر
آلود نگاہوں سے انزک کو دیکھتے ہوئے اپنا
موبائل اٹھانے لگی۔
”بلائی ہوں سمیر کو۔“

اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد سمیر بھی وہاں پہنچ
گیا تھا، سمیر نے انزک کے ساتھ ڈیل طے کر لی
تھی، انزک پانچ لاکھ کے عوض چند دن کے لئے
پری سے نکاح پر راضی ہو گیا تھا۔

پریشے جب گھر آئی تو عارفہ بیکم لاؤنج میں
اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

”کہاں تھیں تم؟“ پری کو دیکھتے ہی انہوں
نے سوال داغ دیا تھا۔

”مئی کے ساتھ کافی بیٹے مئی تھی۔“ وہ
مختصر جواب دے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

”میں نے سنا ہے تمہارا باپ آیا تھا؟“
عقب سے ایک اور سوال کیا گیا۔

”جی آئے تھے۔“
”اجاز کے لئے فورس کر رہا ہو گا وہ
تمہیں۔“

”جی۔“
”تو کیا جواب دیا تم نے اسے؟“
”وہی جو آپ کو دیا تھا۔“

”اچھا کیا تم نے اجاز کے لئے انکار کر
دیا۔“

”میں نے کوئی کے لئے بھی انکار ہی کیا
ہے۔“

”مجھے تمہارے انکار سے ایک رتی بھی
دلچسپی نہیں ہے کیونکہ میں نے تمہارا نکاح کوئی
سے طے کر دیا ہے اسی ہفتے۔“ ان کے لفظوں نے

پری کو درط حیرت میں ڈال دیا تھا۔
”مام یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، میرے انکار
کے باوجود آپ نے میرا نکاح طے کر دیا؟“

”مام یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، میرے انکار
کے باوجود آپ نے میرا نکاح طے کر دیا؟“

”مام یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، میرے انکار
کے باوجود آپ نے میرا نکاح طے کر دیا؟“

دشمنوں سے انجانے
اور سامتوں کی گلیوں میں
آشنائی آہٹ سے
انجبی سی رہتی ہیں
ان کے سارے جیون میں
نفسی سی رہتی ہے
بے کلمی سی رہتی ہے
اک کلمی سی رہتی ہے

لڑکیو! محبت کے خواب دیکھتی کیوں ہو؟

پری کو لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بچی دھوپ کے
صحرا میں کھڑی ہو، سمیر نے محبتوں کے بہت سے
نئے پیغام اسے دیئے تھے کئی تسلیاں اس کے
کانوں میں اٹھیلیں تھیں اس کے باوجود اک نا
معلوم سی اداسی اور دکھ نے اس کے دل میں بسیرا
کر رکھا تھا، سمیر نے انزک آفاق سے تمام
معاملات طے کر لئے تھے، تین لاکھ اسے
ایڈوانس کے طور پر دیئے تھے اور باقی کے دو لاکھ
طلاق کے بعد دیئے جانے تھے، آج پری کو یہ مگر
ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا تھا وہ مگر جو بھی اس
کے لئے ایک گھر نہ بن سکا تھا وہ مگر..... جس کی
ایک ایک اینٹ پہ دشتوں کا راج تھا، وہ مگر جو
اس کے لئے صرف اپنوں سے بنے ایک مکان کی
طرح تھا، اپنا گھر بسانے کے لئے اسے اس گھر کو
ایک سنسکی دکھ اور تکلیف کے سپرد کرنا تھا۔

اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں پکڑے اس نے
ایک الوداعی نگاہ اپنے کمرے پہ ڈالی اور باہر نکل
آئی، سمیر کی گاڑی کا دوسری بار ہارن سنائی دیا تھا،
اداس شام جیسے وجود کو کھینچتی اپنے پلو سے سوگ
باندھے وہ لاؤنج میں آئی، عارفہ بیگم صوفے پہ
ایستادہ تھیں، وہ جلد از جلد بے حسی کی اینٹوں سے
بنے اس مکان سے نکل جانا چاہتی تھی جس کے
اندھروں نے بھی اس کے دل کو روشنی نہ بخشی

تھی۔

”خدا تم جیسی نافرمان بیٹی کسی کو نہ دے۔“
عارفہ بیگم کے بنجلے پہ اس نے دھواں ہوتے
چہرے سے ماں کو دیکھا تھا۔

”سمیر کا گھر تمہارے لئے اب آخری قبر
ہے پری تم آج اس گھر سے زندہ نہیں مردہ وجود
کے ساتھ جا رہی ہو، کبھی پلٹ کر نہ دیکھنا، نہ میری
طرف نہ اس گھر کی طرف، مرنے کی آج تم میرے
لئے۔“ وہ غصے اور خضرے بولتی اپنی نشست سے
اٹھیں تھیں۔

”میں زندہ تھی ہی کب مام؟ آپ کی بے
حسی اور خود پسندی نے مجھے زندہ رہنے ہی کب
دیا ہے؟ میں اپنا گھر بنانے اور بچانے کے لئے وہ
سب کچھ کروں گی جو آپ نے کبھی نہیں کیا۔“
”جاتی ہیں کیوں؟“

”تا کہ ایک اور پری جنم نہ لے، وہ مجھ سے
دیے ہی شاکی نہ رہے میں آج تک آپ سے
رہی، اپنی مرضی سے اپنا جیسے گھر بسانے کی کوشش
کرنا نافرمانی کا دوسرا نام ہے تو مجھے آپ کا یہ
لقب بھی منظور ہے۔“ وہ نہایت دکھ سے بول رہی
تھی۔

”انہوں مگر..... دیکھوں گی کیسے بساتی
ہو۔“ وہ غصے سے بولیں تھیں۔

”آپ مجھے بددعا دے رہی ہیں؟“ اس
نے دھندلائی آنکھوں سے عارفہ بیگم کو دیکھا۔
”بددعا غفلتوں کی محتاج نہیں ہوتی پری، جلد
اندازہ ہو جائے گا تمہیں۔“ وہ اپنے کمرے کی
جانب پلٹیں۔

”آپ سے معافی کی امید ہرگز نہیں ہے
مجھے، لیکن پھر بھی..... جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو
کوشش کیجئے گا مجھے معاف کرنے کی۔“ بولتے
بولتے پری کی آنکھوں کے گوشے ہجک گئے تھے

اور وہ اپنا سوٹ کیس لئے باہر نکل گئی تھی۔

سمیر گاڑی میں اس کا منظر بیٹھا تھا، سمیر کی والدہ سارہ بیگم آج کل انگلینڈ میں اپنے بھائی کے پاس گئی ہوئی تھیں، سو سمیر اسے اپنے گھر لے کر جا رہا تھا، پری اور انزک کے نکاح کا بندوبست سمیر نے اپنے گھر ہی کر رکھا تھا۔

☆☆☆

میں گرہ میں باندھ کر حادثات

نکل پڑی تیری کھوج میں

جہاں سانس لینا محال تھا

پری کی گویا جان بکھل رہی تھی وہ اس گھر میں

سمیر کی دلہن بن کر آئی تھی اور آج وہ اسی گھر میں

سمیر کے سامنے کسی اور کی دلہن بنی ہوئی تھی، اس

کا دل کٹ رہا تھا، سادہ سے شلوار قمیض میں ملبوس

سر پہ دوپٹہ لئے آنکھوں میں ٹوٹے سننے، لبوں پہ

کچھ مرجھائی ہوئی خواہشیں لئے وہ کسی خوفزدہ

بچے کی طرح سہم کر بیٹھی ہوئی تھی، سمیر نے اپنے

دو چار دوستوں کو بھی مدعو کر رکھا تھا، گواہ کے طور

پہ۔

مولوی صاحب نے نکاح پڑھانا شروع کر

دیا تھا، آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر جھکے سے اس کے گال

بھگور رہے تھے، می می نے آنسو پھینکیں سے اس کا ہاتھ

تھام کر دبایا تھا، ماہ رخ بھی اس کے پاس بیٹھی

تھی۔

نکاح نامے پہ سائن کرتے ہوئے چند لمحوں

کے لئے اس کے ہاتھ کانپے تھے اور اس نے میکی

آنکھوں سے سمیر کو دیکھا تھا، اس کی آنکھوں میں

چھپے ہوئے شکوے دیکھ کر سمیر نظریں چرا گیا تھا۔

وہ اسے طلاق نہ دیتا تو وہ نوبت یہاں تک

نہ آتی، اس سارے منظر میں ایک اور شخص بھی

موجود تھا، جو شاید خود سے بھی کترا رہا تھا، شرمندہ

ہور ہا تھا اور وہ تھا انزک آفاق، اپنی بہن کی رخصتی

کے لئے اس کی خوشیوں کی خاطر اس نے مجبوراً یہ قدم اٹھایا تھا اور مجبوریاں بھی کبھی بہت مجبور کر دیا کرتی ہیں، وقت اپنے ظالم چابک سے بھی کبھی ایک جائز خواہش نا جائز طریقے سے بھی پوری کر دالیتا ہے اس نے بھی یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی اپنی جیسی کی انتہا کرتے ہوئے اسے اس مقام پہ لے آئے گی، کہ اسے اپنا آپ پہنچنا پڑ جائے گا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد، پری اور انزک

نکاح کے بندھن میں بندھ گئے تھے، پری نے

جس طرح شکوہ کنہا نظروں سے سمیر کو دیکھا تھا،

وہ شرمندگی سے سر جھکا گیا تھا، اسے سمیر کے

چہرے پہ اپنی خوشیوں کا نکل نظر آ رہا تھا، ایک ایک

کر کے اس کے سارے دوست رخصت ہو رہے

تھے۔

”پری پلیز چیز اپ میری جان! اب سب

کچھ ٹھیک ہو جائے گا، صبح انزک..... طلاق دے،

دے گا تمہیں، میں نے پیپر تیار کر دئے ہیں۔“

سمیر اس کے ساتھ بیٹھا اسے سلی دے رہا تھا، جواباً

وہ کچھ بھی کہہ نہیں پاتی تھی۔

”اوکے سمیر اب مجھے اجازت دیجئے۔“ اس

سارے تماشے میں تماشہ بنا انزک آفاق اپنی

نشست سے اٹھا۔

اس کے دل پہ ایک بوجھ سا اُڑا تھا، وہ جلد

از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو، کل میں تمہیں خود

کال کر لوں گا۔“ سمیر نے اٹھ کر اس سے ہاتھ

ملایا تھا، انزک نے اثبات میں سر ہلا کر قدم باہر

کی جانب بڑھائے، دفعتاً سمیر کے موبائل کی

رنگ ٹون بجی۔

”سمیر اسپیکنگ۔“ سمیر نے کال پک کی

تھی۔

اس نے صرف اور صرف سیر کے سہارے پہ اٹھایا تھا، پری نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تھے لیکن سیر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تھا۔

”پری پلیز، اس وقت کچھ مت کہنا، مجھے مت..... روکنا، مجھے اگلینڈ جانا ہوگا۔“

☆☆☆

ذوریز آفندی ہاتھوں میں فلاور باسکٹ پکڑے، خوبصورت، روشنیوں میں نہائے لان میں داخل ہوئے، جہاں رکھا خوبصورت ساڑھی میں ملیں میت اگر وال کے ساتھ کھڑی آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

اس کے لیوں پہ ایک چمکی سی زندگی اور خوشیوں سے بہت دور ایک مصنوعی مسکراہٹ درج تھی جو صرف ذوریز ہی محسوس کر سکتے تھے جبکہ رکھا کے ساتھ کھڑے میت اگر وال کی آنکھوں میں دنیا کی سب سے قیمتی چیز پالینے کی خوشی چمک رہی تھی، اس کی مسکراہٹ میں اپنی محبت کو پالینے کی دلکشی تھی، اس کے لفظوں میں جان سے پیاری ہستی کو حاصل کر لینے کا مسرور تھا۔

”زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔“ فلاور باسکٹ رکھا کی جانب بڑھاتے ہوئے ذوریز آفندی نے اسے مبارک دی۔

”تمہاری خواہش کیسے پوری نہ کرتی؟“ اس کے لہجے میں کرب تھا۔

”میت اگر وال قریب ہی اپنے دوست اور اس کی بیوی سے خوفگتو تھا۔“

پیاری بھی تو عجب شے ہے ناں
اضطراب میں مضمر

انتشار سے آگے

اور اختیار سے باہر

دوسری طرف جانی پچپانی نہایت گہرائی ہوئی آواز نے اس کو پریشان کر دیا تھا۔

”کیا..... فلک یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ سیر کی اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی، اس کا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا تھا، وہ آج سے پہلے اتنا بے بس کبھی نہیں ہوا تھا۔

فلک (سیر کی ماموں زاد) نے اسے جو خبر سنائی تھی گویا سیر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی، پریشے، وہاں موجود تمام لوگ، حتیٰ کہ وہاں پورا منظر اس کی آنکھوں سے دھندلا تے ہوئے دور ہونے لگا تھا۔

دوسری جانب کال بند ہوئی تھی، لیکن سیر کی اڑی رنگت دیکھ کر پری بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا سیر..... سب ٹھیک تو ہے؟“ پری نے استفسار کیا تھا۔

جواب اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”نہیں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

Mama had a heart

attack and she is in serious condition۔“ بولتے بولتے سیر

کی آواز بھرا گئی تھی۔

”مجھے جانا ہوگا، ابھی اور اسی وقت۔“ اس

نے جیسے فیصلہ سنایا تھا، اس کے لئے اس وقت صرف اس کی ماں ابہم تھی وہ ماں جس نے اس کی خاطر بے پناہ قربانیاں دی تھیں، وہ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں جلا تھیں، سیر کو ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ سارہ بیگم کے بغیر فنا ہو جائے گا، مر جائے گا، اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا، وہ جلد از جلد اس منظر سے غائب ہو جانا چاہتا تھا، وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ پری اس کی خاطر واپسی کے تمام راستے بند کر آئی تھی، اتنا بڑا قدم

”اپنا شکر یہ اپنے پاس رکھو، کیونکہ اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں، تم سے شادی کا فیصلہ خود ریکھا کا اپنا فیصلہ تھا۔“ زوریز نے میت کا مان بڑھایا۔

”اللہ تم دونوں کی خوشیوں کو نظر بد سے بچائے۔“

”جھیک یو میرے دوست بھگوان سے دعا ہے وہ تمہیں لمبی عمر دے۔“ میت ہندو مذہب سے تھا، سو اس نے ہاتھ جوڑ کر انہیں دعا دی تھی۔

”مجھے اب اجازت دو۔“ انہوں نے ریکھا اور میت سے اجازت چاہی۔

”ارے اتنی جلدی؟“ میت حیران ہوا۔

”ابھی تو خوب ہلاک ہوا گا جشن ہوگا ابھی تو

پارٹی شروع ہوئی میرے دوست۔“ میت نے ریکھا کے کندھے پہ بازو پھیلاتے ہوئے زوریز سے کہا۔

”کیوں ریکھا جان؟ سچ کہہ رہا ہوں ناں؟“

You people enjoy the party, I, m not feeling well۔“ زوریز نے بہانہ بنایا تھا، یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔

Ok as you wish take

care of yourself۔“ میت نے ان سے ہاتھ ملانے کے لئے بازو آگے کیا اور وہ اس سے سلام لے کر گھر سے باہر نکل آئے تھے۔

انہیں اپنی پشت پر ریکھا کی ٹکڑیاں دیر تک محسوس ہوئیں انہوں نے طے کر لیا تھا وہ اب اس کا بہت کم سامنا کرنے والے تھے، ریکھا ان کی بہترین دوست تھی، ماضی کی اک اک یاد وہ ریکھا سے شیر کیا کرتے تھے ریکھا کی فیملی گزشتہ چالیس برس سے کینیڈا میں مقیم تھی، وہ ریکھا کے

دو بھائی اور دکھ سے مسکرائی۔

زوریز پہلو بدیل کر رہ گئے۔

”پرانی خواہشات دل کو چھیدنے لگیں تو انہیں دل سے کمرچ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔“ وہ دھیرے سے گویا ہوئے۔

”اور جو دل ہی کسی کی آرزو بن جائے، اس کا کیا، کیا جائے؟“ اپنی بڑی بڑی جمیل جیسی خوبصورت اور روشن آنکھوں کو ان پہ مرکوز کیے سوال کیا گیا۔

”تم آن ریکھا..... اس خوبصورت وقت کو اپنی پاگل خواہشات کی نذر مت کرو اور صرف میت کے بارے میں سوچو۔“ زوریز نے اسے ٹوکا تھا۔

”پاگل خواہشات۔“ وہ ہنسی۔

”بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔“ انہوں نے تعریف کی۔

”تمہارے دل میں نہ اتر سکی، کیا فائدہ ایسی خوبصورتی کا۔“ ریکھا کے لبوں پہ اک آہ تھی۔

”میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔“

”اتنی جلدی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”میں تمہاری خوشیوں میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔“

”کس کی خوشیوں میں حائل ہونے کی بات ہو رہی ہے؟“ عقب سے میت اگر وال نے زوریز کے کندھے پہ بازو پھیلایا، خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”کچھ نہیں بس، اک پرانا قصہ یاد آ گیا تھا۔“

”زوریز میں تمہارا بہت مشکور ہوں، تم نے میری وہ خواہش پوری کی ہے جواب اک حسرت بقی جا رہی تھی۔“ میت نے ان کا شکر ادا کیا۔

49

”ارے ماں کیسی باتیں کرتی ہیں آپ، آج کل مجھے بہن بھائی کسی کے کام نہیں آتے دوست پار کہاں کرتے ہیں یہ سب؟ خواہ خواہ میرا تعلق بھی خراب ہوگا۔“

”ہاں کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہو، مشکل وقت میں اپنے کام نہیں آتے غیروں سے کیا امید لگائی، بہر حال اللہ کرے تمہیں جلد از جلد کوئی اچھی سی نوکری مل جائے، کوئل کی طرف سے میں بہت پریشان رہتی ہوں، اس کے سرال والے دو سال سے شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں اور میں کوئل کی پڑھائی کا بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیتی ہوں، لیکن سچ پوچھو تو ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ ہماری ٹال مٹو سے کوئل کا رشتہ نہ ٹوٹ جائے، آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں؟“ صابرہ بیگم کے لہجے میں خوف تھا۔

”ماں آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ اللہ نہ کرے کوئل کے رشتے پہ کوئی آج آئے، آپ اللہ سے صرف اچھے کی امید رکھیے، میں جس دوست سے ملنے جا رہا ہوں میں نے اس سے کچھ رقم ادھار مانگی ہے کوئل کی شادی کے لئے، آپ ٹینشن نہ لیں۔“ انزک نے انہیں تسلی دی۔

”میں نے بھی کچھ پرائز بانڈ لے رکھے ہیں، کیا معلوم اس بار قسمت کھل جائے۔“ صابرہ بیگم نے امید آس سے کہا۔

”ماں پرائز بانڈ تو آپ رہنے ہی دیں، ہم جیسے بد نصیبوں کے تو پرائز بانڈ بھی نہیں نکلتے۔“

”ایسے نہیں کہتے انزک، اللہ کا حکم ہو تو چند لمحوں میں انسان کی تقدیر بدل کر رکھ دیتا ہے، یاد نہیں دس سال پہلے ماسی برکت کی بیٹی کا ایک کروڑ کا پرائز بانڈ نکلا تھا، کیسے دن بھرے تھے ان کے؟“ صابرہ نے بچے کو یاد دلایا تو وہ مسکرا دیا۔

”جی یاد ہے مجھے اور آپ تب سے ہی ہر

بزنس پارٹنر بھی تھے دونوں کا آدھا دن ایک ساتھ ایک ہی آفس میں گزرتا تھا، پھر نا جانے یہ دوستی ریکھا کے لئے کب پسندیدگی اور پھر محبت میں بدل گئی تھی؟

ذوریہ آفندی نے کبھی بھی ریکھا کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی اس کے باوجود وہ محبت کی منازل طے کرتی چلی گئی تھی۔

آج میت اگر وال کے ساتھ اسے زندگی کی نئی خوشبو کے حوالے کرتے ہوئے وہ مطمئن ہو گئے تھے، مگر آتے آتے اک بہت بڑا بوجھ ان کے سینے سے ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

خلاف توقع انزک آج جلدی اٹھ گیا تھا وہ ساری رات سو نہیں پایا تھا، احساس ندامت نے اسے سونے نہیں دیا تھا، آج اسے تین لاکھ روپے کا چیک ملنا تھا وہ جینز شرٹ میں لمبوس آئیپنے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا اور شرمندگی سے خود سے نظریں تک نہیں ملا رہا تھا، حالانکہ آج اسے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن دل بوہمل ہو رہا تھا، دفعتاً صابرہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔

”انزک بیٹا تمہارا ناشتہ تیار کر دیا ہے آکر کرلو۔“

”ماں میں بس ابھی آیا۔“

”انزک کہیں انٹرویو دینے جا رہے ہو کیا؟“

”نہیں ماں، ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں کافی عرصے کے بعد جرمنی سے آیا ہے۔“ انزک خود پر فحوم اسپرے کرتے ہو ابولا۔

”تو میرے چاند تم اپنے اس دوست سے کہو ناں، وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے، تم جرمنی پہنچ کر وہ ساری رقم ادا کر دینا جو وہ خرچ کرے۔“ صابرہ بیگم نے مشورہ دیا۔

تیسرے مہینے پر انز باٹلے کر رکھ دیتی ہیں، آپ بتائیے مجھے، کبھی نکلا ہمارا پر انز باٹلے؟“

”اچھا چھوڑو اس بحث کو، انشاء اللہ میرا اللہ میری ساری مرادیں پوری کرے گا۔ بہر حال تم تیار ہو کر جلدی سے باہر آ جاؤ، ورنہ ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ صابرہ اس کا کندھا تھپکا کر باہر نکل گئی تھیں۔

”جی ماں میں ابھی آیا۔“ اب وہ اپنے بیٹے کے سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اور گھڑی اٹھا رہا تھا، جب وہ باہر آیا تو ناشتے پہ سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”السلام علیکم؟“ وہ سب کو سلام کرتا چیخڑ پہ بیٹھا۔

”آج تو میرا انزک شہزاد لگ رہا ہے۔“ دادی نے اسے پیاز سے دیکھا تو وہ مسکرایا۔

”ہاں بھئی شہزادے کہاں کی تیاری ہے؟“ ستارہ نے مسکراتے ہوئے اسے کریدا۔

”ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔“ اس نے پراٹھا اپنی پلیٹ میں رکھا۔

”تمہاری تیاری دیکھ کر تو لگتا ہے کسی لڑکی سے ملنے جا رہے ہو؟“ ستارہ نے مسکراتے ہوئے اسے چیخڑا تھا۔

”ارے پچھو، آج کل کی لڑکیاں غریبوں پہ لٹو نہیں ہوتیں۔“ آملیٹ کی پلیٹ اپنی طرف ٹھکراتے ہوئے وہ مسکرایا۔

”فٹے منہ ستارہ، میرے دنیا جہان کے شریف پوتے پہ شک کر رہی ہے؟“ دادی جذباتی ہوئیں۔

”بے جی مذاق کر رہی تھی۔“ ستارہ ہنسی۔

”انزک بیٹا ویسے تو تم بہت سمجھدار ہو لیکن ایک ماں ہونے کے ناطے تمہیں سمجھانا میرا فرض بنتا ہے، بیٹا لڑکیوں کے چکروں سے ہمیشہ دور رہی

رہنا، ایسے کاموں میں سوائے بدنامی اور خواری کے کچھ نہیں رکھا ہوتا۔“ صابرہ نے چائے گنگ میں ڈال کر اس کے سامنے رکھا اور حبیہ کی۔

”کم آن ماں، آپ اس طرح کے وہم مت پالا کریں، آپ کا یہ لیکچر میں اسکول کے زمانے سے سنتا آ رہا ہوں، ستارہ پچھو کی تو عادت ہے بات کا جھگڑ بنانے کی۔“ انزک نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا جانے والی نظروں سے حصارہ کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ چاروں اس وقت ایک آنکس کریم پارلر میں بیٹھے تھے، بلیک ٹیولپ پہ بلیک ہی شارٹ شرٹ پہنچے شانوں پہ ریڈ چھڑی دوپٹہ لٹے وہ از حد خاموش بیٹھی تھیں، انزک کو پریشانی اور اداسی صاف پری کے چہرے سے لکھی محسوس ہوئی اس نے سرسری سے انداز میں پری کو دیکھا اور پھر نظریں مٹالیں، مریم نے پری کو فوہکا مارا تو اس نے چونک کر اپنے پرس سے چیک نکالا۔

”مسٹر انزک آفاق! یہ لیجئے تین لاکھ کا چیک، انگری منٹ کے مطابق باقی کے دو لاکھ، مجھے طلاق دینے کے بعد ادا کیے جائیں گے۔“ پری نے آہستگی سے چیک اپ کی جانب بڑھایا۔

”اور آپ کو طلاق کب دینا ہو گی مجھے؟“ انزک نے چیک پکڑتے ہوئے دریافت کیا تو پری نے بے ساختہ اسے دیکھا تھا، انزک اور پری کی نظریں ملیں تھیں اور دونوں نے ہی شرمندگی سے نگاہیں جھکا لیں تھیں۔

”باقی کے تمام معاملات سمیر کے انگیڈ سے واپس آنے پہ منٹائے جائیں گے۔“ مریم نے دھیرے سے وضاحت کی۔

”اوکے میں اب چلتا ہوں، میرا فون نمبر آپ کے پاس موجود ہے، کسی بھی قسم کی ہیلپ

چیک تیکے کے نیچے چھپایا۔
 ”آجائیں دروازہ کھلا ہے۔“ انزک نے
 آواز لگائی، صابروہ ہاتھوں میں دودھ کا گلاس
 پکڑے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”کیا سوچ رہا ہے میرا بیٹا؟“ دودھ کا
 گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے
 انزک کے سنجیدہ چہرے کو غور سے دیکھا۔

”ماں میں سوچ رہا تھا کوئل جب اس گھر
 سے چلی جائے گی تو گھر کتنا سونا ہو جائے گا؟“
 انزک اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ہاں بیٹا یہ تو سچ ہے، گھر ایک بار خالی ہو
 جاتے ہیں بیٹیوں کو رخصت کرنے کے بعد، لیکن
 تم اداس مت ہو، کوئل جب اپنے گھر میں ہنسی
 خوشی رہے گی تو سب سے زیادہ خوشی بھی تمہی کو ہو
 گی۔“

”جی ماں یہ تو ہے۔“ اس نے مسکرانے کی
 کوشش کی۔

”اچھا یہ بتاؤ، پرائز بانڈ کی قرعہ اندازی کی
 لسٹ لائے؟“ صابروہ اس کے پاس بیٹھتی ہوئی
 پوچھنے لگیں۔

”نہیں ماں، آج سارا دن بہت مصروفیت
 میں گزرا، کل لا دوں گا۔“ انزک نے دودھ کا
 گلاس اٹھایا۔

”کل یاد سے لا دیتا مجھے۔“

”انشاء اللہ ماں ضرور لا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے میرے بچے، میں اب چلتی
 ہوں، تم بھی آرام کرو۔“ وہ انزک کے کندھے پہ
 ہاتھ پھیرتے ہوئے انھیں اور پھر وہ کمرے سے
 باہر نکل گئی تھیں۔

دوسرے دن انزک نے انہیں لسٹ لا دی
 تھی اور خود وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
 چشمہ لگا کر لسٹ دیکھتے ہوئے یک لخت

کی ضرورت ہو آپ بلا جھجک کہہ سکتی ہیں مجھے۔“
 وہ مریم سے مخاطب تھا تب لیکن اس کی نظریں
 بے اختیار اس اداس سی لڑکی پہ اٹکی تھیں، جو اس
 وقت اس کے نکاح میں تھی۔

”جی ضرور۔“ مریم نے جواباً کہا تھا اور پھر
 وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

”میری قسمت میں نا جانے اور کتنی
 آزمائشیں لکھی ہیں؟“ پری کے انداز میں مایوسی
 تھی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا پری، کیوں
 پریشان ہوتی ہو؟“ ماہ رخ نے اس کے ہاتھ پہ
 اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

”پہ نہیں سب ٹھیک ہو گا بھی کہ نہیں؟“
 ہنوز مایوسی۔

”پری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر کے اس
 طرح مایوس ہونا بے وقوفی ہے یہ سب اب تمہیں
 بہت ہمت اور حوصلے سے فیس کرنا ہو گا۔“ مریم
 کی بات پہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”سمیرا اب نا جانے کب واپس آئے گا؟“
 اس نے فکر مندی سے کہا۔

”سمیرا کہہ رہا تھا جو نبی اس کی ماں کی طبیعت
 بہتر ہوگی وہ واپس آ جائے گا۔“ مریم نے اسے
 تسلی دی، تو وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

☆☆☆

رات انزک آفاق بستر پہ لیٹا ہاتھوں میں
 تین لاکھ کا چیک پکڑے اسے کھور رہا تھا، روپیہ
 آج کی سب سے بڑی طاقت کیسے کھوں میں
 انسانوں کے ضمیر خرید لیتا ہے؟ اس نے بھی سمجھی
 نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اسے بھی اپنا ضمیر بیچنا
 پڑے گا؟ وہ خوش نہیں تھا، اس کے چہرے پہ فکر
 بھری سوچیں چمکی ہوئی تھیں، معاً اس کے
 دروازے پہ دستک ہوئی تو انزک نے غلجٹ میں

کے چہرے خوشی سے مگ رہے تھے۔

☆☆☆

پری کا فون مسلسل بج رہا تھا، وہ واش روم سے نکلی اور ٹاول سے ہاتھ خشک کرنے کے بعد موبائل کی طرف بڑھی، وہ بھی سمیرا سے کال کر رہا ہے لیکن انزک آفاق کا نمبر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی، وہ نا جانے کیوں اسے کال کر رہا تھا، پری نے پراسوج اعزاز میں کال پک کی۔

”جی فرمائیے مسٹر انزک؟“

”مس پری میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوئی۔

”وہ دراصل مجھے آپ سے ایک ضروری

بات کرنا ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”کیسی ضروری بات؟“ وہ اب بھی حیران تھی۔

”وہ میں آپ کو فون نہ نہیں بتا سکتا، میرا ملنا

آپ سے از حد ضروری ہے، آپ بتائیے کہاں

ملاقات ہوگی آپ سے؟“

”آپ ایسا کریں مریم کے گھر آجائیں،

میں آج کل اسی کے گھر قیام پذیر ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے آپ مجھے ایڈریس سینڈ کر

دیجئے۔“

”میں ابھی کرتی ہوں، واش اپ۔“

”اوکے میں اب رکھتا ہوں۔“ انزک نے

فون بند کر دیا، اگلے ہی لمحے اسے پری کا میسج

موصول ہو گیا تھا اور پھر وہ شام کو مریم کے گھر کے

لان میں پری اور مریم کے مقابل بیٹھا تھا۔

”کیا بات کرنا تھی آپ کو مجھ سے؟“ پری

کے استفسار پر انزک نے اپنا والٹ نکالا تھا اور

اس میں سے تین لاکھ کا چیک نکال کر ان کے

سامنے پھیل پڑھ دیا۔

”مجھے یہ چیک واپس کرنا تھا۔“ انزک کی

صبرہ کے ہاتھ کا پگھلے تھے اور انہوں نے بے

اختیار انزک کو آواز دینا شروع کر دی تھیں۔

”انزک..... انزک، ذرا جلدی میرے

پاس آؤ۔“ حواس باختہ ہو کر وہ اسے بلارہی

تھیں۔

”کیا ہوا ماں خیر تو ہے نا؟“ وہ پریشانی

میں اپنے کمرے سے نکل کر ان کے پاس آیا تھا۔

”ادھر آؤ انزک..... یہ..... یہ نمبر

دیکھو..... میری تو نظر بھی کمزور ہے۔“ صبرہ نے

پرائز بانڈ اور لسٹ انزک کی جانب بڑھائی،

انزک نے بے دلی سے پرائز بانڈ پکڑ کر، صبرہ

کے بتائے نمبر سے میچ کیا۔

”زیر و..... فور..... سکس..... ٹو.....

ٹائن..... ڈبل فاف..... نیو۔“ نمبر میچ کرتے ہوئے

بے ساختہ وہ خوشی سے چلایا۔

”ارے ماں..... کمال ہو گیا..... یہ..... یہ

دیکھیں..... بچپس لاکھ، او گاڈ..... ستارہ

پھپھو..... داوی..... کوئل..... جلدی آؤ۔“ وہ

خوشی اور بے یقینی سے چلا رہا تھا۔

”ماں..... ماں آپ کی امید بر آئی،

پورے بچپس لاکھ کا انعام نکلا ہے۔“ وہ خوشی سے

چہکتا ہوا بے ساختہ صبرہ بیگم کو گھبراہٹا تھا۔

”یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ صبرہ خوشی

سے رو دیں۔

”بھابھی مبارک ہو۔“ ستارہ نے آگے

بڑھ کر انہیں گلے سے لگایا۔

”اللہ تو بے شک دلوں کے حال جانتا ہے،

رحمان ہے رحیم ہے کریم ہے۔“ دادی کی آنکھیں

بھی میچ گئی تھیں۔

”مجھے تو یقین نہیں آ رہا قیمت ایسے ہی ہم

پہریان ہو سکتی ہے۔“ کوئل بھی از حد خوش تھی۔

آفاق منزل میں گھریا عید کا ساں تھا، سب

بات یہ نہایت حیرت سے پری اور می نے اک دو بجے کی طرف دیکھا تھا۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ پری نے حیرت سے دریافت کیا۔

”ایک ہفتہ پہلے مجھے روپوں کی اشد ضرورت تھی میں نہایت مجبور تھا یہ ڈیل روپوں کی خاطر ملے کرنے پہ، مگر اب مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟ اب کیوں ضرورت نہیں ہے قارون کا خزانہ ہاتھ آ گیا ہے اب کیا؟“ پری نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”یہی سمجھ لیجئے۔“

”میں یہ چیک نہیں لے سکتی۔“ پری نے انکار کیا۔

”دیکھئے میں یہ چیک ہی آپ کو واپس کرنے آیا ہوں۔“

”تم یہ احسان مجھ یہ کیوں کر رہے ہو؟ کہیں تمہاری کوئی چال تو نہیں ہے اس میں؟“

پری نے مٹھلکے انداز میں اسے دیکھا۔

”دیکھئے آپ خواہ مخواہ مجھ پہ شک مت کریں، میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا میر صاحب کے آتے ہی میں آپ کو طلاق دے دوں گا، فی الحال آپ یہ چیک رکھ لیجئے۔“ وہ چیک پھیل پہ رکھ کر اپنی نشست سے اٹھا۔

”مسٹر انزک مجھے مفت میں کسی کا احسان لینے کی عادت نہیں ہے۔“ پری کے لہجے میں رعونت تھی۔

”اور مجھے بغیر مطلب کے لوگوں کی مدد کرنے کی عادت ہے۔“ برجستہ جواب۔

”اگر تمہیں لوگوں سے ہمدردی کا بخارا تھی جلدی چڑھ جاتا ہے تو تم نے یہ آخر پہلے رجحان کیوں نہ کی؟“

”مس پری پہلے میں بہت مجبور تھا۔“

”اب ایسا کیا ہو گیا ہے کہ۔“ وہ بولتے بولتے رکی۔

”اب میں مجبور نہیں ہوں، اس سے زیادہ میں آپ کو بتانے کا پابند نہیں ہوں، میں یہ چیک چھوڑ کر جا رہا ہوں، میر صاحب سے اس سلسلے میں، میں خود بات کر لوں گا، اللہ حافظ۔“ وہ چیک چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔

انزک کے اچانک یوں چیک واپس کرنے پہ پری کے دل میں کئی شک و شبہات جنم لے رہے تھے جن کا وہ رات سیر سے فون پہ اظہار کر رہی تھی۔

”میر! انزک نے وہ چیک واپس کر دیا ہے۔“ وہ فکر مندی سے بتا رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں پری، میری بات ہوئی تھی اس سے۔“ میر نے عام سے انداز میں بتایا۔

”میر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟“ وہ الجھی۔

”وہ کہتا ہے میں رقم لے کر گتہ کار نہیں ہوتا چاہتا۔“

”میر میں نے سنا ہے یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے حلالہ کا۔“

”کم آن بری جتنا اس بارے میں سوچو گی اتنا ہی الجھتی جاؤ گی اللہ معاف کرنے والا ہے، انشاء اللہ ہماری غلطیوں کو بھی اللہ معاف کر دے گا۔“ میر نے اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا۔

”اچھا یہ بتاؤ واپس کب آؤ گے؟ ایک ہفتہ ہو گیا ہے تمہیں گئے ہوئے۔“ رندگی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔

”او گاڈ یار، ایک ہفتے میں پانچ سو بار یہ سوال کر چکی ہوں، مجھے کی کوشش کرو پری، مام کو ہارٹ ایک ہوا ہے ابھی ان کی سرجری ہوئی ہے، میں ان کی اکوئی اولاد ہوں انہیں ایسی حالت

آئندہ تم مجھے یہاں نظر آئے تو بہت برا ہوگا۔
انوش نے اسے وارننگ دی اور پھر اپنی گاڑی کی
طرف بڑھی، ڈرائیور اس کا انتظار کر رہا تھا۔
”جانتی ہو جب اس معصوم سے چہرے کے
ساتھ تم غصہ ڈھاتی ہو تو غضب کی لگتی ہو۔“ وہ
اس کے پیچھے آیا۔

”تو تم یوں نہیں مانو گے؟“
”تم پیار سے منوا کر تو دیکھو۔“
”پیار؟“ اس نے نہایت غصے میں پلٹ کر
شاہ ویر کو گھورا۔
”مائے فٹ۔“ وہ دھاڑی۔

”تمہارا کوئی اور ہی علاج کرنا پڑے گا۔“
”مجھے انتظار رہے گا۔“ شاہ ویر مسکرایا، وہ
بہت کم عمر اور معصوم سی لڑکی اس کے منہ سے اتنی
بڑی بڑی دھمکیاں سن کر وہ محسوس ہوا کرتا تھا،
اب کے اس نے شاہ ویر کی کسی بات کا جواب
نہیں دیا تھا اور گاڑی میں بیٹھ گئی، شاہ ویر بھی
اپنے ہیوی بائیک پہ بیٹھا، اس کا پیچھا کرنے لگا۔
”میری مانو تو دوستی کر لو مجھ سے۔“ وہ
بائیک پہ بیٹھا اس کی تیز رفتار چلتی گاڑی کی پچھلی
سیٹ کے قریب بائیک لائے بولا، تو انوش کا دل
چاہا وہ کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارے۔
”مجھے نہیں کرنا ہے تم جیسے لوغر سے دوستی۔“
وہ بے بسی سے بولی۔

”تو شادی کی آفر پہ غور کر لو؟“ شاہ ویر نے
اسے یاد دلایا۔

”خدا کے لئے دفع ہو جاؤ اور جان چھوڑ دو
میری۔“ بے بسی سے اب کے انوش نے التجاء
کی۔

”جان تو تم نے میری لے لی ہے، تمہاری
محبت میں گھوڑے گھوڑے ڈب چکا ہوں۔“ اس
کے جواب پہ انوش نے سر تھام لیا تھا۔

میں تنہا کیسے چھوڑ کر آ سکتا ہوں؟“ سیر نے اسے
سمجھایا، تو وہ خاموش ہو گئی۔

”پری تم یہ چیک کیس کرو کر اپنے پاس
رکھ دو، تمہیں رویوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“
”سیر میں ایک ہفتے سے مریم کے گھر پہ
ہوں، اس پہ بوجھ پڑی ہوئی ہوں۔“

”کم آن سکی کرل، سب ٹھیک ہو جائے گا،
جہیں بلاوجہ پریشان ہونے کی بیماری ہے اور می
کی کے گھر تم بالکل محفوظ ہو وہ تمہاری بچپن کی
دوست ہے، جہاں اتنی گہری دوستی ہو، وہاں کوئی
کسی پہ بوجھ نہیں ہوتا۔“ جواباً وہ پھر خاموش
ہوئی۔

”میں اب فون رکھتا ہوں، اپنا بہت خیال
رکھنا، انشاء اللہ جلد ہی ہم پھر سے ایک ہو جائیں
گے، زندگی کی سب پریشانیاں دور ہو جائیں
گی۔“

”سیر آئی مس یو سوچ۔“ اس نے بھرائی
آواز میں کہا۔

”آئی مس یو ٹو میری جان، صرف چند دن
کی بات ہے، پھر تم اور میں ہوں گے اور ڈیویر
ساری خوشیاں ہوں گی۔“ سیر نے بھرپور تسلی
اس کے کانوں میں اڑا لی تو اس کے لب
مسکرانے لگے، تھوڑی دیر کے بعد سیر نے فون
رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

انوش کالج سے نکلی تو اسے کھڑا دیکھ کر غصے
کی ایک لہر سارے بدن میں سرایت کر گئی۔

”ہائے۔“ وہ مسکراتے ہوئے قریب آیا۔
”تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”انہیں دیکھنے کے لئے جنہیں دیکھنے کی
فرصت نہیں ہمیں۔“ وہ مسکرایا۔

”سٹ اپ، دفع ہو جاؤ یہاں سے، اگر

نے اٹھ کر چل پہنی اور کمرے سے نکل کر کچن کی طرف بڑھی، چار کنال کے بنگلے میں رات کی فسون خیر خاموشی تھی۔

وہ کچن میں فریج سے پانی کی بوتل نکال کر وہیں ڈاننگ چیئر کھینٹ کر بیٹھ گئی تھی، اس خواب نے اس کے ذہن کو الجھا دیا تھا، وہ اسی خواب کے بارے میں سوچتی ابھتی کھوٹ کھوٹ پانی پینے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد کچن کا دروازہ کھلا تھا اور می می سے تین سال بڑا بھائی جواد کچن میں داخل ہوا، وہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا ایک دن پہلے ہی واپس لوٹا تھا۔

”پر..... می..... تبت..... تم؟“ جواد کی آواز اور چال میں لڑکھراہٹ تھی، پری کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت وہ شراب کے نشے میں دھت تھے۔

”جی جواد بھائی، پیاس لگ رہی تھی۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا اور چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مم..... مجھے..... بھی..... پپ..... پیاس ہی لگی ہے۔“ وہ ہنوز لڑکھراتے قدموں سے آگے بڑھے، پری نے وہاں سے چلے جانا ہی مناسب سمجھا، سو جب وہ ان کے قریب سے گزر کر دروازے کی سمت بڑھی تو جواد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

”لگ..... کہاں..... جا..... رہی ہو.....“
 ”ی..... بیٹھو ناں..... میرے..... پا..... س.....“

”جواد بھائی یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ چھوڑے میرا ہاتھ؟“ اس نے گھبرا کر جواد کو دیکھا اور اپنا ہاتھ چھڑا نا چاہا۔

”پری..... تبت..... تم..... بب..... بہت.....“

”ڈرائیور انکل گاڑی تیز چلائیں۔“
 ”بیٹا ایسے بگڑے ہوئے لوگوں سے نہیں الجھتے، بی بی جی کو علم ہوا تو وہ پریشان ہو جائیں گی۔“

”پلیز ڈرائیور انکل آپ مام کو کچھ مت بتائیے گا۔“ اس نے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے بیٹا آپ بے فکر ہو جائیے۔“
 ڈرائیور نے گاڑی کی اسپید تیز کی شاہ دیر انہیں اور ٹیک کرتے ہوئے دائیں سے بائیں جانب آیا۔

”گھر جا کر ٹھنڈے دل و دماغ سے میری آفر پے غور کرنا۔“ بیوی بائیک چلاتے ہوئے وہ گاڑی کے شیشے کے قریب آیا۔

”میرا جواب تب بھی انکار ہوگا۔“
 ”تم اپنے لئے مشکلات پیدا کر رہی ہو۔“
 ”میں تمہاری دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں۔“

”دیکھتے ہیں پھر، کس کو کھٹکتی ہوئی ہے اور کون جیتتا ہے؟“ اس نے جھک کر شیشے میں سے جھانکا، تو انوش بیچ و تاب کھا کر رہ گئی، یہ شخص اس کے لئے درد من بن گیا تھا۔

☆☆☆

پریشے ایک بھیانک خواب سے ہڑبڑا کر اٹھی تھی، وہ سمیر کے ساتھ کسی بلندی پہ کھڑی تھی یکدم اس کا پاؤں لڑکھڑایا تھا اور وہ کسی گہری کھائی میں جا گری تھی، وہ چیخا چاہتی تھی لیکن اس کی چیخ اس کے حلق میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اس نے سائڈ ٹیبل سے پانی اٹھانا چاہا مگر آج شاید باسی رضیہ (مریم کی ملازمہ) اس کے سر ہانے پانی کا جگ رکھنا بھول گئی تھی، پری نے وال کلاک کی جانب دیکھا رات کے ڈھائی بج رہے تھے اس

خاموش ہو گئی۔

”سمیر سے لڑائی تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے می۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”پری تمہاری یہ حالت دیکھ کر میرا دل پھٹ رہا ہے مجھے لگ رہا ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟“ وہ ہنوز فکر سے پوچھ رہی تھی۔

”میں تم سے کیوں کچھ چھپانے لگی؟“

”تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں ورنہ میرا دل نہیں مان رہا تمہاری حالت دیکھ کر۔“ می نے تشویش سے اسے دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔

”می می وہ میں..... کچھ دن کے لئے ماہ رخ کے پاس جانا چاہ رہی تھی۔“ پری نے آنکھلی سے کہا۔

”لیکن کیوں میری جان؟ یہاں کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ مجھے؟“ مریم نے حیرت سے سامنے بیٹھی پری کو دیکھا۔

”نہیں می می مجھے یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے بس ایسے ہی ڈپریشن دور ہو جائے گا میرا، جگہ چنچ کرنے سے۔“ اس نے بہانا بتایا۔

”سمیر کے واپس آنے تک تم میرے پاس رہتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔“ می می نے حیرت سے اس کے کانڈھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ دن ماہ رخ کی طرف رہ آؤں، پھر آؤں گی تمہاری طرف۔“ پری نے اسے ٹالا۔

”اوکے ایز یوش۔“ می می نے محبت سے اسے دیکھا تھا اور پھر اسی دن وہ ماہ رخ کے گھر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

بی جان کے ہاتھوں میں ماہین کی تصویر تھی جس پہ وہ دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کی تصویر سے باتیں کر رہی تھیں۔

خوب..... صورت..... ہو..... تھوڑی.....

دیر..... رکو..... تم..... میرے.....

پاس۔“ جوا نے اسے اپنی جانب کھینچا تو اس کے لبوں سے چیخ نکل گئی، وہ پھٹی پھٹی لگا ہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے خود کو ان کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مس..... سمیر..... لگ..... کتنا بد نصیب

ہے ناں۔“ وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے پولا تو پری نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا اور پچن سے دوڑ لگا دی، جواد کو توقع نہ تھی سو بری طرح سے لڑکھڑا کر ٹھیل پہ جا گرا تھا۔

کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا اور بیڈ پہ گرتے ہوئے زارو قطار رونے لگی، وہ جواد کو ہمیشہ بڑے بھائی کا درجہ دیتی آئی تھی اور آج اس کا بھیا تک چہرہ دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی، صبح مریم جب اس کے کمرے میں آئی تو پری کی آنکھیں رات بھر رونے سے سو جی ہوئی تھیں۔

”پری کیا ہوا تمہیں؟ تم روتی رہی ہو ساری رات؟“ می می نے فکر مندی سے استفسار کرنے لگی۔

”نن..... نہیں..... می می..... بس ایسے ہی سر میں بہت درد ہے۔“ اس نے نظریں چرا تے ہوئے کہا۔

”پری تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟“ مریم نے کہہ دیا۔

”نہیں می می، بس ایسے ہی اپنی قسمت پہ رونا آتا رہا رات بھر۔“

”کم آن یار کیوں پریشان ہوتی ہو، ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں آنے والا کل تمہارے لئے بہت خوبصورت اور خوشیوں سے بھرپور ثابت ہو گا۔“ می می نے اسے تسلی دی تو وہ

جان نے ناراضگی دیکھائی۔
 ”آئی سویری بی جان میں تھوڑا مصروف تھا،
 ورنہ میں آپ کے کمرے میں نہ آؤں؟ ایسا ہو سکتا
 ہے کیا؟“ شاہ ویر نے ان کے ہاتھ تھام کر لیوں
 سے لگائے۔

”آج کل کی اولادوں کے خون سفید ہو
 گئے ہیں، اس لئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔“
 ”کم آن بی جان اب یوں غلی کٹی تو نہ
 سنائیں، آپ جانتی ہیں ناں، میں آپ کو خفا نہیں
 دیکھ سکتا۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔
 ”میری غلطی کی پردہ ہو تو تم روز مجھ سے
 ملنے آؤ، سارا سارا دن اکیلی ان دارود دیواروں کو
 دیکھتے ہوئے اپنے زندہ ہونے پہ افسوس ہونے
 لگتا ہے۔“

”سویری بی جان پکا وعدہ آئندہ ایسی غلطی
 کبھی نہیں ہوگی۔“ شاہ ویر نے معافی مانگی۔
 ”آخری بار معاف کر رہی ہوں۔“ بی جان
 نے اس کے سر پہ چپٹ لگائی، شاہ ویر میں تو ان
 کی جان تھی۔

”بی جان یو آر گریت۔“ وہ مسکرایا۔
 ”منکے بازی تو کوئی تم سے سیکھے، یہ بتاؤ
 میرے بیٹے کو اتنا کیوں ستاتے ہو؟ ارے میں
 نے آپ کے بیٹے کو بھلا کب ستایا ہے؟ آپ کے
 بیٹے نے ہمیشہ میرا دل دکھایا ہے، بچپن سے لے
 کر اب تک ہمیشہ مجھے ڈی گرڈ کیا ہے، یاد ہے
 آپ کو، مگر میں جب بھی کوئی پارٹی یا گیت تو
 گیدر ہوتی پایا کیسے اپنے نا پر بیٹے پارس کا شعر سے
 تعارف کروایا کرتے تھے، اس کی قابلیت کی
 تعریفیں کیا کرتے تھے اور میں کسی کو نے میں بیٹھا
 دل گرفتہ سا سوچا کرتا تھا کہ میں شاید پایا کا لے
 پالک بننا ہوں، ہمیشہ پایا نے مجھ پہ پارس کو
 فوقیت دی ہے اسے ہیرو اور مجھے زیر و فرار دیا

”مدت ہوئی تمہیں دیکھے ہوئے، تمہیں
 سننے سے لگائے ہوئے، اب تو لگتا ہے تمہیں
 دیکھے بغیر مجھے موت بھی نہیں آئے گی۔“ آنکھوں
 سے آنسو ٹوٹ کر مایہن کی ہنسی مسکرائی تصویر پر گر
 رہے تھے۔

”کاش..... کاش تم وہ قدم کبھی نہ اٹھاتی جو
 تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور کر گیا، تم
 تو اپنی بسائی دنیا میں بہت خوش ہو گی، لیکن میں کیا
 کروں مایہن، جب سے تم گئی ہو، میرا سارا کھ
 چین اپنے ساتھ لے گئی ہو، ان میں سالوں میں
 تمہاری ماں کا دل کس کس طرح تمہارے لئے
 تڑپا ہے؟ میرے حوصلوں نے کب کب مجھے
 شکست دی ہے، میرا وجود کب کب ریزہ ریزہ
 ہوا ہے میرا دل کتنے حصوں میں تقسیم ہوا ہے،
 میری آنکھوں سے آنسو لوہن کر کتنی بار ٹپکے ہیں،
 تم کیا جانو مایہن، خود ماں بنی ہو گی تو تمہیں میری
 یاد آتی ہو گی؟ ماں کی تڑپ کیا ہوتی ہے، اسے
 زمانے کی بدنامی تھوپنے کی کیا تکلیف ہوتی ہے؟
 اولاد کی دی ہوئی تکلیف ماں کو کیسے صیلب پہ
 ٹانگ دیتی ہے؟ اللہ کرے تمہاری اولاد وہ بھی
 تمہارے ساتھ نہ کرے جو تم نے میرے ساتھ
 کیا۔“ بی جان بولتے بولتے رو پڑی تھیں۔

اچانک ان کے کمرے میں شاہ ویر آیا تو وہ
 غجٹ میں آنسو صاف کرنی مایہن کی تصویر کو تنکے
 کے نیچے چھپانے لگیں۔
 ”کیسی ہیں بی جان؟“ وہ ان کے بیڈ پہ ان
 کے مقابل بیٹھے ہوئے پوچھنے لگا۔
 ”جیسی بھی ہوں تمہیں کیا۔“ غلطی سے
 جواب دیا گیا۔

”آپ خفا ہیں مجھ سے؟“
 ”میرے خفا ہونے کی تمہیں پردہ ہوتی تو
 یوں بیٹھے بعد میرے کمرے میں نہ آتے۔“ بی

میں آپ کے کمرے میں آیا تھا تو آپ روکیوں
رہی تھیں؟“

”بس ایسے ہی دل بھرا آیا تھا۔“

”ماہین چھو کو یاد کر رہی تھیں نا؟ بی جان
میرا آپ سے وعدہ ہے میں انہیں آپ سے ضرور
ملواؤں گا، انہیں ڈھونڈ نکالوں گا، بیٹی ہیں وہ آپ
کی، اپنی پسند سے شادی کرنا کوئی جرم نہیں ہے بی
جان! پسند سے شادی تو پاپا نے بھی کی تھی پھر
انہیں آپ نے عاق کیوں نہ کیا؟ ان سے نا
کیوں نہ توڑا؟ انہیں سزا کیوں نہ دی؟“
زیادتی کی آپ نے اور پاپا نے ان سے۔“

ماہین کے ذکر پر ایک بار پھر ان کی آنکھیں
بھرا آئیں تھیں اور دل ٹھٹھکنے لگا تھا۔

☆☆☆

زندگی نے ہمیشہ پری کو ادھوری خوشیاں دی
تھیں، کئی بار وہ اپنی قسمت پر روٹی تھی، کبھی ماں کی
زیادتیوں پر دکھی ہوتی تھی اور کبھی باپ کی خود غرضی
پر، کچھ دکھ کبھی کسی کو بتائے نہیں جاتے، صرف
سہے جاتے ہیں۔

”اور اس کی تکلیف میں چاہے آپ کا دل
چھلنی ہو یا جذبے، وجود زندہ لاش بنے یا آنکھوں
میں چاگتے بنے مر جائیں کسی کو کچھ خبر نہیں
ہوتی۔“ وہ بھی اس وقت انہی جذبوں، تکلیفوں
اور امتحانوں سے گزر رہی تھی۔

ماہ رخ کے گھر آئے اسے دس بارہ دن ہو
چکے تھے، تھوڑی دیر پہلے ہی پری اور ماہ رخ
شاپنگ سے لوٹی تھیں، اب وہ شاور لے کر لپٹی تھی
اور ماہ رخ کے گھر میں خود کو خاصا پرسکون محسوس
کر رہی تھی، اچانک اسے باہر سے شاز یہ آنٹی
(ماہ رخ کی ماما) کی بلند آواز نے متوجہ کیا تھا، وہ
شاید ماہ رخ کو کسی بات پر ڈانٹ رہی تھیں، لیکن
پھر اپنا نام سن کر وہ بے اختیار دروازے کے

ہے، اس لئے میں نے خود کو اپنی دنیا اور زندگی
میں مگن کر لیا، اب پاپا کے رویوں پہ مجھے دکھ نہیں
ہوتا۔“

”شاہ ویر میری جان تمہارے شکوے اپنی
جگہ، لیکن وہ باپ ہے تمہارا اور والدین کو اپنی
اولاد سے بہت امیدیں ہوا کرتی ہیں، سارا بزنس
پارس نے سنبھال رکھا ہے، میرے بچے تم بھی
آفس جایا کرو، باپ اور بھائی کا پورا جھباٹو، زندگی
ایسے موج مستی میں ٹھوڑی گزرے گی؟“ بی جان
نے اسے سنبھایا۔

”بی جان اس مسئلے کا بھی ایک حل ہے،
آپ میری شادی کیوں نہیں کر دیتیں؟“
”چل ہٹ، تجھ سے بڑا ابھی بیٹھا ہے اور
تمہیں بیاہ کا شوق چڑھ آیا؟“ بی جان
مسکرائیں۔

”لو جی، اس معاملے میں بھی مجھے پارس
کے پیچھے کھڑا ہونا پڑے گا؟“ اس نے منہ بتایا۔
”کوئی لڑکی پسند آگئی ہے کیا؟“ بی جان
نے رازداری سے پوچھا۔

”جی بی جان، یہ دیکھیے۔“ شاہ ویر نے
موبائل نکال کر انوش کی تصویر انہیں دکھائی۔
”ارے ماشاء اللہ یہ تو بہت پیاری ہے اور
اس کی آنکھیں، ماتھا اور ہونٹ تو ہو بہو میری
ماہین جیسے ہیں۔“ بی جان خوشی سے بولیں۔
”بہت میٹھی کمر ہے بی جان، ذرا خاطر
میں نہیں لاتی مجھے۔“

”شریف لڑکیاں ہی خاطر میں نہیں لایا
کرتیں، یہ بتاؤ خاندان کیسا ہے؟“

”بی جان ابھی یہ معلوم نہیں کروایا۔“
”تو جلدی کرواؤ، میں خود اپنے بیٹے کا رشتہ
لے کر جاؤں گی۔“ بی جان مسکرائیں۔

”جی بی جان، آپ مجھے یہ بتائیے، جب

قریب آئی تھی۔
 ”مما پلیز آہستہ بولیں، پری نے سن لیا تو۔“ ماہ رخ نے دبی آواز میں انہیں چپ کر دیا۔
 ”کیوں آہستہ بولوں میں؟ یہ میرا گھر ہے کوئی ہوٹل نہیں ہے جہاں تمہاری دوست پری نے ڈیرہ ہی جمایا ہے۔“

”شاز یہ آتنی کی غصے میں ڈوبی آواز اس کے کانوں سے ٹکرانی تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔“

”مما خدا کے لئے آہستہ بولیں، صرف چند دن کی ہی تو بات ہے میرے آتے ہی پری یہاں سے چلی جائے گی۔“ ماہ رخ نے التجا کی۔

”یہ چند دن نا جانے کتنے دنوں پہ محیط ہوں گے؟ جانتی ہو تم عارفہ مجھ سے کتنی ناراض ہے جب سے اسے علم ہوا ہے کہ پری میرے گھر ٹھہری ہوئی ہے، تم اچھی طرح سے جانتی ہو عارفہ کے بزنس میں ہمارا شیر ہے پری کے یہاں رہنے ہے ہمارا Relation خراب ہو گا۔“

”مما کوئی ریلیشن خراب نہیں ہوگا، صرف چند دن کی بات ہے آپ خواہ البتہ بنا رہی ہیں۔“

”میں البتہ بنا رہی ہوں؟ جو لڑکی اپنی ماں کی نہ ہو سکی، اس سے دوستی بھا کر تمہیں بھی کچھ نہیں ملنے والا۔“

شاز یہ آتنی ماہ رخ کو ڈانٹ رہی تھیں اور وہ دروازے کے ساتھ لگی بے آواز رو رہی تھی، ان کی باتیں پری کو چھلنی کر رہی تھیں۔
 ”مما پلیز..... پلیز سمجھنے کی کوشش کریں پری میری بیٹ فرینڈ ہے، میں اسے کیسے اپنے گھر سے چلے جانے کا بول سکتی ہوں؟“ اب کے ماہ رخ کی بے بسی اس کے کانوں سے ٹکرانی۔

”دنیا میں بہت ساری بیٹ چیزیں

ہمارے لئے بیٹ نہیں ہوتیں اس حقیقت کو سمجھو، جب تک پری عارفہ کے پاس تھی اس کی ایک حیثیت تھی ایک ویلیو تھی اس کی۔“
 ”لیکن اب اس کی کوئی ویلیو نہیں ہے عارفہ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے وہ زیرو ہو چکی ہے۔“

”یہ آپ کی رائے ہوگی، پری اب بھی میرے لئے سب سے خاص ہے۔“

”باگل لڑکی! چیزیں جب Useless ہو جائیں تو انہیں پھینک دیا جاتا ہے، انہیں سینے سے نہیں لگایا جاتا۔“ شاز یہ آتنی کی رعوت بھری آواز نے اس کو چھلنی کر دیا تھا، وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے روئے جا رہی تھی، لفظ Useless نے اس کے دل کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

”مما پری کوئی چیز نہیں ہے، وہ ایک جیتی جاگتی انسان ہے، میں اسے ایسے وقت میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتی ہوں جب اسے میری ضرورت ہے۔“ ماہ رخ خوب اس کی دکالت کر رہی تھی۔

”پری..... پری..... پری..... بس کر دو ماہ رخ، ایک بزنس مین کی بیٹی ہو کر تم اتنی اسٹوڈنٹ کیسے ہو سکتی ہو؟، اپنی دے تمہیں اس وقت سمجھانا بالکل بے کار ہے، میں تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دے رہی ہوں، اگر میرا واپس نہ آیا تو میں خود پری کا سامان اٹھا کر اسے نکال باہر کروں گی۔“
 وہ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد چلی گئی تھیں۔

باہر اب خاموشی چھا گئی تھی، وہ پریشہ شاخ سے ٹوٹے پتے کی طرح بکھر کر رہ گئی تھی۔

ٹھوڑی دیر کے بعد جب ماہ رخ اس کے کمرے میں آئی تھی تو وہ الماری سے اپنے کپڑے نکال کر بیڈ پہ رکھے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔

”زکو میں ڈرائیور سے کہتی ہوں وہ تمہیں
چھوڑ آئے گا۔“
”نہیں میں آٹو یا کوئی ٹیکسی لے لوں گی۔“
پری اب اپنا سوٹ کیس اٹھا کر کمرے سے نکل گئی
تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی اسائنمنٹ
مکمل کر رہی تھی، جب اسپورٹس ہیوی بائیک کی
مخصوص آواز آئی تھی، دو چار بار ہارن دیا گیا اور
پھر اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔
”ہیلو۔“ انوش نے فون اٹھایا۔
”کیسی ہو سوئیٹ ہارٹ؟“ شاہ ویری کی شوخ
آواز اس کے کان سے گزرائی۔

”تم..... تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا؟“ وہ
حیران ہوئی۔
”میں نے تمہیں بتایا تھا ناں، میرے لئے
کچھ بھی حاصل کرن مشکل نہیں۔“ انوش نے فون
بند کیا۔

اگلے ہی لمحے دوبارہ فون بج اٹھا، اس نے
غصے سے بجتے موبائل کو دیکھا بہت ڈھیٹ ہے یہ
شخص اس نے فون اٹھایا۔
”کیا مسئلہ ہے تمہارا؟“

”تم..... صرف اور صرف تم۔“ اطمینان
سے جواب دیا گیا۔

”بکو اس بند کرو، اور اب مجھے فون مت
کرنا، ورنہ۔“
”ورنہ کیا؟ تمہارا ورنہ بہت انٹرسٹنگ لگتا
ہے مجھے۔“

”تم..... تم میرے سامنے ہوتے تو سر پھاڑ
دیتی تمہارا۔“
”میں اب بھی تمہارے سامنے ہی ہوں۔“
”کیا مطلب؟“

”ارے یہ کیا؟ پری تم کہیں جا رہی ہو
کیا؟“ وہ نظریں چراتے ہوئے پوچھنے لگی۔
”سمیر نے پی سی ہوٹل میں میرے لئے کمرہ
بک کر دیا ہے۔“ مختصر جواب۔

”مگر اس طرح اچانک؟“ ماہ رخ اس سے
نظریں نہیں ملا پا رہی تھی پری سوٹ کیس بند
کرنے کے بعد اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔
”چیزیں جب Useless ہو جائیں تو
انہیں سنبھالا نہیں جاتا میری پیاری دوست، انہیں
زندگی سے نکال دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔“ پری کی
بات پہ ماہ رخ شرمندگی سے سر جھکا گئی تھی۔
”پری میں..... میں تم سے اذ حد شرمندہ
ہوں ممانے.....“

”اس اوکے ماہ رخ، شازیہ آئی ٹھیک کہتی
ہیں، میری اب کوئی حیثیت کوئی ویلو نہیں رہی،
میرا یہاں سے چلے جانا ہی تم سب کے لئے بہتر
ہوگا۔“

”پری..... آتم سواری..... ماما کو ایسا نہیں
کرنا چاہیے تھا میں نے آج سے پہلے کبھی خود کو
اتنا بے بس محسوس نہیں کیا۔“

”ماہ رخ تمہیں شرمندہ ہونے کی کوئی
ضرورت نہیں ہے، تم مجبور ہو۔“

”میں جانتی ہوں اور سمجھتی ہوں تمہاری
مجبوری کو، اسی لئے میں نے یہاں سے جانے کا
فیصلہ کیا ہے، کیونکہ میں تمہارے گھر میں اپنی وجہ
سے کوئی ڈسٹربنس نہیں چاہتی۔“ پری نے اس
کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے تو ماہ رخ اس کے گلے
لگ کر رودی۔

”مجھے معاف کر دینا پری۔“
”مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ماہ رخ۔“
”میں اب چلتی ہوں۔“ پری سوٹ کیس کی
جانب بڑھی۔

آئی، وہ سامنے بایک پہ کھڑا تھا، انوش نے اسے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا، جواباً اس نے انوش کو آئی لو کہو کہا تو اس نے غصے میں کھڑکی ہی بند کر دی۔

☆☆☆

پلی سی ہوٹل میں اسے قیام کیے ایک مہینہ ہو چلا تھا، وہ دودن سے سمیر کو کالز کر رہی تھی لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا، پری کو اپنے ساتھ ساتھ سمیر پہ بھی سخت غصہ آ رہا تھا۔

زندگی کی الجھنوں نے اسے بہت الجھا دیا تھا، سمیر کو پانے کے بعد اسے لگتا تھا زندگی نے اپنی تکمیل کر دی ہو، لیکن وہ نہیں جانتی تھی، جس خاردار راستے پر اس نے قدم رکھا تھا وہاں سوائے کانٹوں کے اور کچھ نہ تھا، وہ اکثر خود سے کہتی تھی، کون ہے جو سمجھتا ہے کہ محبت سکھ دیتی ہے؟ خوشیاں دیتی ہے؟

محبت سے تکلیف دے چیز تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی، دیمک بن کر کھا جاتی ہے انسان کو، دل کے ہتے ہتے کھر کو دیکھتے ہی دیکھتے سمار کر دیتی ہے انسان کی اتنا اور تکبر سمیر کر رکھ دیتی ہے۔

محبت میں دیکھے خواب اکثر رائیگاں چلے جاتے ہیں، انہیں بھی تعبیر کا راستہ نہیں ملتا اور پریشے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔

وہ غائب دماغی سے فی دی کے چھیل چھینج کر رہی تھی جب اس کے موبائل کی رنگ ٹون بجی تھی اور اس نے بے دلی سے فون اٹھایا تھا۔

”کیسی ہو میری جان؟“ سمیر کی محبتوں سے لبریز آواز سنائی دی۔

”کیسی ہو سکتی ہوں میں؟ تمہاری خاطر اپنا گھر چھوڑ دیا اور دھکے کھانے پہ مجبور ہو گئی۔“

”پری تم، پچھتا رہی ہو؟“

”یہ میں نے کب کہا؟“

”ذرا کھڑکی میں آؤ۔“ وہ غصے میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی، وہ اس کے گھر کے سامنے بیوی بایک پہ بیٹھا اس ہاتھ سے جیلو کھد رہا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ دھاڑی۔

”میں دفع ہونے کے لئے نہیں آیا۔“ وہ مسکرایا۔

”تم..... تم انتہا کے ڈھیٹ اور لو فر ہو۔“

”ہاں تو وہ میں واقعی ہوں۔“ وہ ہنسا، انوش موبائل آف کرنے لگی۔

”سنو فون بند مت کرنا، ورنہ میں گھر کے اندر آ جاؤں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔

”تم چاہتے کیا ہو؟“ وہ بے بس ہوئی۔

”تمہیں بتایا تو تھا۔“ وہ معصوم بنا۔

”اور میں نے تمہیں کہہ دیا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہوگا۔“

”شادی کیوں نہیں کر لیتی تم مجھ سے؟“

”شادی کوئی مذاق نہیں ہے کوئی کھیل نہیں ہے اور تم جیسے شخص سے تو ہرگز نہیں۔“

”کیا مطلب مجھ جیسے شخص سے؟ کیا کمی ہے مجھ میں؟“

”تم میں خوبی بھی تو کوئی نہیں۔“

”مجھے جانے بغیر، یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟“

”مجھے تمہیں جاننے میں ایک رتی بھی دلچسپی نہیں۔“

”ہو جائے گی فکر مت کرو۔“ اس نے تسلی دی، تو انوش نے موبائل ہی آف کر دیا اور خود بھی کھڑکی سے ہٹ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر سے بایک کا ہارن سنائی دیا، اس نے نظر انداز کیا، پھر تو آتر سے ہارن پہ بارن دیا جانے لگا۔

انوش جھنجھلاہٹ میں پھر کھڑکی کے پاس

”تمہاری باتوں سے تو یہی اندازہ لگایا میں نے۔“

”پلیز میرے... واپس آ جاؤ۔“ وہ رودی۔

”کیا ہوا پری؟ تم... تم رو کیوں رہی ہو؟“ میرے تڑپ کر پوچھا۔

”یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہو رہا میرے ساتھ؟“

”پری کچھ بتاؤ گی تو مجھے معلوم ہو گا ناں۔“

”میں تھک گئی ہوں میرے، واپس آ جاؤ، ورنہ میں مر جاؤں گی۔“

”فارگا ڈسک پری! تم رونا بند کرو اور اصل

بات بتاؤ مجھے، میں ماما کی وجہ سے آل ریڈی بہت

اپ سیٹ ہوں مجھے مزید اپ سیٹ مت کرو۔“

اب کے میرے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”میں..... میں تمہیں اپ سیٹ کر رہی

ہوں؟“

”اوہو پری، بات کی کمال مت اتارنے

لگ جایا کرو، ماما کی طبیعت سنبھالے ہی میں واپس آ

جاؤں گا، میں خود یہاں بہت بے چین ہوں ایک

ایک دن کن کن کر گزرا رہا ہوں اور تم سے دور

نہیں رہا جاتا مجھ سے، میری بھی تو مجبوری سمجھو

ناں میری جان؟“ آخری جملہ اس قدر محبت سے

کہا گیا تھا کہ اس کے سارے شکوے ہوا ہو گئے

تھے۔

”انتظار بہت تکلیف دیتا ہے میرے، میں

تمہارے واپس آنے کی امید میں یہ وقت کس

طرح سے گزار رہی ہوں؟ یہ صرف میں ہی جانتی

ہوں۔“

”میں سب جانتا ہوں پری جان! میرے

بس میں ہوتا بھی اور اسی وقت تمہارے پاس آ

جاؤں، لیکن کیا کروں مجبور ہوں، میں ماما کو اس

حالت میں چھوڑ کر ابھی واپس نہیں آ سکتا، ماما کی

زندگی میں ہمیشہ رشتوں کی کمی رہی ہے ایک بھائی

اور میرے سوالن کا اس دنیا میں اور ہے ہی کون؟

زندگی نے انہیں بہت دکھ دیے ہیں، بہت تکلیفیں

پہنچائی ہیں، میرے مستقبل کی خاطر انہوں نے

بہت قربانیاں دی ہیں، میں..... میں بے بس

ہوں پری، پلیز میری بے بسی کو سمجھنے کی کوشش

کرو۔“ ماں کے لئے اس کے لہجے میں عقیدت

کے سبھی عکس موجود تھے۔

”اور میں جو دکھ تکلیفیں اٹھا رہی ہوں ان کا

ذمہ دار کون ہے؟“

”میں نے بھی تو تمہاری خاطر اپنا سب کچھ

چھوڑا ہے۔“ وہ دکھ سے بولی۔

”پری پلیز، یہ وقت ان باتوں کا ہرگز نہیں

ہے تم خود کو ماما کے ساتھ کپیر مت کیا کرو، میری

زندگی میں تمہارا ایک خاص مقام ہے میں تم سے

بہت محبت کرتا ہوں، نا جانے کیوں تم اتنی جلدی

شاکا ہو جاتی ہو؟“

”میری مجبوریوں کو تم سے بہتر کوئی اور نہیں

سمجھ سکتا۔“ وہ نہایت محبت سے اسے سمجھانے

لگا۔

”اور میری مجبوریوں کو کب سمجھو گے تم؟“

”تمہاری سب مجبوریوں کو میں واپس آ کر

خوشیوں میں بدل دوں گا میری جان، صرف چند

دن۔“ اس کی محبت بھری التجا یہ ہمیشہ کی طرح جلد

ہی اس کا دل پہنچ گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

مرحبت کا فوسو

سونیا چوہدری



تیسرا اور آخری حصہ

سے اپنی شال اور بیگ پکڑتے ہوئے باہر نکلنے لگی۔ جب تیسور نے مضبوطی سے اس کی کلائی تھام لی، اس نے کھاجانے والی نظروں سے تیسور کو گھورا، وہ رائل بلیو کالر کے کپڑوں پر سیاہ شیشوں والی شال اوڑھے بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”تم نے امی سے شادی کے لئے انکار کیوں نہیں کیا؟“ وہ سختی سے لب کھلتے ہوئے بولا تو قاریہ کے لبوں پر دل جلا دینے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی، تیسور کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی تھی۔

”میں نے جو پوچھا اس کا جواب دو یہ مسکرا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو، کہ تم اس رشتے سے بہت خوش ہو؟ میں جانتا ہوں تم نے محض مجھے زچ کرنے کے لئے ہاں کی ہے۔“ وہ اسی سختی سے بولا، لیکن قاریہ اب تک خاموشی سے اسے گھور رہی تھی۔

”جب سب کچھ پتہ ہے تو اپنا اور میرا وقت

اگلے دن وہ خود کو کچھ تر و تازہ محسوس کر رہی تھی، اس نے بیڈ سے اترتے ہوئے ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھا اور وارڈ روب سے کپڑے لیتی ہوئی واش روم میں مہس گئی، شاور لینے کے بعد واپس آئی تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی وہ اپنے بالوں کو میز ڈرائیر کی مدد سے خشک کر رہی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو اس کی نظر تیسور پر پڑی، وہ بنا کوئی تاثر دیتے اپنے کام میں مصروف رہی، تیسور خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا، میز ڈرائیر کو اس نے بند کرتے ہوئے واپس رکھا اور بالوں میں برش کرنے کے بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے ریڈ کلر کی لپ اسٹک اٹھائی اور بڑی مہارت سے اسے نظر انداز کرتی ہوئی لپ اسٹک لگانے لگی۔

لپ اسٹک لگانے کے بعد وہ چلی اور بیڈ

مکمل ناول



”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“
 ”بس ہلکا سا بخار تھا جو اتر گیا، اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔
 ”میں تو کل آپ کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔“ وہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا، وہ دونوں اسی کے آفس کی جانب بڑھ رہے تھے، اس کی بات پر فاریہ نے لمبے بھر کو غصہ کر اسے دیکھا اور پھر سے چلنے لگی۔
 ”آہاں، وہ کیوں؟“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”مجھے لگا۔۔۔۔۔۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔
 ”آپ کو لگا میں مرنے والی ہوں اور اپنی آخری سانسیں گن رہی ہوں۔“ اس کا قہقہہ جاند اتر تھا، لیکن احسن کو اس کی یہ ہنسی کھوٹلی محسوس ہوئی، اس کی بات پر وہ محض اس کو دیکھ کر رہ گیا۔
 ”مجھ جیسے ڈھیٹ انسان اتنی آسانی سے مرنے کے لئے پیدا نہیں ہوتے۔“ وہ آفس کا دروازہ دھکیلتی ہوئی بولی، احسن اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوا۔

”اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔
 ”اللہ کیوں نہ کرے، مجھے کچھ نہ ہونے سے کسے فرق پڑتا ہے؟“ وہ اپنی کرسی کی جانب بڑھتے ہوئے ہنس کر بولی۔
 ”آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔“ احسن الجھ سا گیا۔

”کیسی باتیں؟“ فاریہ نے ابرو اچکا کر پوچھا اور اس کا جواب نہ پا کر ایک بار پھر ہنس دی۔
 ”بیٹھے مسٹر احسن! اور میری باتوں پر اتنا غور و فکر مت کیجئے، چند دنوں میں آپ کی شادی

کیوں ضائع کر رہے ہیں۔“ اس نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے دھیمے مگر جلا دینے والے انداز میں جواب دیا۔

”فاریہ یہ تم اچھا نہیں کر رہی۔“ وہ اس کے سر پر آ کر دوھاڑا تو سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی۔
 ”میں تمہیں۔۔۔۔۔۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور منصورہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔

”ارے تم کہاں جا رہی ہو؟ میں نے تیور کو تمہیں دیکھنے بھیجا تھا لیکن تم تو۔۔۔۔۔۔“

”امی اب یہ بالکل ٹھیک ہے آپ سے کہا نا بس معمولی سا بخار تھا۔“ تیور کا کڑوا لہجہ ان کے سامنے اچانک دھیمہ اور میٹھا ہو گیا، فاریہ کو اس کی اداکاری پر حیرت ہوئی مگر وہ خاموش رہی۔
 ”مجھے ہونٹ کے لئے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ منصورہ بیگم کو مخاطب کرتی ہوئی بولی۔

”اگر تم آج نہ جاتیں تو کون سا قیامت ٹوٹ پڑتی، تھوڑا آرام کر لیتی پیانا۔“ وہ ہلکی سی خفگی سے بولیں۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اب اور بھوک بھی بہت لگی ہے، چلیں چل کر ناشتہ کرتے ہیں۔“ وہ محبت سے ان کو دونوں شانوں سے تھامتے ہوئی کمرے سے باہر لے آئی، تیور کو اس پر مزید غصہ آیا اور وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا زور سے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

تیری آرزو نے مجھ پر قہقہے لگائے
 میری بے بسی نے مجھ پر تالیاں بجا دیں
 وہ ہونٹ کے ریسپشن پر کھڑا شکور صاحب
 سے محو گفتگو تھا جب دفعتاً اس کی نظر فاریہ پر پڑی
 اور وہ اس کی جانب بڑھا۔

ہے اس پر دھیان دیں۔“ اس نے احسن کو کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہی ابھی ان کی والدہ کے انتقال کو زیادہ وقت نہیں ہو تو اتنی جلدی شادی؟“ فاریہ نے میز پر پڑی فائل اٹھاتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

”جی! افشاں کا کوئی خاص رشتے دار نہیں ہے، وہ اور اس کی والدہ ہی ایک دوسرے کا سہارا تھیں اور جو رشتے دار تھے انہوں نے اس کے والد کی وفات کے بعد کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا کہ وہ دونوں ماں بیٹی کس حال میں تھیں، اس لئے میرا اور میرے والدین کا یہی فیصلہ ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے ہم دونوں کا نکاح کر دیا جائے، شادی کی تقریب بہت سادگی سے طے کی گئی ہے، بس قریبی رشتہ دار ہی مدعو ہیں، سادگی سے نکاح ہو گا بس۔“ احسن نے اسے تفصیل سے بتایا تو اس نے بغور اس کو دیکھا اور پھر عجیب سے لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”مجھے بھی انوائٹ نہیں کریں گے؟“

”کیوں نہیں، آپ کو ضرور انوائٹ کروں گا۔“ وہ خوشدلی سے بولا تو فاریہ ایک پھینکی سی مسکان لبوں پہ سجاتے ہوئے مسکرا دی۔

”یہ فائل میں نے چیک کر لی ہے، آپ شکور صاحب کو میرے آفس میں بھیج دیجئے۔“ اس نے فائل احسن کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور آفس سے نکلے گا کہ دروازے پر جا کر رک گیا، فاریہ نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

”اپنا خیال رکھا کریں، آپ کھلکھلاتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں، مہرجانی ہوئی نہیں۔“ اس نے مخلصانہ انداز میں مسکرا کر کہا اور آفس سے نکل گیا، فاریہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

تھا، اس نے خاموشی سے سر کر سی کی پشت سے لگا دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی غم آنکھوں سے ایک دکھ بھری مسکان لبوں پہ سجاتے ہوئے مسکرا دی۔ کیونکہ وہ دشمن جاں کہہ کر گیا تھا وہ کھلکھلاتی ہوئی اچھی لگتی ہے، اس لئے اب اسے مسکرانا تھا، ہمیشہ اپنی نہیں اس دشمن جاں کی خاطر، یہ محبت اس جیسی معصوم کے بس کا روگ تو نہیں محی، لیکن یہ روگ اس نے اپنی مرضی سے پالا تھا اور دل کے روگ لگ جائیں تو ساری عمر بیت جانے کے بعد بھی ساری دنیا کچھ کر لینے کے باوجود بھی، بے شمار دنیا کی محبتیں، مسکراہٹیں سمیٹنے کے بعد بھی اس محبت کے روگ کی کسک کو دل سے کوئی نہیں ختم کر سکتا۔

پہلی محبت کی کسک دل میں کہیں دب تو جاتی ہے لیکن مرنے نہیں سکتی، محبت کا زخم محبت سے بھر جاتا ہے لیکن پہلی چوٹ کا نشان باقی ضرور رہتا ہے، وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب شکور صاحب دروازے پر دستک دیتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا کہا اور ان سے ہونٹ کے متعلق کچھ باتیں ڈسکس کرنے لگی جس کے لئے اس نے انہیں یہاں بلایا تھا۔

☆☆☆

جتنی دعائیں آتی تھیں
سب مانگ لیں ہم نے
جتنے وظیفے یاد تھے
سارے کر بیٹھے ہیں
کئی طرح سے جی دیکھا ہے
کئی طرح سے مرنے بیٹھے ہیں
لیکن جاناں
کسی بھی صورت
تم میرے ہو کر نہیں دیتے

”تیور کو تو بیٹھے بیٹھے اتنی پیاری بیوی ملنے والی ہے۔“ وہ شرارت سے مسکراتی ہوئی بولی تو فاریہ جو کہ خود پر پر فہم چمڑک رہی تھی اس کے حرکت کرتے ہاتھ دفعتاً کھم گئے اس نے عجیب سی نظروں سے مریم کو گھورا اور پھر اپنے دودھیا رنگ پاؤں کو سرخ ہیل میں قید کرنے لگی۔

”تم اتنا اہتمام کر کے اپنے منیجر کی شادی میں جا رہی ہو نا، یا چھپ چھپائے تم نے اور تیور نے خود ہی شادی کرنے کا سوچ لیا ہے۔“ مریم کا قہقہہ کمرے میں گونجا تو وہ جو جک کر اپنی سینڈل بند کر رہی تھی اچانک سیدھی ہو گئی، مریم اسی کو دیکھ کر شرارت سے مسکراتی تھی، وہ بھی نہ چاہتے ہوئے مسکرا دی، اس وقت جس کیفیت سے وہ گزر رہی تھی اسے مریم کی موجودگی اور اس کا یوں بولنا دونوں اچھا نہیں لگ رہا تھا، لیکن وہ خاموشی سے سب کچھ سہی رہی۔

جب وہ پوری دل و جان سے تیار ہو گئی تو اس نے ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھا، وہ شاید پہلی بار اتنا تیار ہوئی تھی اور ہونی بھی کیوں نا، اسے دکھانا تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی ہے، والدین کے مرجانے پر اس نے بہت صبر و ہمت سے کام لیا تھا، لیکن آج وہ اپنی محبت کا جنازہ پڑھنے جا رہی تھی، اہتمام اس پر لازم تھا، وہ اس محبت کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں دفن کرنے جا رہی تھی جو کسی خواب کی صورت اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پلک جھپکنے پر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا اور چونکہ خواب اسی نے دیکھا تھا تو اپنے ٹوٹے خواب کی کرچیاں بھی اسے خود ہی چینی تھیں۔

”مجھے یاد آیا باہر تو بارش ہو رہی ہے تم جاؤ گی کس کے ساتھ؟“ مریم اچانک سنجیدہ ہوئی۔

”کیا بارش ہو رہی ہے؟“ وہ باہر کے موسم

مریم کی شادی اپنے پھوپھو زاد کزن سے ہوئی تھی جو کہ فیصل آباد میں رہائش پذیر تھے، اس لئے وہ اتنی دور سے اپنے میکے زیادہ نہیں آئی تھی، لیکن اس بار اسے منصورہ بیگم نے خود فون کر کے بلایا تھا، وہ اپنے خاوند فیروز کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے اپنی امی کی طرف چلی آئی، فیروز تو ایک دن کے بعد واپس چلا گیا لیکن مریم اور اس کا سات ماہ کا چھوٹا سا کیوٹ سا بچہ کچھ دن کے لئے وہیں ٹھہر گئے۔

فاریہ اور مریم کی اچھی خاصی دوستی تھی اور مریم نے جب سے تیور اور فاریہ کے رشتے کے پارے میں سنا تھا وہ خوشی سے کھل کھل جا رہی تھی۔

”تم کہیں جا رہی ہو؟“ مریم نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں، ہوٹل کے منیجر ہیں نہ ان کا نکاح ہے آج، تو وہیں جا رہی ہوں۔“ فاریہ نے آنکھوں پر مسکارا لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”آہاں، یہ کلر تم پر بہت کھل رہا ہے۔“ مریم نے اسے سرخ لائٹ فرائم میں لمبوس دیکھتے ہوئے دل سے کہا جس پر سلور رنگ کا کام بہت نفاست سے کیا گیا تھا۔

”شکریہ۔“ وہ اس کی تعریف پر ہلکا سا مسکرائی، اس نے اپنی مخصوص سرخ لپ اسٹیک پکڑی اور لگانے لگی، وہ اکثر یہی لپ اسٹیک لگاتی تھی اور اس کی سفید رنگت پر خوب ججٹی بھی تھی، فاریہ نے بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا جو اس کی شخصیت کو مزید پروقار بنا رہا تھا، مریم بغور اسے دیکھنے لگی۔

”ماشاء اللہ، تم بہت پیاری ہو فاریہ۔“ مریم نے مہر پورا انداز میں تعریف کرنی چاہی۔

سے شاید انجان تھی وہ جب کمرے میں لوٹی تھی تو موسم ٹھیک تھا، بادل بنے تھے لیکن ان کے برسنے کے امکانات کم ہی نظر آ رہے تھے، اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

”گل خان یہیں ہے کہ اپنے کوارٹر میں جا چکا؟“ فاریہ نے ڈرائیور کے بارے میں پوچھا تو مریم نے کندھے اچکا دیے۔

”میں تو ہادی کو لئے امی کے پاس بیٹھی تھی انہوں نے بتایا تھا تم کسی کی شادی پر جا رہی ہو تو میں تمہیں دیکھنے چلی آئی، کہ تم تیار ہو گئیں کے نہیں۔“

”کوئی بات نہیں میں خود چلی جاتی ہوں۔“ وہ باہر کی جانب بڑھتی ہوئی بولی تو مریم بھی اس کے پیچھے چلی آئی، منصورہ بیگم ہادی کو گود میں لئے آتش دان کے پاس بیٹھیں اس سے لاڈ کر رہی تھیں جب دفعتاً ان کی نظر فاریہ پر پڑی اور وہ ماشاء اللہ کہے بنا نہ رکھیں۔

”بہت پیاری لگ رہی ہے میری بیٹی۔“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے محبت سے بولیں۔

”اللہ نظر بد سے بچائے۔“ انہوں نے مدھم لہجے میں کہا۔

”نظر تو کب کی لگ چکی خالہ جانی، نہ جانے کس کی۔“ وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی۔

”خالہ جانی میں جا رہی ہو، گل خان شاید جا چکا ہے اور میں خود چلی بھی جاؤں گی اور واپس بھی آ جاؤں گی آپ فکر مت کیجئے گا۔“

”لیکن بیٹا تم اس وقت اکیلی جاؤ گی، باہر بارش بھی ہو رہی ہے۔“ وہ فکر مندی سے بولیں۔

”اُس اوکے خالہ جانی، آپ جانتی نہیں کیا آپ کی بھانجی بہت بہادر ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئی بولی۔

”ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم کچھ دیر رک جاؤ، تیور آنے والا ہے وہ تمہارے ساتھ چلا جائے گا۔“ وہ ان کی بات پر سخت بد مزہ ہوئی۔

”نہیں خالہ، میں خود سے چلی جاؤں گی، وہ تھکے ہارے آئیں گے اور پھر میں انہیں کہاں اپنے ساتھ لئے گھوموں گی۔“ اس نے اس کی ہمدردی دکھا کر اس سے جان چھڑوانا چاہی تو مریم جو خاموش گھڑی تھی اچانک شرارت سے بولی۔

”آئے ہائے ابھی سے ان کا اتنا خیال۔“ منصورہ بیگم بھی مسکرا دیں۔

”اگر کوئی مسئلہ ہوا تو واپسی پر تیور کو کال کر لینا وہ آجائے گا۔“ منصورہ بیگم نے تاکید کی تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی باہر گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

خزاں کے موسم کی سردشائیں
سیراب یادوں کے ہاتھ تھامیں
کبھی جو تم سے حساب مانگیں
یا یوسیوں کے نصاب مانگیں
بے نور آنکھوں سے خواب مانگیں
تو جان لینا خواب سارے

میری حدوں سے نکل چکے ہیں
تمہاری چوکھٹ پر آر کے ہیں
مسافتوں سے تھکے ہوئے ہیں
غبار راہ سے اٹے ہوئے ہیں
تمہاری گلیوں میں چپ کھڑے ہیں
کچھ اس طرح سے ڈرے ہوئے ہیں
سوالی نظروں سے نک رہے ہیں
تمہاری چوکھٹ پہ جانے کب سے
جیں جھکائے ہوئے ہیں

وہ احسن کے گھر پہنچی تو اس کی والدہ نے گرم جوشی سے فاریہ کا استقبال کیا، وہ مسکراتی

باکس میں سے اس کا دیا گیا تحفہ نکالا۔
 ”شیشے کا تاج محل..... واؤ..... اس رائلی
 بیوٹی فل۔“

”جانتی ہو یہ میں نے تمہیں کیوں دیا؟“
 فاریہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا
 تو افشاں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تاج محل کی داستان تو بچہ بچہ جانتا ہو گا،
 لیکن مجھے تم دونوں کے لئے کوئی تحفہ پسند ہی نہیں
 آ رہا تھا، پھر اچانک میری نظر اس تاج محل پر
 پڑی، پھر مجھے خیال آیا، دو محبت کرنے والوں کو
 اس سے بڑھ کر کون سا تحفہ پسند آ سکتا ہے، ویسے
 اس سے ہٹ کر بھی میں تمہارے لئے کچھ لائی
 ہوں۔“ وہ دفعتاً اپنے بیک میں کچھ ٹٹوتی ہوئی
 بولی، افشاں نے اس کو دیکھا اور بس کئی لمبے پونہ
 دیکھتی رہی، نہ جانے اس میں ایسی کون سی کشش
 تھی کہ افشاں چاہ کر بھی اس سے نظریں نہیں ہٹا پا
 رہی تھی۔

”یہ تمہارے لئے۔“ اس نے ایک
 خوبصورت سا گولڈ کا میٹکس اس کی جانب
 بڑھایا، افشاں کو اس کا یہ گفٹ حیرت میں مبتلا کر
 گیا۔

”یہ میں نہیں لے سکتی، یہ تو بہت قیمتی
 ہے۔“ وہ بے حد معصومیت سے بولی تھی، فاریہ کو
 اس پر بے حد پیار آیا، آتا بھی کیسے نا، آخر وہ اس
 کی محبت کی محبت تھی۔

”قیمتی تحفے نہیں دینے والوں کے جذبات
 اور احساسات ہوتے ہیں، مجھے بہت خوشی ہوگی
 اگر تم یہ لوگو تو۔“ وہ نرمی سے بولی۔
 ”لیکن۔“ وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

”لیکن کیا؟“
 ”میں احسن سے پوچھے بنا اتنا مہنگا تحفہ
 آپ سے نہیں لے سکتی۔“ وہ نظریں جھکا کر

ہوئی گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئی جہاں
 مہمان تو تھے مگر بہت کم تعداد میں، احسن کی والدہ
 نے اسے احسن کے والد اور اس کی بہن سے بھی
 ملوایا، وہ ان سب سے ملاقات کے بعد احسن کی
 امی سے کہہ کر افشاں کے پاس چلی آئی، افشاں
 اسے دلہن بنی بہت پیاری لگی، اس نے آگے بڑھ
 کر افشاں کو گلے لگایا اور بے حد دعاؤں سے
 نوازا، افشاں نے ہلکی سی مسکان لیوں پہ جاتے
 ہوئے فاریہ کو دیکھا۔

”تمہیں شاید احسن میرے بارے میں بتا
 چکے ہوں گے۔“ افشاں نے اثبات میں سر ہلایا تو
 وہ خوشدلی سے مسکرائی۔

”تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ فاریہ نے
 دل سے اس کی تعریف کی۔

”لیکن آپ سے کم۔“ وہ افشاں کا جواب
 سن کر بے ساختہ قہقہہ لگائی ہوئی ہنس دیں۔

”آہ۔“ آخر کب تک اب اس کے کھوکھلے
 قہقہے ان فضاؤں کو برداشت کرنے تھے، کاش
 اس کی ہنسی کے پیچھے چھپے درد کو کوئی سمجھ سکتا۔

”دلہن تم ہو اور شادی پر دلہن سے زیادہ کوئی
 بھی پیارا نہیں لگ سکتا۔“ وہ ہنستی ہوئی بولی۔

”ایسا کس نے کہا؟“ افشاں نے معصومیت
 سے پوچھا۔

”فاریہ نے۔“ وہ ہلکی سی سرگوشی کرتی ہوئی
 بولی تو افشاں اس کے انداز پر مسکرا دی۔

”میں تمہارے لئے کچھ لائی تھی، ایک چھوٹا
 سا تحفہ۔“ فاریہ نے گفٹ اس کی جانب بڑھایا۔

”اس میں کیا ہے؟“ افشاں نے تجسس
 سے پوچھا۔

”محمول کر دیکھو۔“ فاریہ دوستانہ انداز میں
 مخاطب تھی جیسے دونوں کی بہت پرانی دوستی ہو،
 افشاں نے آہستہ آہستہ گفٹ پیر کر اٹارا تو ایک

”لیکن آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا۔“ وہ

بولی۔

جلدی سے بولا۔

”کھانا چھوڑیں، آپ سے تو بڑی ٹریٹ لوں گی، آپ بس چنچیاں گزار کر واپس ڈیوٹی پر تو پہنچیں۔“ وہ شرارت سے مسکاتی تو احسن بے ساختہ تہقید لگاتا ہوا ہنس دیا۔

”او کے اپنا اور افشاں کا بہت خیال رکھیے گا۔“ جانے سے پہلے وہ احسن کے گھر والوں سے بھی ملی، سب نے اس کو رکنے پر اصرار کیا لیکن وہ موسم کا بہانہ بنا کر وہاں سے نکل آئی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو سب لوگ سو چکے تھے، اس نے ایک نظر کلانی پر بندھی ٹھہری پر ڈالی، رات بارہ بج چکے تھے، اپنے کمرے میں آ کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی، کتنی دیر وہ یونہی صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی، پھر اچانک اسے اپنا دم گھٹنا محسوس ہوا تو کمرے سے باہر چلی آئی۔

باہر ہلکی ہلکی بارش اب تیز ہو چکی تھی، اس نے ابھی تک پاؤں سے میل والی سینڈل بھی نہیں اتاری تھی، وہ اٹھ کر باہر لان میں چلی آئی، بارش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ وہ چند ہی لمحوں میں پوری بھج گئی، وہ لان میں رکھے لکڑی کے بیچ پر آ بیٹھی، سردی کی شدت کا احساس جیسے اسے چھو کر بھی نہیں گزر رہا تھا۔

وہ یونہی غائب دماغی سے بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی تھی، اس کا کاجل اور سارا مسکارا اس کی آنکھوں کے گرد پھیل گیا، لبوں پہ کچھ دیر پہلے والی ریڈ لپ اسٹک آہستہ آہستہ پھینک پڑنے لگی، گیلیے بالوں کی چند موٹی موٹی لٹیں اس کے چہرے سے لپٹی ہوئی تھیں، اس نے اپنے پاؤں سینڈل سے آزاد کیے اور سینڈل کو ہوا میں اچھلتے ہوئے دور پھینک دیا۔

”اوہ تو بس اتنی سی بات ہے، میں احسن سے بات کر لوں گی، تم اس کو پاس رکھ لو، احسن اجازت دے تب استعمال کر لیتا۔“ اس نے چنگیوں میں اس کا مسئلہ حل کر دیا تو وہ ایک بار پھر مسکرا دی، وہ اس سے مزید باتیں کرنا چاہتی تھی جب کچھ لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں، شاید وہ اس کو اسٹیج پر لے جانے کے لئے ہی آئی تھیں، قاریہ اٹھ کر باہر چلی آئی، احسن سامنے اپنے دوستوں میں کھڑا تھا جب قاریہ کو دیکھتا ہوا فوراً اس کی جانب بڑھا۔

”شادی مبارک۔“ قاریہ نے گلاب کا بکے اس کی جانب بڑھایا، وہ بکے افشاں کو بھی دے سکتی تھی، لیکن پھولوں کا یہ گلہستہ اس نے اس دشمن جان کے لئے ہی خریدا تھا، احسن نے خوشدلی سے مبارکباد قبول کی۔

”میں نے افشاں کو ایک گفٹ دیا ہے، پلیز اس کو کہنا کہ وہ رکھ لے، مجھ بہت خوشی ہوگی۔“ قاریہ نے اس التجائی انداز میں کہا کہ احسن کو تجسس ہوا کہ ایسا کیا دے دیا۔

”کچھ زیادہ نہیں ہے، بس کوئلہ کا برہ سلت ہے اور میں نے اپنی خوشی سے دیا ہے۔“ وہ احسن کے تجسس کو بھانپتے ہوئے بولی۔

”لیکن اس کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”تجسس ضرورت دیکھ کر نہیں دیئے جاتے، بنا غرض، بس یونہی، اپنی خوشی سے دوسروں کی خوشی کی خاطر دیئے جاتے ہیں۔“ وہ اس کی بات پر مسکرا دیا۔

”اب میں چلتی ہوں، ٹائم کافی ہو گیا ہے اور موسم بھی خراب ہے۔“ وہ احسن سے اجازت طلب کرتی ہوئی بولی۔

سیدھی طرح مرکیوں نہیں جاتیں۔“ وہ غصے سے دھاڑا۔

”کیسے مروں، بتاؤ مجھے کیسے مروں، کوئی زہر کھالوں، کسی پہاڑ سے کود جاؤں، یا کسی گن سے خود کو شوٹ کر لوں۔“ وہ پوری قوت سے چلائی تھی، تیمور ایک دم اس کے اس انداز پر خاموش ہو گیا۔

”ہاں مر جانا چاہیے مجھے..... آپ دعا کیوں نہیں کرتے کہ میں مر جاؤں..... میں زندہ کیوں ہوں، کس کے لئے ہوں، کون ہے جس کو میرے ہونے یا نہ ہونے سے فرق پڑتا ہے، کوئی بھی تو نہیں، پھر مجھے مر ہی جانا چاہیے، مجھے مر جانا چاہیے۔“ وہ بولتے بولتے ایک بار پھر رو دی۔

”تیمور! میں مرنا نہیں چاہتی..... میں جینا چاہتی ہوں..... مجھے مرنا نہیں ہے..... نہیں مرنا..... نہیں مرنا۔“ وہ بند آنکھوں سے سرفی میں ہلانے لگی، تیمور کو اس کی اس حالت سے عجیب وحشت کا احساس ہوا۔

”مجھے مر جانا چاہیے..... ہاں مر جانا..... مر جانا چاہیے.....“ وہ جھول کر زمین پر گر جاتی اگر تیمور اسے نہ تھام لیتا، اسے جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑا تھا، وہ اسے لے کر کمرے میں آیا اور اس کے بستر پر لیٹا دیا، وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑا رہی تھی۔

”امی..... امی آپ بھی چلی گئیں، ابو بھی، اور اب احسن بھی، ہاں احسن بھی مجھے چھوڑ گیا، تیمور..... تیمور کہتا ہے مرکیوں نہیں جانی، مر جانا چاہیے،..... ہاں مر جا..... نا..... چاہ۔“ اس کی بڑبڑاہٹ کی آواز آنا بھی بند ہو گئی، تیمور کا دل عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا۔

”احسن..... قاریہ۔“ اس کی سوچ ان دو ناموں پر اٹک گئی تھی۔

وہ زار زار رونے لگی، بارش اور تیز ہوا کے شور میں اس کی آواز اندر نہیں جاسکتی تھی، لاؤنج کا دروازہ بھی بند تھا اور سب لوگ سو رہے تھے، جاگ بھی رہے ہوتے تو اس وقت اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی، وہ رونا چاہتی تھی اور وہ رو رہی تھی، جی بھر کر، اوپر کھڑکی سے جھانکتے تیمور نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا، وہ کچھ سوچنا سمجھنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ اسے سوچے سمجھے بنا اس وقت اس کی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا، وہ نیچے لان میں چلا آیا، قاریہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے پھر سے نظریں جھکا لیں، وہ دونوں بارش میں بیگ رہے تھے، سرد ٹھنڈی بخ ہوا ان پر کوئی اثر نہیں چھوڑ رہی تھی، تیمور خاموشی سے اس کو گھورتا رہا، گھورتا رہا، لیکن اس نے دوبارہ تیمور کی جانب نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، روتے روتے جب تھک گئی تو اس نے کندھے سے سر کتا دوپٹہ درست کیا اور اٹھ کر اندر جانے لگی کہ تیمور نے مضبوطی سے اس کی کلائی تھامی، وہ اس وقت اس سے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی، اس نے خاموش نگاہوں سے تیمور کو دیکھا جیسے اس کی خاموش نظریں اس سے التجاء کی رہی ہو۔

”ابھی نہیں، خدا کا واسطہ ابھی نہیں، میں ابھی کچھ سننا اور کہنا نہیں چاہتی، مجھے جانے دو، جانے دو۔“ لیکن تیمور نے اس کی خاموش نگاہوں کو نظر انداز کر دیا۔

”تم ایسی حرکتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟“ وہ سختی سے بولا لیکن وہ خاموش رہی۔

”بیمار تم پڑنی ہو پریشان میری ماں ہو جاتی ہے اور پھر ان کی خوشی کی خاطر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے تمہارے آگے پیچھے چکر کاٹنے پڑتے ہیں نا چاہتے ہوئے بھی تمہارا خیال رکھنا پڑتا ہے، تمہیں مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ایک ہی بار

”فاربیہ، احسن کو.....“ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، وہ جانتا تھا ابھی وہ اس کے نکاح کا فنکشن اینڈ کر کے لوٹی تھی، وہ اس کی جانب بڑھا..... اور اسے، اس پر مبل اوڑھا دیا، پھر اس نے اس کو ایک انجکشن دیا اور پانی میں اس کی میڈیسن گھول کر اس کو نیم بے ہوش کی حالت میں ہی ملا دی، کیونکہ اس وقت وہ میڈیسن کھانے کی پوزیشن میں نہیں تھی تو اسے ایسا کرنا پڑا۔

خود اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ لگانے لگا، کتنی ہی دیر وہ پونہ بیٹھا اس کو گھورتا رہا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا، پھر جب اس پر نیند حاوی ہونے لگی تو اٹھ کر اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔

☆☆☆

ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں کی دل درد سے بوجھل ہو تو پھر نیند کہاں کی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے مزاج پر عجیب بوجھل پن طاری تھا، اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو سر میں اٹھتی درد کی شیشیں اسے دوبارہ لیٹنے پر مجبور کر گئیں، اس کا سر بھاری ہو رہا تھا، شاید اسے پھر سے بخار ہو گیا تھا، اس نے ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھنا چاہا اور اس بار وہ کامیاب ہو گئی، بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھی تو اس نے اپنے کپڑوں کو دیکھا، وہ رات کو پہنچ کیے بنا ہی سو گئی تھی، سو گئی تھی، دفعتاً اسے سونے سے پہلے کا منظر یاد آیا، وہ تو لان میں تھی، بارش میں بیٹھی اپنی محبت کا ماتم منار ہی تھی جسے وہ کل رات ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں دفن چکی تھی، پھر وہ کمرے میں کیسے پہنچی۔

تیمور! ہاں تیمور آیا تھا، وہ اس سے جھگڑی بھی تھی تو اور وہ بھی اس پر سخت غصہ ہو رہا تھا،

دونوں میں ہلکی پھلکی جھگڑا ہوئی تھی اور پھر..... پھر اس سے آگے کچھ یاد نہیں رہا، اس نے اپنا سر گھٹنوں پر ٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی جب مریم ہادی کو اٹھائے اس کے کمرے میں داخل ہوئی، فاربیہ نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

”جب تک سوئی رہو گی، دوپہر کا ایک بجتے والا ہے۔“ مریم نے اس کی توجہ گھڑی کی جانب کرواتے ہوئے یقین نہ آیا کہ وہ اتنی دیر تک سوئی رہی ہے۔

”کسی نے جگایا کیوں نہیں، ہوٹل جانا تھا مجھے۔“ وہ جلدی سے بیڈ سے اترتے ہوئے بوجھل آواز میں مخاطب ہوئی۔

”امی نے منع کیا تھا کہ ہو سکتا ہے تم رات کو دیر سے آنے کی وجہ سے تھک گئی ہو اور آج چھٹی کرنے کا ارادہ ہو۔“ مریم نے نرمی سے بتایا۔

”نہیں میرا چھٹی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“ وہ وارڈ روب سے کپڑے نکال رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ مریم نے اس کو فضا بہت بھری آواز میں بولتے ہوئے محسوس کیا تو کہے بنا رہ نہ سکی۔

”ہاں بس تھوڑا سا نمپر بچر ہے، ابھی میڈیسن لینے سے ٹھیک ہو جائے گی۔“ فاربیہ نے واش روم کی جانب بڑھتے ہوئے لا پرواہی سے کہا۔

”فاربیہ تم اپنا بالکل دھیان نہیں رکھتی، اپنا خیال کیا کرو۔“ مریم نے سنجیدگی سے کہا لیکن وہ مسکرا کر واش روم کا دروازہ بند کر گئی، مریم بھی اس کو مسکراتا دیکھ کر ہنس دی اور کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

تیار ہو کر باہر نکلی تو منصورہ بیگم کچن میں

بولیں تو مریم فٹ سے بولی۔

”امی اس سے کیا پوچھ رہی ہیں اب، آپ بس جلد از جلد شادی کی تاریخ طے کریں۔“ فاریہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ بول سکی۔

”ہاں میں نے بھی یہ ہی سوچا ہے کہ اب اس ایچھے کام میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔“
”خالہ جانی مجھے کچھ کہنا تھا۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”ہاں بولو۔“

”وہ میں چاہتی ہوں کہ میں اب اپنے گھر جا کر رہوں، جب تک شادی نہیں ہو جاتی میں وہیں رہتا چاہتی ہوں۔“ منصورہ بیگم نے اسے گھورا اور پھر مریم اور وہ ایک ساتھ قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس دی۔

”دیکھو تو کتنی سمجھدار ہے ہماری بیٹی، ابھی سے اپنے ہونے والے دو لہے سے پردہ کرنے کا سوچ رہی ہے۔“ مریم کو بھی اس پر پیار آ گیا، مگر وہ کیا بتانی کے وہ کچھ تنہا رہتا چاہتی ہے، جہاں اسے سکون کے کچھ لمحے درکار ہوں، جہاں کسی کی ہنسی کی آواز ہو اور نہ ہی کسی کے غصے کا خوف بس وہ اور اس کی تنہائی ہو۔

”اوکے تم چلی جانا۔“ منصورہ بیگم نے اسے جانے کی اجازت دی تو اسے لگا اسے کچھ دنوں کے لئے آزادی مل گئی ہے۔

”لیکن آج تم کہیں نہیں جاؤ گی، آج سارا دن تم ہمارے ساتھ ہی گزارو گی۔“ مریم نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلائی ہوئی کچن سے نکل آئی۔

☆☆☆

وہ ہوٹل نہیں گئی تھی لیکن شکور صاحب کو کال کر کے گا ہے لگا ہے سب معاملات کی خبر لیتی رہی تھی، احسن کے بعد ہوٹل کی ساری ذمہ داری

خانساں کے ساتھ خود وہ پھر کے کھانے کی تیاری کروا رہی تھی، اس نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے منصورہ بیگم کو سلام کیا اور اپنے لئے فریش جوس گلاس میں ڈالنے لگی جو شاید ابھی منصورہ بیگم نے ہی بنا کر میز پر رکھا تھا۔

”لگتا ہے بہت تھک گئی تھیں رات کو۔“ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

”جی شاید۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”اب کہیں مت جانا میں نے خود تمہارے لئے خاص فورمہ بنایا ہے، تمہیں پسند ہے نا۔“ وہ اس کی جانب مڑتی ہوئی بولیں۔

”پسند تو بہت ہے لیکن مجھے ہوٹل جانا ہے۔“ فاریہ نے جوس کا گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ایک دن تمہارے ہوٹل نہ جانے سے کسی کام میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی، بس تم آج کہیں نہیں جاؤ گی۔“ انہوں نے جیسے اپنا فیصلہ سنا کر بات ہی ختم کر دی، وہ خاموش ہو گئی۔

”مجھے تم سے ایک بات بھی کرنی ہے۔“ وہ اس کے قریب چلی آئیں، فاریہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میں نے کل طاہر کو فون کیا تھا، اسے تمہارے اور تیمور کے رشتے کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ تم دونوں کو اس رشتے سے کوئی اعتراض نہیں، تو پھر وہ کہنے لگا جب فاریہ کو اعتراض نہیں تو کسی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔“ ان کے لہجے میں خوشی جھلک رہی تھی۔

”تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟“ وہ مسکراتی ہوئیں اسے پوچھنے لگیں۔

”کس بارے میں؟“ وہ نا سنجھی سے بولی۔

”ارے شادی کے بارے میں اور کس بارے میں؟“ وہ اسے یاد دلاتے ہوئے ہنس کر

چائے بنوائی ہوں۔“

”نہیں مجھے فاریہ کے ہاتھ سے بنی چائے پینی ہے۔“ وہ لاہروائی سے بولا، فاریہ کچھ کہے بنا کچن میں چلی آئی اور غصے سے برتن شیخ شیخ کر اس کے لئے چائے بنانے لگی۔

”تیوریہ کیا طریقہ ہے؟“ منصورہ بیگم نے اسے گھورا۔

”امی وہ میری ہونے والی بیوی ہے، اب کیا میں اس سے چھوٹی سی فرمائش بھی نہیں کر سکتا، ایک کپ چائے بنانے کو ہی تو بولا ہے کون سا کسی پھاڑ سے کوئی نہ کی فرمائش کر ڈالی ہے۔“ وہ معصوم بننا ہوا بولا تو منصورہ بیگم مسکرا دیں۔

وہ اتنا سن کر ہی خوش ہو گئی تھیں کہ اس نے فاریہ کو اپنی ہونے والی بیوی قبول کر لیا تھا، لیکن دلوں کے حال بے شک رب ہی جانتا ہے۔

☆☆☆

وہ اپنے گھر لوٹ چکی تھی، جہاں کی درو دیوار سے اسے بے پناہ محبت تھی، جہاں اسے اپنے ہنسنے کھلکھلانے کی صدا میں سناٹی دیتی تھیں، لان میں بھاگتی چھوٹی سی فاریہ اپنا بال لئے بھاگ رہی ہے اور اس کو پکڑنے کے لئے اس کے بابا اس کا چچھا کر رہے ہیں، وہ با آسانی اسے پکڑ سکتے ہیں لیکن وہ اسے پکڑنا نہیں چاہتے، چاہتے وہ بھاگے، بھاگتی رہے، ڈر کے، سہم کے ان کے ہاتھ نہ آئے، وہ ان کو اپنے پیچھے بھاگا کر تھکا دیتی ہے اور وہ ہانپتے ہوئے نیچے گھاس پر ہی بیٹھ جاتے ہیں، وہ کسی معصوم کلی کی طرح کھلکھلا کر اُس رہی ہے اور اس کے بابا اسے ہنسا دیکھ بہت خوش ہو رہے ہیں، وہ لان میں اپنا بچپن دیکھ رہی تھی، کھلی آنکھوں سے حسین یادگار لمحوں کو خواب کی صورت یاد کر رہی تھی۔

”بابا آپ نے مجھے اتنا بھاگنا کیوں سکھایا

شکور صاحب پر ہوتی تھی، اس وقت بھی شکور صاحب کو کال کر کے لان سے اندر جا رہی تھی، جب دفعتاً اس کی نظریں تیمور سے ملیں اور اس نے دوسرے ہی لمحے اپنی نظریں پھیر لیں، وہ شاید ہوسپٹل سے آیا تھا، اس نے فاریہ کو مخاطب کئے بنا لاؤنج کی جانب بڑھ گیا، جہاں مریم ہادی کو سلانے کے بعد اب منصورہ بیگم کے ساتھ شام کی چائے پی رہی تھی، فاریہ کی چائے کا کپ سامنے میز پر ہی رکھا تھا، تیمور نے ان کو سلام کیا اور صوفے پر براجمان ہو گیا، فاریہ اس کے پیچھے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی، تیمور نے کسی سے کچھ کہے بنا میز سے چائے کا کپ اٹھالیا جو کہ فاریہ کا تھا۔

”یہ فاریہ کا ہے، میں تمہیں اور بنا دیتی ہوں۔“ مریم جلدی سے بولی۔

تیمور نے کپ کو آگے پیچھے گھما کر دیکھا اور آنکھوں میں بے حد حیرت لئے اک ادائے بے نیازی سے بولا۔

”مجھے تو کہیں فاریہ کا نام نظر نہیں آ رہا۔“

مریم کو اس کی بات پر ہنسی آگئی، فاریہ کو برا لگا۔

”فاریہ!“ وہ جواب ان میں بیٹھنے کی بجائے اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر چکی تھی تیمور کی آواز پر ٹھہر گئی۔

”جاؤ میرے لئے ایک کپ چائے کا بنا کر لاؤ۔“ تیمور نے پہلے والا کپ واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا، اس کے اس حکم پر منصورہ بیگم اور مریم دونوں نے تیمور کو گھورا، فاریہ اب تک وہیں کھڑی تھی۔

”فاریہ میرے لئے ایک کپ چائے بنا کر لاؤ۔“ تیمور نے اپنی بات دہرائی تو منصورہ بیگم فوراً بولیں۔

”میں خانساں سے کہہ کر تمہارے لئے

لئے روانہ ہوئی، آدھے گھنٹے کا راستہ اس نے فل اسپڈ سے دس سے پندرہ منٹ میں طے کیا، فائر بریگیڈ، ایسولینس، پولیس کی گاڑیوں کے سائرن اس کے کانوں میں جیسے کسی ہتھوڑے کی آواز کی طرح پڑ رہے تھے، جس کی آواز سے اسے عجب وحشت ہو رہی تھی، وہ جلدی سے گاڑی سے نکلے، ہوٹل کے باہر عجیب ہڑبونگ مچی تھی، لوگوں کے ہجوم کو پار کر رہی ہوئی وہ ہوٹل کے لابی تک پہنچی، وہ اندر جا رہی تھی، لیکن ایک پولیس آفیسر نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔

”چھوڑیں مجھے، میں اس ہوٹل کی مالکن ہوں، مجھے اندر جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ وہ طیش کے عالم میں چلائی، پولیس آفیسر سے اس کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ اپنے سامنے اپنے بابا کی محنت کو جلتا نہیں دیکھ سکتی تھی، وہ خود کو ایک جھٹکے سے پولیس آفیسر کی گرفت سے آزاد کرواتی ہوئی اندر کی جانب بھاگی، پولیس آفیسر اس کے پیچھے لپکا مگر آگ کے شعلے اڑا کر باہر آ رہے تھے، وہ وہیں رک گیا، اس نے واکی ٹاکی نکال کر دوسرے پولیس آفیسر کو فاریہ کے بارے میں مطلع کیا تو فائر بریگیڈ کی ٹیم کے دو لوگ اس کی مدد کے لئے اندر بھیجے گئے، ہوٹل پوری طرح جل چکا تھا، وہ یہاں سے وہاں دیوانہ وار چکر کاٹ رہی تھی، جیسے یہ سب ایک بھیاںک خواب تھا، وہ ایسا کچھ ہونے کا تصور بھی نہیں سوچ سکتی تھی، آگ کی تپش سے وہ پسینے میں ڈوب چکی تھی، وہ بھاگتی ہوئی بنا کسی ڈر خوف کے اپنے بابا کے آفس کی جانب بڑھی، ان کے آفس کا دروازہ پوری طرح جل کر نیچے گر چکا تھا وہ اندر نہیں جا سکتی تھی، راستے میں آگ کے سرخ نارنجی شعلے بھڑک رہے تھے، لیکن اس کو پرواہ کب تھی، وہ پاگلوں کی طرح بنا سوچے سمجھے

کہ اب میں خود بھی بھی بھاگتی ہوں۔“ اس نے غم آگھوٹوں سے سوچا۔

”میں سوچتا تھا میری بیٹی بھاگنا سیکھے، زندگی کی ہر دوڑ میں اسے کامیابی حاصل ہو، خواہ وہ دوڑ پھر خوشیوں کو پکڑنے کی ہو یا غموں سے چھٹکارا پالنے کی، تمہیں ہارنا نہیں، تمہیں چلتے رہنا ہے، بھاگتے رہنا ہے، جو چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں وہ لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں اور تمہیں گرنا نہیں پڑتا، تم میری بہت بہادر بیٹی ہو۔“ اسے جیسے دور نہیں آسمانوں سے اپنے بابا کی آواز سنائی دی، اس نے نظر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا، سفید، نیلا آسمان، پرندوں کے غول اڑتے شاید اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے، وہ سوچوں میں ڈوبی تھی جب ملازمہ نے اسے نرم آواز میں پکارا۔

”بی بی صاحبہ! آپ کا فون کب سے اندر بج رہا تھا۔“ ملازمہ نے فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے سیل لے لیا اور ملازمہ واپس پلٹ گئی۔

شکور صاحب کی چار مسڈ کالز، اس نے فوراً بیک کال کی، پہلی ہی تیل پر کال ریسیو کی۔

”ہیلو میڈم!“ شکور صاحب کا پی پریشان لگ رہے تھے، ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔

”جی شکور صاحب سب ٹھیک تو ہے۔“

اسے شکور صاحب کے پیچھے سے بہت شور کی آوازیں آرہی تھیں وہ کیا بول رہے تھے اسے کچھ ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہا تھا۔

”میڈم! ہوٹل میں آگ لگ گئی ہے، آگ لگ گئی ہے ہوٹل میں۔“ وہ ایک جملہ بار بار دہرا رہے تھے، فاریہ کو آگ کے نام سے ہی کسی وحشت نے آن گھیرا، وہ جلدی سے اٹھی اور کمرے سے گاڑی کی چابی لیتے ہوئے ہوٹل کے

اس دروازے کو کود کر عبور کرتی ہوئی اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔

”میں یہیں رہوں گی کہیں نہیں جاؤں گی، میں مرجاؤں گی، لیکن اپنے بابا کی محنت کو رائیگاں نہیں ہونے دوں گی، میں باہر نہیں جاؤں گی۔“ اسے ایک بار پھر ہسٹریا کا دروہ پڑ چکا تھا۔

وہ آفس میں بڑے ایک میز کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئی کہ اسے کوئی تلاش نہ کر سکے، ہول میں آگ لگنے کی خبر منسورہ بیگم تک بھی پہنچ چکی تھی، ان کی تو اتنی ہولناک خبر سنتے ہی طبیعت بگڑ گئی، مریم نے تیمور کو فون کر کے بتایا تو وہ ہسپتال سے سیدھا ہول پہنچ گیا، اس نے شکور صاحب سے فاریہ کا پوچھا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بتانے لگے کہ وہ کس طرح پولیس آفیسر کو جھکا دے کر اندر چلی گئی، شکور صاحب کا بازو بری طرح جلا تھا، جس پر انہیں مرہم لگا کر اب ہسپتال لے جایا جا رہا تھا، تیمور جلدی سے پولیس کی جانب بڑھا۔

”اندرا ایک لڑکی چلی گئی، آپ لوگوں نے اسے جانے سے روکا کیوں نہیں۔“ وہ طیش کے عالم میں ان پر دھاڑا۔

”ہم نے ان کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ ہم سے قابو نہیں آ رہی تھیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”آپ سے ایک لڑکی نہیں قابو کی جاسکتی تو آپ کو یہ وردی اتار کر کسی سڑک کنارے بیٹھ کر لوگوں کے جوتے پالش کرنے چاہیے۔“ وہ غصے سے کہتا ہوا اندر بڑھنے لگا کہ ایک پولیس آفیسر نے اسے روک لیا۔

”سر آپ اندر نہیں جاسکتے، ہم نے اندر کچھ لوگوں کو بھیجا ہے وہ انہیں لے آئیں گے۔“ وہ جھل سے بولا۔

”جسٹ شٹ اپ، لوگوں کو بھیجا ہے، لیں

آئیں گے۔“ وہ شہادت کی انگلی دکھاتا ہوا چلایا، وہ ان سے الجھ رہا تھا جب فائر بریگیڈ کے دو آدمی اسے ہاتھوں میں لئے نمودار ہوئے، تیمور جلدی سے ان کی جانب لپکا۔

”بہت مشکل سے تلاش کیا انہیں، اگر یہ ایک میز کے نیچے نہ چھپی ہوتی تو پوری طرح جل جاتیں اور اس میز کو بھی آگ بس چھونے والی تھی، لیکن ان کی قسمت اچھی ہے کہ یہ بچ گئیں۔“ ایک آدمی نے اسے تیمور کے حوالے کر

ہوئے کہا، وہ جلدی سے اسے اپنی گاڑی نہ ڈالتا ہوا ہسپتال لے آیا، علی اس کو یوں ہاتھوں میں ایک حینہ تھامے آتا دیکھ کر ٹھٹھک گیا، اگر اس وقت اس کی حالت سنجیدہ نہ لگ رہی ہوتی تو وہ یقیناً اس سے مذاق کرنے لگ جاتا، وہ جلدی سے تیمور کی جانب بڑھا۔

”کیا ہوا؟ یہ کون ہے؟“ وہ اسے بیڈ پر لٹا رہا تھا۔

”ان سب باتوں کا جواب بعد میں بھی دیا جاسکتا ہے۔“ تیمور فاریہ کے پاؤں پر کوئی مرہم لگانے لگا، اس کا پاؤں بری طرح جلا تھا، پاؤں کے بعد اس نے دیکھا اس کے بازو اور سر سے خون بہہ رہا ہے، وہ علی کی مدد سے اس کی بیڈ تیج کرنے لگا، وہ بے ہوش پڑی تھی، علی نے اسے انجکشن دیا اور ڈرپ لگا دی، وہ دونوں واش بیسن سے ہاتھ دھونے کے بعد واپس فاریہ کی جانب ملے، علی خاموشی سے کبھی فاریہ اور کبھی تیمور کو دیکھتا رہا، باہر اور بھی بہت سے زخمی لوگوں کو لایا جا رہا تھا لیکن اس وقت وہ صرف فاریہ کے پاس رہنا تھا یہ جانے کیوں، اسے اچانک اس کی اتنی فکر ہو گئی تھی۔

”کزن ہے میری۔“ تیمور نے علی کا تجسس بھانپتے ہوئے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”اوہ یہ بھی اسی ہوٹل میں تھیں۔“ علی نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ ہوٹل ہی ان کا ہے۔“ تیمور نے فاریہ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ سوسینڈ، بہت نقصان ہوا ہے وہاں تو، نوز میں بتایا جا رہا ہے، ہوٹل میں تو کچھ بچا ہی نہیں سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔“ علی، تیمور کے آنے سے پہلے نوز ہی دیکھ رہا تھا۔

”لیکن آگ لگی کیسے؟“ علی نے اہم سوال کیا تھا۔

”ہاں آگ کیسے لگی؟“ تیمور بھی اس سوال پر سوچنے لگا اور اس کا جواب اب اسے ہی ڈھونڈنا تھا، اس لئے وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو اس نے مندی مندی آنکھوں سے جگہ کا جائزہ لیا، وہ جان چکی تھی کہ وہ کسی ہسپتال میں ہے، اسے ہوش میں آتا دیکھ کر مریم اور منصورہ بیگم جلدی سے اس کی جانب لپکیں۔

”فاریہ! میری بیٹی۔“ منصورہ بیگم آبدیدہ ہو گئیں تو مریم نے انہیں تسلی دی۔

”شکر اللہ کا تمہاری جان محفوظ ہے۔“ وہ نرمی سے بولیں، لیکن فاریہ خاموشی سے ان دونوں کو دیکھتی رہی۔

تیمور کمرے میں داخل ہوا تو اس نے بتایا فاریہ آج کی رات ہوسپتال میں ہی رہے گی۔

”امی آپ پریشان مت ہوں، مگر جا کر آرام کریں میں یہاں فاریہ کے پاس ہی ہوں۔“ وہ ماں کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”مریم تم امی کو لے کر گھر چلی جاؤ اور ہاں مجھے فاریہ کے چاچو کی کال آتی تھی وہ لاہور سے آ رہے ہیں، ان کو ہوسپتال مت آنے دینا مگر یہی

رکھنا، فاریہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں کہ دوسروں کے سوالوں کے جواب دے سکے اور تم جانتی ہو وہ اکیلے نہیں آئیں گے ان کے بڑے بھائی انکل الیا اس بھی ہونگے، وہ ان دنوں لاہور ہی ہیں اس لئے دونوں بھائی ایک ساتھ آرہے ہیں۔“ تیمور نے تفصیل سے بتایا تو مریم نے اثبات میں سر ہلایا اور منصورہ بیگم کو لے کر گھر چلی آئی، ہادی کو وہ ملازمہ کے پاس ہی چھوڑ کر گئی تھی۔

فاریہ خاموشی سے سب کی باتیں سنتی رہی اور پھر منصورہ بیگم کے جاتے ہی اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں، تیمور اس کی جانب بڑھا۔

”اشوا اور یہ کھانا کھاؤ۔“ اس نے فاریہ کے لئے پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا جو مریم گھر سے بنا کر لائی تھی، اس نے بند آنکھیں کھولیں، ایک نظر تیمور کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں، تیمور نے اسے گھورا اور چند غائبے بعد دوبارہ مخاطب ہوا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو میں تمہاری زیادہ منتیں نہیں کروں گا اس لئے اشوا اور یہ کھانا کھاؤ۔“ فاریہ نے کوئی رد عمل نہیں دیا۔

تیمور نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اسے تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھانے لگا، فاریہ نے گھور کر اسے دیکھا، اچھی زبردستی تھی، لیکن وہ خاموش رہی۔

وہ جانتا تھا اسے اٹھنے میں پرابلم ہوگی کیونکہ اس کے بازو اور ہاتھ کے ساتھ سر پر بھی چوٹ تھی، لیکن وہ جان بوجھ کر اسے خود اٹھنے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن جب وہ نہیں اٹھی تو اس نے خود اسے سہارا دیتے ہوئے بٹھا دیا۔

فاریہ اب تک مسلسل خاموش تھی، تیمور نے اس کے قریب اپنے بیٹھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ بنائی اور اس کے پاس بیٹھ گیا، اس نے فاریہ کے

تمہارے پاس بیٹھ جاؤں۔“ علی نے اپنا سِل
فون جیب میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ علی نے
بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں، پریشان تو ہوں۔“ اس نے سر
ہلاتے ہوئے مدغم لہجے میں جواب دیا۔

”ہاں اتنا زیادہ مالی نقصان ہو گیا آپ
لوگوں کا، پریشان ہونا بھی چاہیے۔“

”مجھے مالی نقصان کی کوئی پرواہ نہیں، وہ نہ
پہلے میرے کسی کام کا تھا نہ آئندہ، لیکن مجھے

افسوس ضرور ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟“

”تو پھر کس کے لئے پریشان ہو؟“ علی نے
بھنویں اچکائیں۔

”اوہ کہیں اپنی اس کزن کے لئے تو
پریشان نہیں جسے ابھی کچھ دیر پہلے تم اپنے ہاتھوں

سے کھانا کھلا کر آرہے ہو۔“ علی کو شرارت سو جھی،
تیور اس کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا اس لئے

اسے گھورتا ہوا بولا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے
ہو۔“ تیور نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

”تو پھر کیسا ہے؟ جس طرح تم اسے
ہوسپٹل لے کر آئے، اس کا ٹریٹ منٹ کیا، پھر

اس کا خیال رکھا اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا
کھلایا۔“ وہ علی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی

بول دیا۔

”اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو میں ایک ڈاکٹر
ہونے کی حیثیت سے اسی طرح کرتا جیسا اس

کے ساتھ کیا۔“ علی نے اسے گھورا۔

”تم نے آج سے پہلے تو کبھی کسی مریض کو
اپنے ہاتھوں سے کھانا نہیں کھلایا اور نہ ہی کسی ہیرو

کی طرح کسی مریض کو ہاتھوں میں اٹھائے
ہسپتال میں انٹری دی ہے۔“ علی مسکراتا ہوا بولا۔

منہ کے قریب جھج کیا تو قاریہ کی آنکھیں ڈبڈبا
گئیں۔

”رونے کے لئے ساری عمر پڑی ہے، فی
الحال کھانا کھاؤ۔“ وہ سرد لہجے میں بولا، اس وقت

بھی اسے اس پر غصہ نکالنے کی پڑی تھی جب وہ
اتنے بڑے نقصان سے گزر رہی تھی۔

”قاریہ مجھے اپنے دوسرے مریضوں کا بھی
چیک اپ کرنا ہے جلدی سے کھانا کھاؤ۔“ وہ غصہ

دباتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا تو قاریہ نے منہ
کھولا اور اس کے ہاتھ سے کھانا کھانے لگی۔

کھانے کے دوران اس کے آنسو متواتر
پہتے رہے تھے لیکن تیور ان سے رونے سے منع

نہیں کیا، وہ منع کرتا بھی کیوں، اسے اس کے
رونے سے کون سا کوئی فرق پڑتا تھا، اسے کھانا

کھلانے کے بعد میڈیسن دے کر اس نے اس کو
واپس لیٹنے میں مدد کی اور ہونٹ کے کاریڈور میں

چلا آیا۔

اس کی آج ٹائٹ شفٹ نہیں تھی وہ جھوٹ
بول رہا تھا قاریہ سے کے ابھی اپنے بانی مریضوں

کو بھی دیکھنا ہے کہ جلد از جلد اسے کھانا کھلا کر
ذہاں سے نکل سکے۔

وہ ہسپتال کے بنے گاؤں میں چلا آیا اور
لکڑی کے بیچ پر آن بیٹھا، اس کے ایک ہاتھ میں

سگریٹ اور دوسرے میں چائے کا کپ تھا،
سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اس نے دھواں فضا

میں اڑایا اور آسمان کو دیکھنے لگا، وہ نہ جانے کن
سوچوں میں گم تھا جب علی اچانک اسے اپنی

جانب بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔

”تم ابھی تک گھر نہیں گئے۔“ اس نے علی
کو اپنے قریب بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

”بس ابھی رائڈ لے کر فری ہوا ہوں، نکل
ہی رہا تھا تمہیں یہاں بیٹھے دیکھا تو سوچا کچھ دیر

اپنے ملک کو دینا چاہتا تھا تا کہ دوسرے ممالک کو۔

”تم اس کو پیار سے سمجھاتے ہو سکتا وہ مان ہی جاتی۔“ علی کو اس کے لئے برا لگ رہا تھا۔

”اس نے ان سب باتوں کی مہلت ہی نہیں دی، مجھے چھوڑنے کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے مطلق کر لی اور مجھ سے یوں قطع تعلق ہو گئی جیسے

مجھے کبھی جانتی ہی نہیں تھی، میں نے اس کو بہت فون کالز کیں، اپنے فریڈز کے ذریعے اس سے

رابطہ کرنا چاہا، لیکن سب بے کار گیا، شاید وہ مجھ سے محبت کر رہی ہی نہیں تھی اور تم تو جانتے ہو،

باہر کے ممالک کی محبتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔“ تیمور خود اپنی محبت کا مذاق اڑاتے ہوئے

استہزاء سے ہنسا۔

علی کو آج وہ پہلے والا تیمور نہیں لگا جس کے ستواں ناک پر ہمیشہ غصہ بیٹھا رہتا تھا جس کی

پوری آنکھیں، گھٹی پلکیں کسی غرور سے تنی رہتی تھیں، اسے آج وہ کوئی مصوم سا بچہ لگ رہا تھا

جسے بہت دیر بعد اپنی کسی مٹی ہوئی چیز کی یاد آگئی ہو اور وہ اس کو یاد کر کے بے چین ہو گیا ہو، تیمور

بھی اس وقت اسے اضطرابی کے کسی مرحلے سے گزر رہا ہوا لگ رہا تھا، اس نے اس کے کندھے

پر ہاتھ رکھا۔

”تو تم اب تک اسی لئے شادی سے بھاگتے رہے۔“ علی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں شادی سے نہیں لڑکیوں سے بھاگتا ہوں، عورت کا دل کب بدل جائے کیا بھروسہ۔“

تیمور نے ہنسنے ہوئے انداز میں کہا۔

”تم ایک عورت کی وجہ سے سب کو دھوکے باز نہیں سمجھ سکتے۔“ علی اب بھی اسی کو گھور رہا تھا۔

”تم مجھے دیکھ لو، میں نے بھی تو محبت کی تھی اور جس سے محبت کی اسی سے شادی بھی ہو گئی۔“

”مجھے تو لگتا ہے تم اس سے محبت کرتے ہو۔“ علی کے آخری جملے نے اسے آگ بگولا کر دیا۔

”مثلاً اب علی، فضول مت بکو، مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”تو کس سے ہے؟“ علی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔

”کسی سے بھی نہیں۔“ وہ رخ موڑ گیا۔

”کسی سے تو ہوگی ہی۔“ علی نے زور دیا۔

”جس سے تھی وہ چلی گئی۔“ وہ بے ساختہ کہہ گیا لیکن علی..... علی کچھ محلوں کے لئے خاموش رہ گیا۔

”کون تھی؟“ چند لمبے ٹھہر کر پوچھا گیا، تیمور نے علی کو بغور دیکھا اور نظریں جھکا کر بولا۔

”لندن کی تھی، کلاس فیلو تھی۔“ علی کو حیرت کا جھٹکا لگا کہ آج تک اس نے اس محبت کا بھی

ذکر تو نہیں کیا تھا تو آج یوں انکشاف پر وہ حیران ہو گیا۔

”لیکن وہ چلی کیوں گئی؟“ علی کا تجسس بڑھ گیا۔

”کیونکہ اس کو جانا ہی تھا۔“ تیمور نے سر جھکا لیا۔

”مطلب؟“ علی نا سمجھی سے بولا۔

”اسے مجھ سے محبت کا دعویٰ تو تھا لیکن وہ میری خاطر اپنے والدین نہیں چھوڑ سکتی تھی، اپنا

ملک چھوڑ کر یہاں نہیں آ سکتی تھی، وہ چاہتی تھی میں وہیں رہوں، اس کے والدین کے ساتھ۔“

تیمور نے عرصے بعد اس کا ذکر چھیڑا تھا اور نہ جانے کیوں چھیڑا تھا۔

”پھر؟“

”پھر کیا؟ میں اپنی ماں کو تنہا چھوڑ کر کیسے وہاں رہ سکتا تھا اور میں ڈکٹر بن کر اپنی خدمات

آگے بڑھ گیا، تیمور نے ہلکا سا مسکرا کر اسے دیکھا، وہ مگر جا رہا تھا کیونکہ اس کی بیوی اس کے لئے فکر مند ہو رہی تھی، لیکن تیمور کہاں جاتا؟ اس کے لئے تو کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

نند دبی دبی محبتیں
نند دکھاوے کی اب مسکراہٹیں
میں تھک گئی ہوں اب جھوٹ سے
مجھے چاہیے اب سچ یہاں
گر مجھ میں تو رجحانیں
گر چاہتیں تو چاہتیں

اگلی شام وہ تیمور کے ہمراہ واپس گھر لوٹی، تیمور اسے اپنے گھر لے جا رہا تھا لیکن فاربیہ نے انکار کر دیا اور اصرار کرنے لگی وہ اپنے ہی گھر جائے گیا، اس نے مزید اس سے بحث کئے بنا اس کو اس کے گھر لے آیا، کال پر وہ مریم کو اطلاع دے چکا تھا کہ وہ فاربیہ کو اس کے گھر لے کر جا رہا ہے اسی لئے ان کے چہنچہنے سے پہلے ہی سب لوگ وہاں موجود تھے۔

بڑے چھوٹے چچا، چچی، خالہ، مریم سب لوگ وہاں تھے، وہ تیمور کا سہارا لئے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئی تو اس کو دیکھتے ہی سب اس کی جانب بڑھے، سب کی آنکھیں غم محسوس، نقصان ہی ایسا تھا کہ اس پر افسوس سے زیادہ فاربیہ کی حالت دیکھ کر رونے آ رہا تھا، لیکن فاربیہ خاموش تھی اس کی آنکھوں میں آنسو کی جھلک بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی، تیمور نے اسے صوفے پر بٹھا دیا، منصورہ بیگم اور شائستہ اس کے دائیں بائیں بیٹھ کر اسے جیسے تسلی دینا چاہتی تھیں، لیکن وہ تسلیاں کب مانگ رہی تھی، وہ تو چپ تھی نہ رو رہی تھی نہ ہی کسی دکھ کا اظہار کر رہی تھی۔

پھر یہ سب لوگ اس کے لئے اتار پریشان

علی نے اپنی مثال سامنے رکھی۔
”تمہارا تجربہ اچھا رہا اس لئے تم ایسا بول رہے ہو۔“ تیمور اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”اگر تمہارا ایک تجربہ غلط ثابت ہوا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تم ہمیشہ اس ایک تجربے کی وجہ سے ساری عمر پوری دنیا کی عورتوں کو برا اور دھوکے باز سمجھتے رہو گے۔“ علی کا فون بجنے لگا، اس نے جیب سے موبائل نکالا۔

”دیکھو سمیرا کی کال آرہی ہے، وہ جانتی ہے میری ڈیوٹی کب سے ختم ہو چکی ہے، اب تک مجھے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن میں نہیں پہنچا، اس نے فکر مند ہو کر مجھے خود ہی فون کر لیا، اب یہ میری سوچ پر منحصر ہے کہ میں اس کی اس فکر کو اس کال کو محبت کا نام دوں یا پھر شک کا، کہ میری بیوی اس وقت کت میرے باہر رہنے پر شک ہو رہا ہے یا وہ اب تک میرے گھر نہ پہنچنے پر پریشان ہو رہی ہے۔“ اس نے کال کاٹ دی اور دوبارہ تیمور سے مخاطب ہوا۔

”دیکھو تیمور! انسان زندگی میں بہت سے اچھے اور برے تجربات سے گزرتا ہے، لیکن اسے کوئی ایک اچھے تجربے سے یہ اخذ نہیں کر لینا چاہیے کہ اس کا اگلا تجربہ بھی اچھا ہی رہے گا ہو سکتا ہے برا ہو جائے، اسی طرح کسی ایک برے تجربے سے ساری عمر کے لئے یہی نہیں سوچتے رہنا چاہیے کہ جو پہلی بار ہوا وہ اگلی بار بھی لازم ہو گا، وہ کہتے ہیں نا، اچھائی کی امید رکھنی چاہیے اور برے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔“ وہ ہلکا سا مسکراتا ہوا کہہ کر اٹھ گیا۔

”اب تمہیں بھی اس بارے میں سوچنا چاہیے، ویسے میری مانو تو تمہاری کزن تمہارے لئے پرفیکٹ ہے۔“ وہ شرارت سے آنکھ دباتا ہوا

”چاچو آپ اکیلے کیوں آئے ہیں، عاصم اور فجر کو ساتھ کیوں نہیں لائے۔“ وہ طاہر صاحب سے مخاطب ہوئی۔

”اوہ تو وہ ایک ہی بار اب شادی میں آئیں گے۔“ وہ اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتے ہوئے ہنس دی۔

”اور بڑے چاچو، آپ ابھی بھی غصہ ہیں کیا؟ اب تو غصے کی کوئی وجہ ہی نہیں رہی، آپ نے دیکھا سب جل کر راکھ ہو گیا، اب آپ بھی غصہ ختم کیجئے۔“ الیاس صاحب نے نظریں چرا لیں۔

”مریم بادی کہاں ہے؟“ وہ مریم سے پوچھنے لگی جو کم آنکھوں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”وہ گھر ہے بشیرہ کے پاس۔“ مریم نے ملازمہ کا نام لیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”یہ آپ سب اتنے دکھی کیوں لگ رہے ہیں، جیسے میں مر گئی ہوں اور میرے گھر میں ماتم کرنے آئے ہیں۔“ وہ سب کو دیکھتی ہوئی بولی، وہ اتنا بولتی نہیں تھی، لیکن آج نہ جانے کیوں مسلسل بولے جا رہی تھی اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اس کو کوئی بولنے سے روک پائے۔

”خالہ جانی! آپ نے کہا تھا چاچو کے آنے پر شادی کی تاریخ طے کی جائے گی، دیکھیں سب آچکے ہیں، آپ بس جلد از جلد شادی کی تاریخ رکھیں، اب میں مزید اس گھر میں تنہا نہیں رہ سکتی۔“ وہ ہنستی ہوئی بولی، تیمور کو اس کی حالت سے وحشت محسوس ہونے لگی، وہ باہر جانے لگا تو فاریہ کی بات پر ٹھہر گیا۔

”ویسے رسماً شرما کر دہن کو یہاں سے جانا چاہیے کہ اس کی شادی کی بات ہو رہی ہے، لیکن چونکہ میرا پاؤں میں بینڈنچ ہے تو لگتا ہے دہا شرما

کیوں ہو رہے ہیں، فاریہ کو ان کا اس طرح رونا اچھا نہیں لگ رہا تھا، اس نے منصورہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو صاف کئے اور مسکرائی ہوئی بولی۔

”آپ کو پتہ ہے میں کل رات کو کیا سوچ رہی تھی۔“ منصورہ بیگم نے ناجبھی سے اسے دیکھا، سب کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں، حتیٰ کہ تیمور کی بھی، وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ارے وہی جوان دنوں سب لڑکیاں سوچتی ہیں، کہ وہ اپنی شادی پر کس طرح ڈریس پہنے گی، کس طرح کا ہیرا شامل بنائے گی اور سب سے بڑھ کر جو بات، کہ وہ.....“ وہ بولتے بولتے ٹھہر گئی۔

”ارے نہیں وہ میں سب کے سامنے نہیں بتاؤں گی آپ کان آگے کیجئے۔“ منصورہ بیگم کی طرح باتیں سب بھی ٹھنکی باندھے اسے دیکھتے جا رہے تھے۔

”کیجئے نا۔“ وہ کسی چھوٹی بچی کی طرح ضد کرنے کے سے انداز میں بولی تو منصورہ بیگم نے اپنا چہرہ اس کے قریب کیا۔

”وہ بات یہ کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون پر کہاں جائے گی۔“ وہ بات کہہ کر جاندار قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس دی، سب کو لگا وہ صدے سے پاگل ہو چکی ہے، ہاں شاید وہ پاگل ہی ہو چکی تھی، سب خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، منصورہ بیگم کو اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا، وہ اٹھ کر تیمور کی جانب بڑھیں۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے تیمور؟ یہ ایسا بی بیو کیوں کر رہی ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

”امی آپ فکر مت کریں، تھوڑا وقت لگے گا مگر سنجیدل جائے گی۔“ اس نے ان کو تسلی دی۔

کر اس محفل سے بھاگ رہا ہے۔“

”فاریہ بس بھی کرو کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ منصورہ بیگم کا ضبط جواب دے گیا۔

”کیا ہو گیا ہے مجھے؟“ وہ حیرت سے ان کا سوال دہرائی ہوئی بولی۔

”تمہیں آرام کی ضرورت ہے، چلو میں تمہیں تمہارے کمرے میں لے کر چلتی ہوں۔“ مریم اس کے قریب آئی ہوئی بولی۔

”نہیں مجھے آرام کی ضرورت نہیں ہے، جتنا آرام کرنا تھا کر چکی، اب بس۔“ اس نے جانے سے انکار کر دیا۔

”خدمت کرو، چلو شاباش اپنے کمرے میں چلو۔“ مریم نے پیار سے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا تو اس نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔

”میں نے کہا تھا مجھے نہیں جانا۔“ فاریہ کا لہجہ دفعتاً سخت ہو گیا، مریم نے تیور کی جانب دیکھا تو اس نے اسے اشارے سے منع کر دیا کہ اسے جانے پر مجبور مت کرے، مریم پیچھے ہٹ گئی، تیور اس کے قریب آیا اور اسے بازو سے تھامتے ہوئے بولا۔

”فاریہ تم جا کر آرام کرو، باقی کی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔“ اس کا انداز بالکل نارمل تھا۔

”مریم تو امی کو گھر لے جاؤ اور انکل آپ لوگ بھی جا کر آرام کریں، فاریہ کی فکر مت کریں وہ بالکل ٹھیک ہے۔“ اس نے الیاس اور طاہر صاحب کی جانب دیکھ کر کہا تو وہ خاموشی سے لاؤنج میں چلے گئے، مریم منصورہ بیگم کو لے کر گھر آ گئی، اب لاؤنج میں بس وہ دونوں باقی بچے تھے۔

”مجھے کمرے میں نہیں جانا۔“ فاریہ نے نزو دھنے پن سے کہا۔

”کیوں نہیں جانا؟ تمہاری میڈیسن کا وقت ہو گیا ہے، چلو شاباش۔“ وہ اس کو زبردستی کمرے میں لے آیا اور بیڈ پر لٹا دیا، فاریہ خاموش ہو گئی، تیور نے اسے میڈیسن دی جس میں ایک گولی نیند کی بھی اس نے شامل کر دی تھی، وہ جتنا آرام کرتی اس کے لیے اس وقت اتنا اچھا تھا، وہ مددے کی حالت میں تھی اور اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے کیوں کر رہی ہے، کیا بول رہی ہے اور کس سے بول رہی ہے، میڈیسن کھاتے ہی کچھ ہی دیر میں وہ سو گئی، وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا، وہ فاریہ کو کھور رہا تھا، آنکھیں بند کئے دنیا سے بے خبر سوئی وہ کوئی معصوم گڑیا کی مانند لگتی تھی، تیور نے اس سے نظریں ہٹا لیں، وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، دفعتاً اس کا موبائل بجنے لگا، اس نے فون اٹھایا۔

”سر ہوئل میں آگ لگی نہیں لگوائی گئی ہے۔“ اس کے آدمی نے اسے خبر دی تو وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکا۔

”کچھ پتہ چلا کہ یہ حرکت کس نے کی؟“ تیور سنبھل کر بولا۔

”کچھ زیادہ تو نہیں لیکن ہاں کوئی الیاس نامی شخص ہے، اس کے آدمیوں نے یہ سب کچھ کیا۔“ دوسری جانب سے بتائے جانے والے نام نے اس پر جیسے بم بلاسٹ کیا تھا، تیور نے کال کاٹ دی۔

”الیاس نامی شخص۔“ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔

”کوئی الیاس نامی شخص..... ہاں اس دنیا میں بہت سے الیاس نام شخص ہیں تو پھر اس کا شک صرف اسی الیاس نامی شخص پر کیوں جا رہا تھا جس کو وہ فاریہ کے چچا کی حیثیت سے جانتا تھا۔“

”تو کیا فاریہ کے چاچو نے؟“ اس سے

”جی!“ اس نے سوالیہ انداز میں ان کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”اب تمہارا فاریہ کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟“ ان کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا، تیمور نے ناگہی سے انہیں دیکھا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ بازو پر گھڑی پہنتا ہوا بولا۔

”شادی کے بارے میں، کیا تم اب بھی اس سے شادی کر لو گے؟“ تیمور نے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا جو ای کو دیکھ رہی تھیں۔

”کیوں اب کیا ہو گیا ہے؟“ تیمور کا انداز ویسا ہی تھا۔

”مجھے لگتا ہے، وہ اپنا داغی توازن کھو بیٹھی ہے اور اب اس کے پاس بچا بھی کیا ہے بس وہ ایک گھر؟“ منصورہ بیگم کی باتیں اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس دلارہی تھیں۔

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ تیمور نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

”دیکھو بیٹا! تم خود سمجھدار ہو، میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن پھر بھی تمہاری ماں ہونے کی حیثیت سے میرا فرض بنتا ہے کہ تمہیں تمہارا اچھا برا سمجھاؤں، فاریہ اچھی لڑکی ہے، بلکہ بہت اچھی لڑکی ہے، میری خواہش تھی کہ وہ میری بہو بنے، لیکن اب یہ خواہش دل میں ہی کہیں دب سی گئی ہے۔“ تیمور اب تک اپنی ماں کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”میں چاہتی تھی تمہاری فاریہ سے شادی ہو جائے گی تو جو اس کا وہ سب تمہارا ہوگا، تم چونکہ اچھے خاصے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے ہو تو تم سے کہلو کر فاریہ کا ہونٹ مریم کے نام گروادیں گے، چلو سارا کا سارا نہ بھی اس کا آدھا حصہ ہی مریم کے نام ہو جاتا، تم اپنی بچپی کے مزاج سے تو

آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فاریہ کے والدین کی موت کے بعد اس سے اس کے چچا کی آنکھ اس کی جائیداد پر تھی، اس لئے وہ جانتا تھا وہ الیاس نامی شخص کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

”لیکن وہ اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔“ وہ شاگ کے عالم میں تھا۔

”دولت کی لالچ انسان کو کب حیوان بنا دے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے، دولت اک ایسا نشہ ہے جس کے سر چڑھ جائے تو اتنا مشکل ہو جاتا ہے، اس کو اس نشے میں اپنے پرانے، اچھے برے کی تمیز بھول جاتی ہے اور شاید الیاس صاحب بھی بھول چکے تھے کہ فاریہ ان کے بھائی کی اولاد ہے، ان کا اپنا خون ہے، لیکن انہوں نے پھر بھی اس کے ساتھ ایسا کیا، محض اس لئے کہ اس نے اپنے والدین کا سب کچھ ان کے نام کرنے سے انکار کر دیا تھا، ہاں تو ضد میں انسان ایسی ہی حرکتیں کر گزرتا ہے، میرا نہیں تو کسی کا بھی نہیں۔“

اسے جان کر انسوس ہوا تھا، لیکن وہ اس بات کا ذکر ابھی کسی سے نہیں کرنا چاہتا تھا، کیونکہ اسے کسی کی نہیں فی الحال فاریہ کی حالت کی فکر تھی، جو مزید کسی صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

وہ ٹائل بیگم کو فاریہ کے پاس چھوڑ کر گھر چلا آیا، آج اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی اور وہ ہسپتال جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب منصورہ بیگم اس کے کمرے میں داخل ہوئیں، اس نے بالوں میں برش کرتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”وہ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔“

واقف ہونا اور فیروز کا کاروبار بھی کوئی اتنا اچھا خاصا نہیں ہے، میں تو اس شادی پر بھی راضی ہی نہ ہوتی اگر اس میں مریم کی رضا مندی نہ ہوتی، میں چاہتی تھی ہوش کی جتنی بھی آمدن آتی ہے اس میں سے آدمی فار یہ رکھ لیتی اور آدمی ہر ماہ مریم کو ٹرانسفر کروا دی جاتی۔“ وہ مزید بولتی لیکن تیمور کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا۔

”بس کر بس امی، اللہ کا واسطہ ہے بس کریں، یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس قسم کی سوچ رکھتی ہیں۔“ وہ دکھ بھری نگاہ ان پر ڈالتے ہوئے بولا۔

”لیکن بیٹا؟“

”لیکن دشمن کچھ نہیں، بس میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ بولنے سے ٹوک دیا۔

”میں تو سمجھتا تھا آپ فار یہ سے بہت محبت کرتی ہیں، ہر طرح کی لالچ و غرض سے آزاد محبت۔“

”تو مجھے اس سے لالچ کب تھی بیٹا تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔“ وہ جلدی سے بولیں۔

”بس کریں امی مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔“ منصورہ بیگم کو احساس ہوا کہ وہ ان کی باتوں سے بہت زنجیدہ ہوا ہے۔

تیمور میز سے اپنا والٹ اور گاڑی کی چابیاں لے کر کمرے سے نکل آیا، دروازے میں کھڑی مریم بھی اپنی ماں کی باتیں سن کر حیران کھڑی تھی، منصورہ بیگم نے مریم کو دیکھا تو اس کے قریب چلی آئیں۔

”میں نے جو کچھ بھی کہا تمہاری.....“ مریم نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہیں ٹوک دیا۔

”امی فیروز کی آمدن بہت اچھی ہے، جس

☆ ☆ ☆

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی جب دروازے پر دستک دیتی ملازمہ نے اسے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔

”ان کو کمرے میں بھیجا دو۔“ وہ کہتی ہوئی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، احسن کمرے میں داخل ہوا تو فار یہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے سلام کی اور بیٹھے کا کہا، وہ بیٹھ گیا۔

”میں اور افشاں کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے.....“ احسن نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”میں جانتی ہوں۔“ فار یہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ظاہر وہ تو جانتی ہوگی کیونکہ وہ اسی سے اپنی شادی اور بیٹی مون ٹور کی چھٹیاں لے کر گیا تھا لیکن پھر بھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ بات کا آغاز کیسے کرے اس لئے اس نے فار یہ سے اپنی غیر موجودگی کی وجہ بیان کی۔

”مجھے واپسی پر جب اس سارے حادثے کا علم ہوا تو یقین نہیں آیا، اتنا اچانک یہ سب کچھ ہو گیا۔“ احسن افسردہ لگ رہا تھا۔

”حادثے ہمیشہ اچانک ہی ہوتے ہیں۔“ فار یہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جو ہوا ایک حادثہ سمجھ کر بھول جائیے اور آگے

منتر نہیں تھا جسے وہ پڑھ کر پھونکا اور سب پہلے جیسا ہو جاتا۔

”اللہ پر بھروسہ رکھیں، وہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔“ احسن نے اسے ہمت دینا چاہی۔

”اس پر بھروسہ کر کے ہی تو جی رہی ہوں احسن، اس پر بھروسہ نہ ہوتا تو کب کا خود کو مار چکی ہوتی۔“ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی، احسن کی نظریں اس کی نم آنکھوں سے ملیں، دل میں ہلکی سی ہچکچاہٹ تھی، احسن نے اس کی نظریں کی پیش سے بچنے کے لئے نظریں پھیر لیں، فاریہ نے درد بھری مسکراہٹ لیوں پر سجاتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں، وہ نم آنکھوں سے مسکراتی سچ میں مائل لگتی تھی، دیوانی لگتی تھی، احسن کو اس کی اس کیفیت سے خوف آتا تھا، اک انجانا سا خوف۔

”افشاں کیسی ہے؟“ فاریہ نے سر بیڈ سے لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہے، اسے بھی جب علم ہوا تو آنے کے لئے کہہ رہی تھی، لیکن میں نے منع کر دیا، اگلی بار آؤں گا تو ساتھ لاؤں گا۔“ احسن نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ پھر آئیں گے؟“ فاریہ کا سوال عجیب تھا اس لئے احسن کو بھی عجیب لگا۔

”اگر آپ کو میرا آنا برا لگتا ہے تو نہیں آؤں گا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”مجھے کچھ بھی اچھا برا نہیں لگتا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی، کچھ دیر پہلے رونے والی فاریہ اب ایسے ہنس رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، شاید منصورہ بیگم ٹھیک کہہ رہی تھیں، اس کا دماغی توازن خراب ہو چکا تھا۔

”آپ جب چاہیں آ سکتے ہیں، لیکن تمہا نہیں افشاں کے ساتھ، کیونکہ آپ دونوں مجھے ایک ساتھ اچھے لگتے ہیں۔“ فاریہ نے احسن کو

بروہیں۔“ وہ دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولی، احسن نے بغور اس کو گھورا، کتنی عجیب لڑکی تھی فاریہ، کبھی بناباات پر رو دیتی تھی اور کبھی اتنے بڑے حادثوں پر بھی مسکراتی رہتی تھی، احسن نے سوچا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ فاریہ نے اس کی نظریں کے حصار میں خود کو قید کرتے محسوس کیا تو پوچھے بتا رہ نہ سکی۔

”دیکھ رہا ہوں کہ کچھ لوگوں کو اللہ کس قدر آزماتا ہے اور آزمانے کے ساتھ کتنا صبر اور حوصلہ بھی دیتا ہے۔“ وہ بخندگی سے بولا۔

”ہوں، واقعے کچھ لوگوں کو اللہ بہت آزماتا ہے، کبھی ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھا کر، کبھی انسان کی محبت اس کی نظریں کے سامنے کسی اور کی جھولی میں ڈال کر اور کبھی اس کے رزق کے بنائے گئے ویلے کو آگ لگا کر، اللہ سچ میں بہت آزماتا ہے۔“ اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

”ہوٹل جل گیا احسن، جل کر راکھ ہو گیا اور آپ جانتے ہیں مجھے ہوٹل کے جلنے کا اتنا دکھ نہیں جتنا اپنے بابا کی محبت کا یوں راکھ ہو جانے کا افسوس ہے، میں لگتی لا رواہ ہوں، ان کا کاروبار بھی اچھے سے نہیں چلا سکی، بابا ہوتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا، اس شہر کا سب سے بڑا اور مشہور ہوٹل جہاں ہر وقت لوگوں کی چہل پھل رہتی تھی اچانک کیسے دیران، اجڑا بیابان جنگل بن گیا، کچھ باقی نہیں بچا احسن، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ اس نے سوچتے ہوئے تکلیف سے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے سر کو مضبوطی سے تھام لیا۔

احسن کا دل چاہا وہ کسی طرح سب کچھ پہلے جیسا کر دے، ایسے نہ جانے کیوں فاریہ کی ایسی حالت نہیں جاتی تھی، وہ اسے بس مسکراتی ہوئی اچھی لگتی تھی، لیکن احسن کے پاس جادو کا ایسا کوئی

دیکھتے ہوئے کہا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

”اب میں چلتا ہوں، اپنا خیال رکھیے گا۔“
احسن نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”خیال..... ہوں، رکھتی ہوں۔“ وہ جیسے کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

احسن کمرے سے نکلا تو تیمور سے ٹکراتے ٹکراتے بجاء، تیمور نے اس کا حال احوال پوچھا اور اسے پیٹنے کی پیشکش دی، لیکن وہ اپنے آنے کی وجہ بتانے کے بعد مزید رکنے سے معذرت کرتا ہوا چلا گیا۔

تیمور ڈیڑی اس کا چیک اپ کرنے آتا تھا اور اس کی بینڈیج بھی وہ خود ہی چھینچ کرتا تھا، اب اس کا پاؤں پہلے سے کافی بہتر ہو گیا تھا جس کے لئے مزید بینڈیج کی ضرورت نہیں رہی تھی، سرکی چوٹ تو ایک دو بینڈیج سے ہی بہتر ہو چکی تھی، وہ ابھی بھی اس کا چیک اپ کرنے کے بعد واپس پلٹنے لگا جب فاریہ کی آواز پر ٹھہر گیا۔

”میں پاگل ہو چکی ہوں کیا؟“ فاریہ نے معصومیت سے پوچھا تھا کہ تیمور کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی حالت پر رحم آ گیا۔

”ایسا کس نے کہا؟“ تیمور واپس اس کے قریب چلا آیا اور دونوں بازوؤں باندھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”سب کو لگتا ہے میں پاگل ہو گئی ہوں، کل رات شاملہ چچی طاہر چاچو سے کہہ رہی تھیں فاریہ پاگل ہو گئی ہے، اکیلے میں باتیں کرتی ہے، رونی ہے اور روتے روتے ہنس دیتی ہے۔“ وہ اس سے یوں بول رہی تھی جیسے کوئی معصوم بچہ اپنے کسی بڑے کو کسی کی شکایت کر رہا ہو۔

”آپ تو ڈاکٹر ہیں، چیک کریں کیا میں ج میں پاگل ہو گئی ہوں۔“ فاریہ نے اپنا بازو اس

کے سامنے کرتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ اپنا پاگل پن نہیں بلکہ بخار چیک کرنے کا بول رہی ہو کہ لو میری ہنص چیک کرو کہیں مجھے بخار تو نہیں، تیمور نے اس کا بازو تھام لیا اور چند ٹاپے ایسے ہی تھامے کھڑا رہا جیسے ج میں اسے چیک کر دیا ہو کہ وہ پاگل ہو گئی ہے کہ نہیں۔

”بتائیں اب میں پاگل ہو گئی ہوں کہ نہیں؟“ فاریہ نے اسی معصومیت سے پوچھا۔

”نہیں، تم بالکل ٹھیک ہو۔“ تیمور نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کی کلائی اپنی گرفت سے آزاد کر دی۔

☆☆☆

الیاس صاحب تو اسی شام واپس چلے گئے تھے جبکہ طاہر اور ان کی بیوی شاملہ کچھ دنوں کے لئے فاریہ کے پاس رکے تھے، وہ شاملہ بیگم کو فاریہ کی میڈیسن اور ان کے دینے کے اوقات کے بارے میں بتا کر گھر چلا آیا تھا، منصورہ بیگم اپنے کمرے میں تھیں اور مریم آج صبح ہی فیروز کے ساتھ واپس گئی تھی، فیروز کل شام کو آیا تھا اور صبح مریم اور بادی کو لے کر واپس چلا گیا، وہ سیدھا منصورہ بیگم کے کمرے میں آیا۔

وہ وارڈ روب کے سامنے کھڑے شاید وقت گزاری کے لئے اپنے سلیپے سے رکھے گئے کپڑے دوبارہ سے سیٹ کر رہی تھیں، تیمور کو دیکھ کر اس کی جانب چلی آئیں۔

”میں چاہتا ہوں فاریہ اور میری شادی جلد از جلد ہو جائے۔“ اس نے بنا کسی لگی لپٹی کہ اپنی بات کہی۔

”لیکن تیمور ابھی تو وہ.....“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن تیمور نے ٹوک دیا۔

”مجھے کچھ نہیں سننا ہی، میں نے کہہ دیا تھا مجھے جلد از جلد شادی کرنی ہے۔“ منصورہ بیگم

بھی۔“ وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولیں۔

”نہیں فاریہ سے آپ اس بارے میں کوئی بات نہیں کریں گی پلیز، وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے اسے جان کر دکھ ہوگا کہ آپ آخر کیوں اسے اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں اور اب اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ مزید کوئی صدمہ برداشت کر پائے۔“ تیمور نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ باتوں اور رشتوں میں بھرم رکھ لینا ہی ان کے لئے اچھا ہوتا ہے۔“ وہ بیڈ کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔

”اب آپ جا کر آرام کریں اور پرسوں کا دن رکھ لیں۔“ اس نے لیتے ہوئے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے اس کے کمرے سے چلی آئیں، ان کے جاتے ہی تیمور نے اپنی آنکھیں کھولیں اور حجت کو گھورنے لگا، وہ فاریہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا، لیکن کیا سوچ رہا تھا اس کا اندازہ ابھی نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

آج ان دونوں کا نکاح تھا، مریم کو اس اچانک اطلاع پر واپس آنا پڑا، اگر اسے معلوم ہوتا تیمور اس کے جاتے ہی دو دن بعد نکاح کرنے کا حکم جاری کر دے گا تو جاتی ہی نا۔

فاریہ کے دونوں چچا چچی اور ان کے بچے اور تیمور کی طرف سے بس مریم کے سسرال والے اور اس کا دوست علی اپنی بیگم کے ساتھ آیا تھا، لیکن احسن کو نہ جانے کیوں تیمور انوائٹ کرنا نہیں بھولا تھا اس نے اسے فاریہ کی طرف سے انوائٹ کیا تھا اور احسن اس بار افشاں کو بھی ساتھ لایا تھا، فاریہ کو بیویشن آ کر تیار کر گئی تھی اور اب وہ میروں کمر کے لہنگے میں ملبوس دلہن بنی بیٹھی ہے

خاموش ہو گئیں۔

”اور زیادہ لوگوں کو مدعو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بس سادگی سے نکاح کافی ہے۔“ وہ دروازے سے نکلے ہوئے واپس پلٹ کر بولا تو منصورہ بیگم نے اسے گھورا۔

وہ فون کے پاس چلی آئیں اور طاہر صاحب کا نمبر ملا کر ان سے شادی کی تاریخ کا مشورہ کرنے کے بعد واپس تیمور کے پاس گئیں، وہ اپنے کمرے میں ہی تھا اور پیسج کر کے واش روم سے نکل رہا تھا جب منصورہ بیگم کو دیکھ کر ان کی جانب بڑھا۔

”میں نے طاہر بھائی سے بات کر لی ہے، اسی ہفتے میں نکاح کے لئے کوئی سا بھی دن رکھ لیتے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولیں تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا تم اب بھی مجھ سے ناراض ہو؟“ منصورہ بیگم اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”تو کیا نہیں ہونا چاہیے؟“ وہ رخ موڑ گیا۔

”مجھے معاف کر دو بیٹا، لیکن میں نے فاریہ کا کبھی برا نہیں چاہا، میرا یقین کرو۔“ وہ اس کو یقین دہانی کرواتے ہوئے بولیں تو تیمور نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔

”امی! برا چاہا نہیں لیکن برا سوچا تو تھا نا۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

”مجھے معاف کر دو بیٹے۔“ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ لئے، وہ ان کے قریب چلا آیا اور ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”روئیں نہیں اور معافی مجھ سے نہیں اللہ سے مانگیں۔“

”اللہ سے بھی مانگوں گی اور فاریہ سے

چکا ہے نا۔“ فاریہ کانوں میں پہنے جمکوں کو
ہولے سے شہادت کی انگلی سے حرکت دیتے
ہوئے مصیبت سے کہا۔
”کون؟“

”تم اور کون؟“ وہ بے ساختہ قہقہہ لگاتی
ہوئی ہنسی تھی افشاں کو اس کی ہنسی سے خوف آیا اور
اٹھ کر اس سے دو قدم دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔
”مم..... میں؟“ افشاں کو جیسے بولنے میں
مشکل ہونے لگی۔

”ہاں نا تم..... تم..... تم۔“ وہ شہادت کی
انگلی اٹھاتے ہوئے اس کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے جیسے اسے چراتے ہوئے بول رہی تھی،
اس کی ہنسی ابھی بھی ویسی تھی۔
”لیکن میں کیوں؟“ افشاں کی آواز بھیگنے
لگی۔

”احسن کی دلہن ہونا تم، اس لئے تم نے ہی
میرے حصے کی مہندی لگائی، بتاؤ کیوں لگائی، تم
نے برا کیا، تمہیں نہیں لگانی چاہیے تھی احسن کے
نام کی مہندی، احسن کے نام کی مہندی تو مجھے
لگوانی تھی، لیکن نہ جانے کیوں تم نے لگائی اور
میں..... میں ایسے ہی خالی ہاتھ رہ گئی۔“ وہ
مسکراتی ہوئی بولی افشاں کو لگا وہ اس سے کوئی
مذاق کر رہی ہے، لیکن دروازے پر کھڑا احسن
فاریہ کی باتیں سن کر اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔

”احسن..... آپ..... آپ وہاں کیوں
کھڑے ہیں؟ اندر آ جائیں۔“ فاریہ کی دفعتاً اس
پر نظر پڑی تو اپنا لہنگا دونوں ہاتھوں سے ذرا اوپر
اٹھائی ہوئی وہ اس کی جانب بڑھ کر بولی، احسن
کے لب خشک ہونے لگے، پیچھے اس کی بیوی اس
کی محبت کھڑی تھی..... اور آگے..... آگے جو
کھڑی تھی وہ اس کی کون تھی؟ دیوانی..... ہاں وہ
دیوانی تھی، افشاں خاموشی سے ایک نظر احسن کو

حد حسین لگ رہی تھی، مریم گاہے بگاہے اس کے
پاس آتی رہی تھی اور تیور نے سختی سے سب کو منع
کیا تھا کہ فاریہ کے پاس کوئی ہجوم اکٹھا نہیں ہوگا،
فاریہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنی چوڑیوں
کو کلائی میں سمٹا رہی تھی جب افشاں مریم کے
ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی، مریم اسے کمرے
میں چھوڑ کر باہر مہمانوں کو دیکھنے لگی۔

افشاں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تو
فاریہ پھر اسے اپنی چوڑیوں سے کھیلنے لگی، جیسے
اسے افشاں کی آمد سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔
”آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں فاریہ۔“
افشاں نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا تو
فاریہ نے نظر اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھا۔
”ہوں۔“ اور پھر سر ہلاتی ہوئی دوبارہ
چوڑیوں سے چیخڑ چھاؤ کرنے لگی۔

”احسن نہیں آئے؟“ فاریہ نے نظریں
جھکائے ہوئے ہی پوچھا۔
”آئیں ہیں، باہر ہیں۔“

”آپ کی مہندی بہت پیاری لگی ہے اور
رنگ بھی کتنا زیادہ آیا ہے۔“ افشاں نے اس کی
مہندی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا جو اس کو آج ہی
مریم نے بیوٹیشن سے جلدی میں لگوائی تھی اور
تھوڑے سے وقت میں بھی کافی رنگ آیا تھا۔
”میں لگوانا نہیں چاہتی تھی لیکن مریم نے
زبردستی لگوا دی۔“ فاریہ نے جیسے مریم کی شکایت
کی۔

”کیوں؟ لگوانا کیوں نہیں چاہتی تھیں؟“
افشاں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیونکہ مہندی مجھے اچھی نہیں لگتی۔“ فاریہ
نروٹھے پن سے بولی۔
”ایسا کیوں؟“

”کیونکہ میرے حصے کی مہندی کوئی اور لگا

اس کا بازو تھما اور اسے بیڈ پر بٹھا دیا، فاریہ نے تیمور کو یوں خفگی سے دیکھا جیسا اسے اس کا یوں بیٹھانا اچھانا لگا ہو۔

مریم اور منصورہ بیگم کمرے میں داخل ہوئی دونوں نے اسے گلے لگا کر باری باری دعائیں دیں اور دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری، منصورہ بیگم تو اس سے کافی شرمندہ تھیں اس لئے زیادہ وقت اس کے پاس بیٹھتی بھی نہیں تھیں، تیمور اٹھ کر باہر چلا آیا، جہاں سب مہمان آہستہ آہستہ جا رہے تھے، تیمور نے علی کو بھی الوداع کیا اور الیاس صاحب کی جانب بڑھا جوتھا کھڑے تھے۔

”اب میں آپ کا داماد بن چکا ہوں۔“ تیمور نے نہ جانے کیا جتنا چاہا تھا، الیاس صاحب اس کی بات پر مسکرا دیئے۔

”جانتا ہوں۔“
”نہیں شاید آپ ابھی کچھ بھی نہیں جانتے۔“ تیمور نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ الیاس صاحب نا سنجھی سے بولے۔

”مطلب یہی کہ اب آپ کی بھتیجی آپ پر کیس کرے یا نہ کرے میں اپنی بیوی کی طرف سے آپ پر کیس ضرور کر سکتا ہوں، لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔“ الیاس صاحب کا رنگ زرد پڑنے لگا۔

”یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟“ ان کا مزاج بگڑ گیا۔

”آواز جی رکھیے، آپ کی کالی کرتوتوں کا ابھی میرے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں۔“ تیمور کا لہجہ سخت تھا، وہ اچانک دھیمے بڑ گئے۔

”آپ نے ہوٹل میں آٹک لگوائی اور کیوں لگوائی یہ مجھے جاننے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر

دیکھ کر فاریہ کی جانب بڑھی۔
”آپ مذاق اچھا کر لیتی ہیں۔“ فاریہ نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا اور ایک بار پھر سے نے ساختہ قہقہہ لگائی ہوئی ہنس دی، افشاں کو اس کی ہنسی سے وحشت ہوئی تو وہ احسن کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

”احسن میں کیسی لگ رہی ہوں؟“ فاریہ نے مسکراتے ہوئے احسن سے پوچھا تو وہ کچھ بول ہی نہ سکا لیکن تیمور جو ابھی کمرے میں ہی داخل ہو رہا تھا اس کا جملہ سنتے ہوئے فوراً سے بولا۔

”دنیا کی سب سے خوبصورت اور دلکش دلہن لگ رہی ہو۔“ احسن کو اپنا اٹکا ہوا سانس بحال ہوتا محسوس ہوا۔

”آپ ان کی باتوں کا برا مت ماننے گا، یہ بس ایسے ہی مذاق کر رہی تھیں۔“ تیمور کو کچھ کچھ معاملہ گڑ بڑ لگا اس لئے فوراً سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا تو افشاں کچھ ہلکی ہو گئی اور مسکراتے ہوئے تیمور سے مخاطب ہوئی۔

”نہیں مجھے ان کی کوئی بھی بات بری نہیں لگی، یہ بہت اچھی ہیں، میں ان سے پہلے بھی مل چکی ہوں۔“ افشاں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”افشاں چلو، میں تمہیں ہی بلانے آیا تھا۔“

احسن نے اس وقت وہاں سے چلے جانا ہی مناسب سمجھا، افشاں فاریہ کے قریب آئی، اسے بہت سی دعاؤں سے نوازا اور احسن کے ہمراہ واپس چلی گئی، تیمور نے بغور اس کو دیکھا، وہ اپنے آپ میں کم بھی اپنے جیسے کو ہلاتی اور کھلکھلائی ہوئی ہنس دیتی، ابھی اپنی چوڑیوں کی چھن چھن سنتی اور مسکرا دیتی اور کبھی اپنا لہنگا پکڑ کر ہولے سے یوں گھومتی جیسے کوئی تلی ہوا میں اڑتی ہوئی گول گول چکر کاٹ رہی ہو، تیمور نے نرمی سے

”مریم یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ فاریہ نے
بیزارى سے پوچھا لیکن مریم لپکا سا مسکرا دی۔
”پاگل تم دہن ہوتا، تو دہن گھونگھٹ میں ہی
اچھی لگتی ہے۔“

”میں دہن ہوں؟“ فاریہ نے معصومیت
سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ مریم نے مختصر جواب دیا۔
”اچھا اب تم بیٹھو میں چلتی ہوں۔“ مریم
کمرے سے چلی گئی تو فاریہ گھونگھٹ بنا
کمرے کا جائزہ لینے لگی اور پھر واپس گھونگھٹ
اوڑھ لیا، وہ فی الحال سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو
بیٹھی تھی، اس کا ذہن مسلسل صدموں کے باعث
سخت متاثر ہوا تھا، بیٹھے بیٹھے اسے نیند آنے لگی تو
اس نے سر بیڑ کر اوٹن سے ٹکا کر آنکھیں نمونہ لیں
اور کچھ ہی لمحوں میں سو گئی، تیمور کمرے میں داخل
ہوا تو کمرے میں چلتے لمب کی مدھم سفید روشنی
کمرے کا منظر پیش کر رہی تھی، کمرہ ویسا ہی تھا
جیسا ہمیشہ ہوتا تھا مگر اب اس کمرے کے ایک فرد
میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اس نے بیڑ پر بیٹھی فاریہ کو دیکھا اور دروازہ
بند کرتا کمرے کی گھڑکی کی جانب بڑھا، چاند
پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر اپنا حسن
نکھیرے ہوئے تھا، وہ چند لمحے یونہی چاند کو
دیکھتا رہا اور پھر فاریہ کے پاس آکر بیٹھ گیا، اسے
محسوس ہوا کہ وہ سوچکی ہے، اس نے اس کا
گھونگھٹ اٹھایا تو وہ واقعی سوچکی تھی، تیمور
نے اس کا سر آہستہ سے تکیے پر رکھ دیا اور اس پر
کابل اوڑھا کر خود صوفے پر جا بیٹھا، وہ فاریہ کو
بہت غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے میز سے سگریٹ
اور لیٹر اٹھایا اور سگریٹ سلگانے لگا، وہ سگریٹ
کے کش لیتے ہوئے نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا
جب اسے فاریہ کی بڑ بڑاہٹ سنائی دی۔

آئندہ آپ نے فاریہ کو کسی بھی قسم کا نقصان
پہنچانے کی کوشش کی تو میں آپ کی جان لے لوں
گا۔“ وہ غصہ دباتے ہوئے دھمکے لہجے میں بولا۔

”میں چاہوں تو آپ کو بیٹیں کھڑے
کھڑے پولیس کے حوالے کر دوں، کیونکہ
میرے پاس آپ کے خلاف ثبوت بھی ہیں اور
مجھے ان کا استعمال کرنا بھی آتا ہے، لیکن میں ایسا
صرف اس لئے نہیں کروں گا کہ فاریہ کے لئے ہو
سکتا ہے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہو، وہ پہلے ہی
بہت کچھ برداشت کر چکی ہے میں اسے مزید کوئی
تکلیف دے کر اس کی جان خطرے میں نہیں
ڈالنا چاہتا اس لئے آج کے بعد آپ کچھ بھی غلط
کرنے سے پہلے سو بار نہیں تو ایک بار ضرور سوچ
لیجئے گا۔“ وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر جیسے انہیں پہلی
اور آخری وارننگ دے رہا تھا، اسے اپنے پیچھے
شامکے بیگم کی آواز سنائی دی تو وہ جلدی سے مڑا۔
”تیمور بیٹا، رخصتی کا وقت ہو گیا ہے، منصورہ
آپا تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔“ فاریہ اور اس کا نکاح
چونکہ فاریہ کے ہی گھر ہوا تھا اس لئے اب
انہیں واپس اپنے گھر جانا تھا۔

”جی چلیں۔“ وہ ان کے ساتھ ہی آگے
بڑھ گیا۔

الیاس صاحب کار کا سانس جیسے اس کے
جانے سے بحال ہوا اور وہ اس وقت ان لوگوں کا
سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے اس لئے
کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

اس کا کمرہ معمول کے مطابق جیسا تھا آج
بھی ویسا ہی تھا اس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں کی گئی
تھی، مریم فاریہ کو تیمور کے کمرے میں لے آئی،
اس نے اسے بیڑ پر بٹھایا اور اس کا گھونگھٹ ذرا
گہرا کر دیا۔

”آ..... آگ..... آگ..... الو..... آگ لگ گئی..... نن..... نہیں.....“ وہ نیند میں اپنا سر دائیں بائیں گھمانے لگی، تیمور کو احساس ہوا وہ کوئی برا خواب دیکھ رہی ہے وہ سگریٹ ایش ٹرے میں رکھتا ہوا جلدی سے فاریہ کی جانب بڑھا۔

”فاریہ..... فاریہ۔“ تیمور اس کا گال تھپتھپانے لگا۔

وہ اچانک سے اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کا پورا وجود پسینے میں بھیگ چکا تھا، آنکھوں میں عجب وحشت تھی، وہ خاموشی سے تیمور کو گھورنے لگی، تیمور نے جلدی سے اس کے لئے گلاس میں پانی ڈالا اور اس کو پانی پلانے لگا، پانی پینے کے بعد فاریہ خاموشی سے واپس لیٹ گئی، تیمور نے اس سے کچھ نہیں کہا، وہ اٹھ کر جانے لگا تو فاریہ نے اس کا ہاتھ تمام لیا، تیمور نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں اس وقت خوف کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا، وہ بنا کہے واپس بیٹھ گیا۔

”تم سو جاؤ، میں یہیں ہوں۔“ تیمور نے نرمی سے کہا تو فاریہ نے اس کا ہاتھ اپنی گال کے نیچے رکھ کر آنکھیں سووند لیں، فاریہ کو ہر وقت ڈانٹنے والا، اس سے جھگڑا کرنے والا بات بات پر اس کی نئے عزتی کرنے والا تیمور اچانک بدل گیا تھا، یا پھر شاید فاریہ اب اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اس سے کچھ بھی کہا جاتا اس لئے وہ خاموش ہو چکا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ دوبارہ سو گئی، لیکن تیمور اسی طرح اس کے پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہا، بہت صبر کرنے والی تھی، اس کی زبان سے کبھی کوئی گلہ شکوہ نہیں سنا تھا، اس نے اللہ کی ہر آزمائش کو صبر و ہمت سے برداشت کیا تھا، لیکن اس کو مسلسل اتنی پریشانیوں نے شاید تھکا دیا تھا اور انسان تھک ہی

جاتا ہے لیکن تیمور کو اب اسے جھکنے نہیں دینا تھا، اسے واپس پہلے والی فاریہ بنانا تھا اور وہ جانتا تھا وہ اس کے ہر دکھ کو صرف محبت سے ہی دور کر سکتا ہے۔

اس محبت سے جس محبت سے اسے نفرت ہو گئی تھی اور جس نفرت کا شکار فاریہ بھی ہوئی تھی، اسے دنیا کی تمام لڑکیاں ایک سی ہی لگنے لگی تھیں، اسے پہلے بھی محبت میں دھوکا دے کر ہرانے والی ایک عورت ہی تھی اور اسے اب بھی اپنی نفرت اور سختیاں چھوڑ کر پہلے جیسا سب سے پیار کرنے والا نرم مزاج انسان بنانے والی ایک عورت تھی۔

”عورت کے بھی نہ جانے کتنے روپ ہوتے ہیں۔“ تیمور نے اپنا ہاتھ نرمی سے اس کے چہرے کے نیچے سے نکالے ہوئے اک نظر اس کو دیکھ کر سوچا اور خود بیڈ کی دوسری جانب آ کر لیٹ گیا اور سونے کی ایک ناکام کوشش کرنے لگا، کیونکہ وہ جانتا تھا اسے نیند آئی آسانی سے نہیں آئے گی۔

☆☆☆

صبح وہ ابھی تو تیمور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ناکی باندھ رہا تھا، اس نے شیشے سے ہی فاریہ کو دیکھا وہ اٹھ کر بیٹھی تو وہ اس کی جانب بڑھا، فاریہ نے نظراٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو وہ گہری مسکراہٹ لہوں پر سجائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”اچھا ہوا تم خود ہی اٹھ گئی ورنہ مجھے مجبوراً تمہاری نیند خراب کرنی پڑتی۔“ وہ بازو پر کھڑی باندھتے ہوئے بولا۔

”فاریہ تمہیں کون سا رنگ پسند ہے؟“ تیمور نے واپس ڈریسنگ ٹیبل کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا لیکن وہ خاموش رہی، اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم اٹھائی اور فاریہ کے

قرب آکر بیٹھ گیا۔ اور وائس روم میں گھس گئی۔

واپس لوٹی تو تیسوڑ صوفے پر بیٹھا موبائل پر مصروف لگ رہا تھا، وہ اسے مخاطب کئے بنا کمرے سے جانے لگی تو تیسوڑ کی آواز پر رک گئی۔
”فاریہ؟“ تیسوڑ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پکارا، فاریہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”باہر ناشتے کے لئے۔“ وہ مدہم لہجہ میں

بولی۔

”ایسے جاؤ گی؟“ تیسوڑ نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا تو وہ ہڑبڑا گئی۔

”تو کیسے جاؤں؟“ وہ معصومیت سے بولی تو تیسوڑ کو ہنسی آگئی، وہ اٹھ کر اس کی جانب بڑھا اور اس کا بازو تھام کر اسے ڈریسنگ ٹیبل کے قریب لے آیا۔

”تم نئی دہلی ہو، تھوڑا بہن سنو کر رہو۔“ اس نے اس کی کلائی میں سرخ چوڑیاں پہناتے ہوئے کہا تو فاریہ بغور اسے دیکھنے لگی۔

”کس کی دہلیں ہوں؟“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی تو تیسوڑ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور چند ثانیے بعد بولا۔

”میری دہلیں ہو۔“ فاریہ اس کی بات پر یوں ہنسنے لگی جسے تیسوڑ نے اس کو کوئی لطفہ سنا دیا ہو، تیسوڑ کو اس کی ہنسی بری نہیں لگی تھی، وہ اچانک ہنسنے ہنسنے رو دی، اس کی آنکھوں کے کونے بھیجنے لگے، تیسوڑ سمجھ سکتا تھا وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے، اس نے خاموشی سے اس کے آنسو صاف کیے۔

”تم پر ریڈ لپ اسٹک بہت اچھی لگتی ہے، یہ لو لگاؤ۔“ اس نے میز سے لپ اسٹک اٹھا کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں نے پوچھا تمہیں کون سا رنگ پسند ہے؟“ تیسوڑ نے نرمی سے پوچھا تو جیسے وہ سوچتے لگی کہ اسے کون سا رنگ پسند ہے، تیسوڑ بغور اسے دیکھنے لگا۔

”کوئی بھی نہیں پسند؟“ تیسوڑ نے دوبارہ پوچھا۔

”ڈارک سی گرین، اینڈ وائٹ۔“ وہ خوشی سے چپکتے ہوئے بولی تو تیسوڑ مسکرا دیا۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے، میں ایک دو دن میں کمرے کو تمہارے پسندیدہ رنگوں میں تبدیل کر دیتا ہوں۔“ تیسوڑ کھڑا ہوا گیا تو فاریہ بھی بیڈ سے اتر کر اس کے پیچھے چلی آئی، وہ خود پر فریوم چمڑک راہ تھا جب دفعتاً پلٹا تو فاریہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا، کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا وہ اس کے پیچھے کھڑی ہے۔

”آپ میرے لئے کمرے کا رنگ بدلیں گے؟“ فاریہ نے معصومیت سے پوچھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں تمہارے لئے۔“ تیسوڑ نے ہلکا سا مسکرا کر کہا، وہ اب تک برائیڈل ڈریس میں تھی، تیسوڑ وارڈ روب کی جانب بڑھا اور اس کے لئے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگا۔

”لیکن آپ کیوں کریں گے؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے لپٹا سنبھالتی ہوئی پھر سے اس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

”کیونکہ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے فاریہ کے لئے وائٹ اینڈ ریڈ کبھی نیشن والے ڈریس کا انتخاب کیا۔

”یہ لو پیچ کر لو، پھر ناشتے کے لئے ایک ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر جائیں گے۔“ وہ محبت سے بولا تو اس نے بنا کچھ کہے اس سے کپڑے پکڑے

”فاربیہ تم کہاں جانا پسند کرو گی؟“ مریم نے اس سے پوچھا تو وہ کئی لمحے سوچتی رہی۔
 ”جہاں سگون مل سکے، جہاں چین ہو، جہاں خلوص ہو، بے پناہ محبت ہو، آنکھیں بند کروں تو راحت ملے، آنکھوں کو کھولوں تو قرار آئے۔“ اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں جواب دیا تو مریم اور فیروز مسکرا دیے لیکن تیمور بخور اسے دیکھنے لگا اور کئی لمحے دیکھتا ہی رہا، ایسی ہی کسی جگہ کی تلاش اسے بھی تھی جسے فاربیہ نے بیان کیا تھا۔

تیمور نے ناشتہ کیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا، اس نے ہاسٹل سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی، وہ مکمل طور پر فاربیہ کو توجہ دینا چاہتا تھا اس کا خیال رکھنا چاہتا تھا، فاربیہ کمرے میں آئی تو وہ کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا، فاربیہ نے اسے مخاطب کئے بنا اپنا رخ ڈریسنگ ٹیبل کی جانب کیا اور آکر چوڑیاں اتارنے لگی، تیمور نے مڑ کر دیکھا تو وہ چوڑیاں اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔
 ”یہ کیوں اتار رہی ہو؟“ تیمور نے اس کے قریب آکر پوچھا۔

”مجھے ان کی چھن چھن اچھی نہیں لگ رہی، یہ شور کرتی ہیں تو میرا دل عجیب سا ہو جاتا ہے۔“ فاربیہ نے بیزار سے کہا تو وہ اس کی کلائی اپنے ہاتھ میں تھامتا ہوا اسے دیکھنے لگا، فاربیہ بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”فاربیہ کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو؟“ تیمور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”معاف! آپ کس چیز کی معافی مانگ رہے ہیں؟“ فاربیہ تاجھی سے بولی۔
 ”میں نے تمہارے ساتھ بلاوجہ اتنا سخت

”لگاؤ بھی۔“ تیمور نے دوبارہ کہا تو اس نے خاموشی سے لپ اسٹک اس کے ہاتھوں سے لی اور بڑی مہارت سے لگانے لگی، لپ اسٹک لگا کر اس نے تیمور کی جانب دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔

”اب چلو، ایک ساتھ چلتے ہیں ناشتے پر۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا تو فاربیہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

منصورہ بیگم ان دونوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر مسکرا دیں، تیمور خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، لیکن فاربیہ خاموشی سے کھڑی رہی۔
 ”بیٹھو بیٹا۔“ منصورہ بیگم نے نرمی سے کہا تو تیمور کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی، سب خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے، مریم اور فیروز بھی کھانے کی میز پر موجود تھے، مریم کو آج واپس چلے جانا تھا وہ بس تیمور کے نکاح کے لئے واپس آئی تھی، ناشتے کے دوران تیمور ایک دو بار نظر اٹھا کر فاربیہ کو بھی دیکھ لیتا کہ وہ کھانا ٹھیک سے کھا رہی ہے کہ نہیں۔

”تیمور تم فاربیہ کو کچھ دنوں کے لئے کہیں گھمانے لے جاؤ۔“ مریم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہوں، ضرور لے جاؤں گا۔“ تیمور نے ناشتہ کرتے ہوئے ہی جواب دیا۔

”کہاں لے کر جاؤ گے؟“ مریم نے فاربیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جہاں فاربیہ جانا پسند کرے گی۔“ تیمور کے جواب پر فاربیہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا جو ابھی بھی ناشتے میں ہی مصروف تھا، وہ ٹھیک تھی بھی اور نہیں بھی تھی، وہ پاگل نہیں ہوئی تھی، لیکن پاگل لگنے لگی تھی۔

روتے روتے پھر ہنسنے لگتی اور اس کی یہ حالت دیکھ کر تیمور کافی پریشان ہو گیا تھا، لیکن آج کافی دنوں بعد وہ اس طرح نارمل لگ رہی تھی، تیمور نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

”فاریہ، اللہ اپنے پیارے بندوں کو آزماتا ہے، کبھی دے کر، کبھی لے کر اور جنہیں وہ بہت محبت کرتا ہے انہیں وہ آزماتا بھی ضرور ہے تاکہ وہ ان کے دل میں اپنی محبت بھی جان سکے کہ اس مشکل وقت میں اب اس کا یہ پیارا بندہ اس سے گلے شکووں کی لسٹ لے کر اپنی شکایتیں کرے گا یا پھر اس کی دینی آزمائشوں کو خاموشی سے سہے گا اور ان پر پورا اترنے کی کوشش کرے گا۔“ تیمور نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے اس انداز میں جواب دیا کہ وہ مایوس نہ ہو سب اچھا ہو رہا ہے، تب اچھا ہونے جا رہا ہے، اور سب اچھا ہی ہوگا۔

”اچھا مجھے تمہیں کچھ دینا تھا۔“ وہ اٹھ کر اپنے وارڈ روپ کی جانب آیا اور اس میں سے کچھ نکال کر واپس فاریہ کی جانب بڑھا۔ ”یہ لو۔“ اس نے ایک چابی فاریہ کی جانب بڑھائی تو وہ نا سمجھی سے اسے گھورنے لگی۔

”یہ پچھلے گارڈن کی چابی ہے، جو کہ صرف میرے پاس ہوتی ہے، مجھے گھر کے اس حصے میں اپنے علاوہ کسی کا بھی جانا پسند نہیں، لیکن تم وہاں جب چاہے جا سکتی ہو۔“ تیمور نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں کیوں جا سکتی ہوں؟“ فاریہ کے سوال پر وہ کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا اور پھر اس کے ساتھ بیٹھتا ہوا دم لمبے میں بولا۔

”کیونکہ تم ایک اچھی لڑکی ہو اور اچھے لوگوں کے ساتھ میں ایسے احسانات کرتا رہتا ہوں۔“ وہ شرارت سے ہلکا سا مسکرایا تو فاریہ بھی

رو بہ اعتبار کئے رکھا، میں تم سے شرمندہ ہوں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ تیمور نے وضاحت کی، فاریہ نے نظریں جھکا لیں، چند ثانیے یونہی خاموش کھڑے رہنے کے بعد وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ جانتے ہیں تیمور، ماما کہا کرتی تھیں، جو نصیب میں لکھا جا چکا ہو وہ ہو کر رہتا ہے، چاہے وہ اچھا ہو یا برا اسے ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا اور وہ مجھے کبھی نہیں بس ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اللہ سے ضد، شکوے، شکایتیں ہر گز نہیں کرنی چاہئیں، اس سے اللہ ناراض ہو جاتا ہے، لیکن میں نے اللہ سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی، کبھی کوئی گلہ نہیں کیا، کبھی کسی چیز کے لئے ضد نہیں کی تو پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا جو بہت غور سے اسے سن رہا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا اللہ تم سے ناراض ہے، اللہ کبھی بھی اپنے بندوں سے ناراض نہیں ہوتا، وہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔“ تیمور نے نرمی سے اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے جواب دیا اور خود اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

”تو پھر اس نے مجھ سے پہلے میرے ماما بابا لے لئے، پھر میری محبت بھی مجھے نہیں ملی اور پھر دیکھیں بابا کا اتنی محنت سے بنا بنایا سارا کاروبار جل کر راکھ ہو گیا، کیا یہ سب میرے کسی گناہ کی سزا تو نہیں؟“ وہ کافی مضطرب سی لگنے لگی تھی۔

”تیمور مجھے لگتا ہے، میرے ہاتھوں کی لکیروں میں صرف کھونا لکھا ہے پانا نہیں۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جو کہ اچھا تھا وہ رو رہی تھی، ورنہ وہ کافی دنوں سے بس پاگلوں کی طرح ہنسی تھی اور اگر ہنستے ہنستے رو بھی دیتی تو

ہولے سے مسکائی، تیور کو اس کی مسکان اچھی لگی تھی، اس نے دل ہی دل میں اس کی اس مسکان کی نظر اتاری اور اسے ہمیشہ خوش رہنے کی ڈھیروں دعاؤں سے نوازا دیا۔

☆☆☆

دن گزرنے کے ساتھ اس کی طبیعت اب کافی بہتر ہو چکی تھی، وہ پہلے کی طرح نارمل رہنے لگی تھی، ماضی کے بارے میں سوچتی تو دوبارہ بڑھال سی ہونے لگتی اس لئے وہ تیور کے کہنے پر خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتی، کبھی چکن میں جا کر خانسماں کے ساتھ تیور اور منصورہ بیگم کی من پسند پکوان بناتی، کبھی لاونچ میں بیٹھ کر منصورہ بیگم کے ساتھ ٹی وی کے ساتھ ساتھ باتیں کر کے دل بہلاتی رہتی، منصورہ بیگم بھی اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھیں اور بھی کوئی کتاب پکڑ کر پڑھنے بیٹھ جاتی یوں خود کو مصروف کرنے کے بعد رات وہ کب سوئی اسے اندازہ ہی نہیں ہوتا، اکثر وہ سوچتی ہوتی اور اسے تیور کے آنے کی خبر صبح ہوتی جب وہ سو کر اٹھتی تو تیور کو سویا پاتی۔

رات کو بھی وہ تیور کے آنے سے پہلے ہی سوچتی تھی اور صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ بیڈ کی دوسری جانب گہری نیند سو رہا تھا، قاریہ بیڈ سے اتر کر اس کی سائیڈ پر آکھڑی ہوئی۔

وہ کافی تھکا تھا سا لگ رہا تھا، کچھ دنوں سے مسلسل وہ رات کی ڈیوٹی دیتا رہا تھا، اس کی پیشانی پر بکھرے بال بہت بھلے لگ رہے تھے، قاریہ نے بھی اس فرصت سے اسے نہیں دیکھا تھا، لیکن آج نہ جانے کیوں وہ اسے اتنے غور سے دیکھ رہی تھی، قاریہ نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے پیشانی پر بکھرے بالوں کو ہولے سے پیچھے کیا تو تیور کے وجود نے ہلکی سی حرکت کی تو وہ ڈر کر

پیچھے ہٹ گئی، اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

”جب نکاح کے مقدس رشتے میں دو لوگوں کو باندھا جاتا ہے تو دلوں کی پرواز چاہے کہیں اور ہی کیوں نہ ہو آکر وہ اپنے مقام پر یہ ٹھہرتے ہیں۔“ اور قاریہ کا مقام اب تیور کا دل تھا، قاریہ دانش روم کی جانب بڑھی اور فریش ہو کر چکن میں چلی آئی۔

ان کی شادی کو دو ماہ ہو چکے تھے اور دو ماہ میں اس نے ایک بار بھی تیور کی بیوی ہونے کا حق کسی بھی طرح ادا نہیں کیا تھا، جبکہ تیور ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ اسے خوش رکھ سکے اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

وہ تیور کی پسند کا ناشتہ بنانے لگی، ناشتہ بنانے کے دوران اسے اپنی ماما کی کبھی باتیں یاد آنے لگیں، ایک بار اس کی ماما اس کے بابا کے لئے ناشتہ بنا رہی تھیں جب وہ شرارت سے چکن میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔

”ماما آپ کیا ہر روز بابا کی من پسند کے کھانے بناتی رہتی ہیں، آپ انہیں مٹا کر کے چکروں میں ہوتی ہیں نا؟“ اس کی بات پر اس کی ماما مسکرا دیتیں اور مسکراتے ہوئے بولتیں۔

”جب تم بیوی بنو گی تو تمہیں بھی یہ سب کرنا اچھا لگے گا، تمہارا بھی دل چاہے گا کہ تمہارا شوہر ہمیشہ تم سے مٹا رہے۔“ وہ ان کی بات پر بے ساختہ ہنس دیتی۔

”مجھے نہیں بننا ایسی بیوی جو شوہر کے آگے پیچھے گھوم کر اس پیارے کو ہر وقت ڈسٹرب ہی کرتی رہے اور وہ بیوی کو بیوی کی جگہ بھانسی کا پھندا سمجھنے لگے۔“

”بھانسی کا پھندا تب سمجھا جاتا ہے جب

بمشکل بول سکی، تیور اس کی بات پر بے ساختہ مسکرا دیا۔

”تو اس میں اتنی پریشان ہونے والی کیا بات ہے فاریہ؟“ وہ اس کو دیکھ کر بولا۔

وہ خاموش رہی تو وہ ایک بار پھر اسی انداز میں مسکرایا۔

”اچھا میں ابھی فریش ہو کر آتا ہوں۔“ وہ بیڈ سے اتر کر واش روم کی جانب بڑھا اور کچھ ہی دیر میں واپس چلا آیا۔

”تم نے ناشتہ خود بنایا؟“ تیور نے بالوں میں برش کرتے ہوئے پوچھا تو وہ ہلکی سی آواز میں بس جی ہی بول پائی۔

وہ صوفے پر آکر بیٹھ گیا فاریہ اس کے لئے ناشتہ نکالنے لگی، اسے پہلی بار محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سامنے اس کی کوئی کزن نہیں بلکہ اس کی بیوی فاریہ ہے، قہقہے کے پراٹھے اس کے پسندیدہ تھے اور فاریہ نے بہت دل سے بنائے تھے۔

اس نے پہلا نوالہ لیا تھا فاریہ اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی کہ وہ کچھ کہے گا لیکن اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا وہ خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا تو فاریہ کا دل بچھ سا گیا، شاید اچھے نہیں بنے، اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

تیور نے اسے بھی اپنے ساتھ ناشتہ کرنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا کہ اسے ابھی بالکل بھوک نہیں ہے اور بنا بھوک کے وہ کھا نہیں سکتی، تیور نے زیادہ اصرار نہیں کیا، وہ اٹھ کر تیور کے وارڈ روب کی جانب چلی آئی اور اس کے لئے کپڑے نکالنے لگی، تیور اس کی ایک ایک حرکت پر غور کر رہا تھا، تو محبت کا زخم محبت سے ہی بھرا جا چکا تھا۔

اس نے اس کے کپڑے نکال کر بیڈ پر رکھے اور اس کا موبائل، والٹ، گھڑی، گاڑی کی

آپ میں انڈر شیڈنگ نہ ہو۔“ وہ سنجیدگی سے جواب دیتیں۔

وہ ناشتے کے دوران اپنی اور ان کی باتوں کو یاد کر کے مسکراتی بھی رہی اور آنکھوں کو غم بھی کرتی رہی، اس نے ناشتہ ریڈی کر کے پہلے ملازمہ کے ہاتھ منصورہ بیگم کے کمرے میں بھیج دیا اور پھر تیور کے لئے ناشتہ ٹرالی میں سجاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

تیور اب تک سو رہا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اسے کیسے جگائے؟ وہ کمرے میں ٹھٹھکی لگی کہ ہو سکتا ہے کچھ دیر میں وہ خود جاگ جائے لیکن پھر اسے ناشتہ ٹھنڈا ہو جانے کی فکر بھی تھی، وہ اس کے قریب آئی اور اسے جھپکے سے آواز دیتے ہوئے پکارنے لگی، لیکن وہ کافی گہری نیند میں تھا اتنی آہستہ دی گئی آواز میں کیسے جاگ جاتا۔

”تیور!“ اس نے پہلے کی نسبت ذرا بلند آواز میں پکارا تو تیور نے گروٹ تو بدل لی لیکن جاگا نہیں، وہ رو دینے کو بھی، اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے یوں جھنجھوڑا کہ وہ بچپارہ سہم کر اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہوا فاریہ، تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ نیند سے بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ فاریہ نے مسکرا کر کہا۔

”تو؟“ تیور نے نا سنجی سے اسے دیکھا۔

”تو..... تو..... وہ.....“ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے اور تیور اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی نئی فاریہ اس کے سامنے بیٹھی ہو۔

”تو..... وہ کیا؟“ اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں آپ کے لئے ناشتہ لائی تھی۔“ وہ

چاہی اس نے سب چیزیں سمیٹ کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر لارھیں۔

وہ آج اسے صحیح معنوں میں اپنی بیوی لگ رہی تھی، وہ اپنی بیوی کی جگہ کسی اور کو دیکھنا چاہتا تھا اور فاریہ تیور کی جگہ احسن کو، لیکن قدرت نے دونوں کے لئے کچھ اور سوچ رکھا تھا اور جو سوچ رکھا تھا وہ بہت بہترین تھا۔

دو ٹوٹے ہوئے لوگوں سے بڑھ کر ایک دوسرے کو کوئی نہیں سمجھ سکتا، جس درد سے فاریہ گزری تھی، اس زخم کی تکلیف تیور بھی محسوس کر سکتا تھا، کیونکہ محبت کا زخم چاہے جیسا بھی ہو تکلیف ایک ہی ہوتی ہے، اس نے ناشتہ ختم کیا اور اٹھ کر فاریہ کے قریب چلا آیا، جو ڈریسنگ ٹیبل کے دروازے سے کچھ نکال رہی تھی، تیور کو قریب کھڑا کر وہ سیدھی ہو گئی۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اجازت طلب نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں کسی سے بہت محبت کرتا تھا، اتنی کہ یہ محبت پھر نفرت میں بدل گئی، ہر لڑکی کو میں پھر اسی ایک ناکام محبت کی وجہ سے برا اور دھوکے باز سمجھنے لگا اور اس نفرت کا شکار تم بھی ہو گئی، میں نے تم پر بھی اپنا غصہ نکالا جس کے لئے میں تم سے معافی مانگ بھی چکا ہوں اور پھر مانگ رہا ہوں، میں نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم کبھی یہاں میرے سامنے میری شریک حیات بنی کھڑی ہوگی، میں یہاں کسی اور کے خواب دیکھتا تھا جو بہت پہلے ہی ٹوٹ چکے ہیں اور خوابوں کی کرچیوں نے مجھے اتنا زخمی کر دیا تھا کہ اپنی تکلیف کے سامنے مجھے دوسرا کوئی انسان نظر ہی نہیں آتا تھا، لیکن آج میں یہ کہنا چاہتا ہوں فاریہ، اچھا ہوا مجھے عینی نہیں ملی، کیونکہ عینی ویسی

تھی ہی نہیں جیسی بیوی میں چاہتا تھا۔“

”وہ محبت تھی، بچپنا تھا، جنون تھا کیا تھا میں نہیں جانتا لیکن فاریہ، مجھے تم سے محبت نہیں تھی لیکن اس کا آغاز ہو چکا ہے اور آج میں یہ دعویٰ کر رہا ہوں کہ عنقریب میں تمہارے عشق میں مبتلا ہونے والا ہوں۔“ وہ اس کی بات پر ہلکا سا مسکرائی تھی اور اسے مسکراتا دیکھ تیور بھی ہنس دیا۔

”مجھے بھی آپ کو کچھ بتانا ہے۔“ وہ شاید احسن کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن تیور نے اسے ٹوک دیا کہ اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، وہ پہلے سے سب جانتا ہے اس نے یہ نہیں کہا اس نے اس طرح بات کی کہ جو ہو گیا اس سے اسے کچھ لینا دینا نہیں، اسے بس اپنی آسندہ زندگی خوشحال چاہیے اور فاریہ کے ساتھ ہی چاہئے بس۔

”میں پوری کوشش کروں گی تیور کے آپ کو کبھی میری طرف سے کوئی شکایت نہ ہو۔“ اس نے ہلکی سی سرگوشی کی لیکن تیور سن چکا تھا اور اب وہ خوشدلی سے مسکرا بھی رہا تھا۔

محبت کا فسوں ہر جانب بکھرنے لگا، وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے، کھڑکی کے اس پر جمیل کی لہریں جمونے لگیں، ہوا میں رقص کرتی کھڑکی سے اندر داخل ہونے لگیں، تیور نے اپنا چہرہ فاریہ کے کان کے قریب کرتے ہوئے مدھم سی آواز میں فراس احمد کا ایک شعر پڑھا۔

عشق تو ایک کرشمہ ہے فسوں ہے یوں ہے یوں ہے تو کہنے کو کبھی کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے فاریہ کو اس کا یہ دلفریب انداز بھاسا گیا، اس نے ایک دلکش تہقیر لگاتے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چمپا کر گردن کو گرا کر دوبارہ اٹھایا، یوں کرنے سے اس کے بال شانوں پر بکھر

سے گئے۔

پتھریوں کی طرح بے دردی سے پیروں میں
رووند دے، سحر، جادو، فصول، اور اب اس محبت کہ
فصول نے ان دونوں کو سکون و چین بخش دیا تھا،
رنگوں کے تھال ہواؤں میں اچھال دیئے تھے،
دونوں دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے قریب
چلے آئے، تیور نے فاریہ کو دیکھا جو پورے دل
سے مسکرا رہی تھی۔

”اللہ کرے تم ہمیشہ اسی طرح مسکراتی رہو
اور اللہ کرے آپ بھی ہمیشہ یونہی میرے لئے
باعث مسکراہٹ بنے رہیں۔“ دونوں نے ایک
دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور اگلے ہی لمحے
فاریہ نے مسکراتے ہوئے شرما کر پکلوں کی جھار کو
گرنے دیا، تیور نے اس کی اس ادا کو سراہا اور
اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہوا واپس کمرے کی
جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

آسمان سے سونے چاندی کے پتے گرنے
لگے، کھڑکی کے اس پار جھیل کی مچلیوں میں جیسے
جل تھل سی مچ گئی اور ان کی اس آغاز محبت پر جھیل
کی مچھلیاں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے
لگیں۔

”آؤ آؤ سب دیکھیں، نکاح میں دو
بندھے لوگ کس طرح اپنی محبت کا آغاز کر رہے،
اقرار کر رہے ہیں، اظہار کر رہے ہیں۔“ وہ آچل
ہوا میں لہرائی ہوئی کمرے سے گھر کے مچھل
جانب کے گارڈن کا دروازہ کھول کر بھاگتی ہوئی
باہر آگئی، تیور بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

ہلکی ہلکی رم جھم برس رہی تھی، وہ کھلی فضا
میں جھومنے لگی، تپتیاں اس کو دیکھ کر مسکرانے
لگیں، جی فاریہ کو دیکھ کر جو بس رونا جانتی تھی آج
وہ کیسے دل سے مسکرا رہی تھی، گارڈن میں گھومتے
موروں نے بھی اپنا جادو دکھایا اور اس کی خوشی
میں تانے لگے، ہر طرف خوشیوں کی بارش برسنے
لگی، کیونکہ دل کو چین مل گیا تھا قرار آ گیا تھا، در
حقیقت ایک محرم کی محبت کا شوقیت مل گیا تھا، وہ
دونوں محبت کے ڈسے سے تھے اور ان دونوں کے زہر
کا علاج محبت سے ہی ممکن ہوا تھا، فاریہ نے مسکرا
کر دور کھڑے تیور کو دیکھا جو دونوں ہاتھ سینے پر
باندھے مسکراتا ہوا اسی کو دیکھ رہا تھا، دونوں کو ایک
دوسرے سے محبت نہیں تھی لیکن اس کا آغاز ہو چکا
تھا۔

اور اس پاک محبت کا انجام یقیناً بہت اچھا
ہوتا تھا، محبت نے اپنے جادو سے دونوں کی
زندگیوں کو پھر سے رنگ ڈالا، محبت نام ہی جادو کا
ہے جس کو چاہے رنگوں سے بھر دے اور جس سے
چاہے زندگی کے سب رنگ چھین ڈالے، جس کو
چاہے کھلا گلاب بنا ڈالے اور جسے چاہے گلاب کی

چھی کتابیں

پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

☆..... اور دی آخری کتاب

☆..... تھارگرم

☆..... دنیا گل ہے

☆..... آوارہ زندگی ڈائری

☆..... ابن بطوطہ کے کتاب میں

☆..... اکید می

☆..... 042-37321690, 3710797

شہر دلدار اسٹہ

تحسین اختر

”گلتا ہے حرم کو خاصا دکھ ہوا ہے تمہاری اور میری شادی کا۔“
 پہلی سروس کھیتوں میں کھلی ہوئی تھی اور وہ
 دانیہ کو لے کر سہری دھوپ میں کھیتوں کی طرف
 نکل آیا تھا کہ گاؤں آکر دانیہ کی بے زاری جانی
 ہی نہ تھی، وہ کسی نہ کسی طرح اس کا دل بہلائے
 رکھنا چاہتا تھا۔

”کیوں؟ اسے کیوں دکھ ہونے لگا۔“ دانیہ
 کے منہ سے بالکل انوکھی اور عجیب سی بات سن کر
 وہ ٹھٹھک کر رک گیا تھا، وہ جیسے اسے آگ لگا کر
 مزے لینے لگی تھی، سروس کے پہلے پھول توڑتے
 ہوئے اس نے اک ادا سے موصد کی طرف دیکھا
 تھا جیسے اس بھیلی کو بوجھ لینے پر وہ اسے کوئی بڑا
 انعام دینے والا تھا۔

ناولٹ

”مجھے تو ایسا ہی لگا۔“ وہ بے نیازی سے

بولی تھی۔

”ہونہہ، تمہارا وہم ہے۔“ وہ پھٹکی سی ہنسی
 ہنس کر بولا تھا، جیسے سروس کے پہلے پھولوں کی
 تازگی برقرار تھی ایسے ہی اس کے لہجے کی چوری
 بھی محسوس کرنے والے کو محسوس ہوتی تھی۔
 ”ہاں شاید میرا وہم ہی ہو، مگر جس طرح
 اسے دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں چمک آئی تھی، وہ
 میرا وہم نہیں ہو سکتا۔“ وہ خالص پیویوں والی
 مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولی تھی۔

”دیکھو حرم اور میں بچپن سے ایک ساتھ
 کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں، ایک ساتھ رہتے
 رہے ہیں، میرے گھر والے اسے جانتے ہیں اور
 اس کے گھر والے مجھے، ہم دونوں اگر ایسا چاہتے
 تو ہمیں کون روک سکتا تھا، اس لئے تم اس قسم کے
 فضول سے وہم مت ہی پاؤ تو اچھا ہے۔“ وہ چلتے
 چلتے اس کے سامنے آیا تھا اور اس کے دونوں
 ہاتھ پکڑ کر اسے یقین دہانی کروانے لگا تھا، کل



گیارہویں قسط



رات عابدہ نے کانچ کی ہری اور لال چوڑیاں زبردستی وانیہ کی کلائیوں میں چڑھا دی تھیں، وہ چوڑیاں اب موحّد کے ہاتھوں تلے دبی سراپا احتجاج تھیں۔

”کچھ مجبوریوں بھی تو بن جاتی ہیں اکثر۔“ اس نے اپنے ہاتھ چمڑوائے تھے اور آگے آگے چلنے لگی تھی۔

”مجھے کوئی مجبوری نہیں تھی۔“ وہ واپس مڑا تھا، دل زبان کا ساتھ نہ دے پا رہا تھا، اس لئے آگے بڑھنے کا اب کیا فائدہ رہا تھا، چند قدم آگے جا کر اسے پشت پر خاموشی کا احساس ہوا تو اس نے واپس مڑ کر دیکھا تو موحّد گھر والی راہ جا رہا تھا، وہ بھی پیچھے مڑی تھی۔

”مجھے تو ساتھ لے جاؤ۔“ اس نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔

”تم خود آ سکتی ہو میرے پیچھے۔“ موحّد نے طنز کیا تھا، اس طنز میں جانے کس زمانے کی بات چھپی ہوئی تھی، وہ بھاگ کر اس کے ساتھ آئی تھی، وہ دونوں جب گھر میں ایک ساتھ داخل ہوئے تھے تو دونوں کے منہ پھولے ہوئے تھے، عابدہ آج صبح گھر واپس جا چکی تھی کیونکہ آج انہیں عابدہ کی سسرال اس کے سر کی تعزیت کے لئے جانا تھا، اماں این کی آہٹ سن کر جلدی سے اندر سے برآمد ہوئی تھی۔

”بسم اللہ، آگے تم لوگ۔“

”ہاں اماں، اماں بانی تو پلواؤ۔“ وہ صحن میں بچھی چار پائی پر ڈھیر ہو گیا تھا، جبکہ وانیہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی تھی، کچے کپے راستوں پر چلنے سے جو دھول پیروں کے ساتھ چٹ گئی تھی اس دھول کو اتارنا ضروری تھا۔

”یہ لے پتر۔“ اماں لسی کا گلاس بھر لائی تھی، پتر نے لسی کا ترہتر گلاس پکڑ کر لیوں سے لگا

لیا تھا۔

”چلو پتر تم لوگ تیار ہو جاؤ، عابدہ کی طرف جانا ہے۔“ وانیہ نے بھی توجہ سے چہرہ تھپتھپاتے ہوئے اماں کی بات سنی مگر رک نہیں تھی اور اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی، وہ بھی لسی کا خالی گلاس زمین پر رکھ کر اس کے پیچھے اندر کی طرف گیا تھا۔

”اماں کہہ رہی ہیں تیار ہو جاؤ، عابدہ کی طرف جانا ہے۔“ اس نے اماں کے الفاظ من و عن دھرائے تھے۔

”میں بہت تھک گئی ہوں، آپ دونوں ہو آؤ، میں نہیں جاؤں گی۔“ ابھی تھوڑی دیر پہلے کا غصہ اتر نہیں تھا۔

”اچھا اگر مجھے اکیلے کو ہی جانا ہوتا تو مجھے تمہیں شہر سے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی، میں اکیلا ہی نہ چلا آتا۔“ گاؤں آ کر وہ شیر بن گیا تھا، بلکہ جس دن سے اس نے وانیہ کے عاق ہونے کی خبر سنی تھی، وانیہ اسی دن سے اس کے لئے بے مول ہو گئی تھی، وہ اسی دن سے شیر بنا بیٹھا تھا۔

”اگر آپ اکیلے بھی چلے جائیں گے تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔“

”پھر وہی بات، تم سمجھتی کیوں نہیں ہو وانیہ، یہ شہر نہیں ہے، یہ گاؤں ہے، یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں اور نزاکتوں کا بھی بہت خیال رکھا جاتا ہے۔“ وہ اس سے بحث میں نہیں جیت سکتی تھی اور پھر اس کی اماں کے سامنے کم از کم کوئی تماشہ کھڑا کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے چپ چاپ کپڑے نکالنے لگی تھی۔

☆☆☆

نواد تنویر کے ساتھ مشائم علوی نے اپنے روز و شب سجاو لئے تھے مگر دل میں نہال نام کی

جو ہوک تھی وہ اٹھتی ہی رہتی تھی۔

سن درد پیا، ہمدرد پیا

سب لوگ یہاں بے درد پیا

ہم آنکھیں بھی نہ کھول سکیں

یہاں ہر سوگم کی گرد پیا

یہ آنگن تجھ بن سوتا ہے

تو میرے دل کا فرد پیا

میں تیرے بن بے جان بہت

میری تجھ بن سائیں سرد پیا

تیرا دل کے بچ مقام پیا

تیرا سب سے اونچا نام پیا

کوئی وصل عنایت کر ہم کو

کبھی جہر کا کر انجام پیا

تیری ذات بڑی تیری بات بڑی

میں بے وقت بے نام پیا

تجھے تیری صورت دھتی ہے

ہر لہر ہر گام پیا

کبھی میرا حال سنو آکر

تجھے مار نہ دیں ابہام پیا

کبھی ہم سے بھی دل کی پوچھو

کر وہم سے آج کلام پیا

ہمیں زرد لگے ہر دن تجھ بن

ہمیں ڈستی ہے ہر شام پیا

میرا صاحب سو ہنا ڈھول سائیں

میرا کلکشن گلغام پیا

میرا بخت رسا میرا دھن دولت

میرے رب کا تو انعام پیا

”کیا سوچ رہی ہو۔“ فواد نے ڈرائیونگ

کرتے ہوئے اسے گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ

کر پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ نہال کے خیالوں سے

چوکی تھی۔

”کچھ تو سوچا جا رہا تھا جناب، کیا مجھے۔“

”خوش فہمی۔“ وہ ہنسی تھی۔

”ہاں میں تو ساتھ ہوں پھر مجھے کیا

سوچنا۔“ اتنے میں گاڑی تھوڑا سا لہرائی گئی۔

”تم دیکھ کر ڈرائیونگ نہیں کر سکتے، ابھی

اس سائیکل والے کو نیچے دینے لگے تھے۔“

”اب تمہیں دیکھوں یا گاڑی کو، یار میرا بھی

تو سوچو نا، کتنا مجبور ہوں اس وقت۔“ اس نے

مسکین سی شکل بنائی تھی۔

”فی الحال تو تم بس گاڑی کو دیکھو، کیونکہ

مجھے ابھی بہت سال جینا ہے، مجھے ویسے بھی

تمہارے ساتھ مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”بڑی ظالم ہو تم۔“

”ہاں ہوں۔“ وہ اترا کر بولی تھی اور گاڑی

سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆

بڑے دنوں بعد گھر میں سب لوگ جمع تھے

اور ایسا اتفاق ڈنر پر کبھی نہیں ہوا تھا، مشائم، مہمی،

چپا ڈنر کے لئے بیٹھے تھے جب یاشر ہنگی کا ہاتھ

تھاے اندر داخل ہوا تھا، مشائم تو لہجہ بھر میں جان

گئی تھی کہ یہ وہی لڑکی ہے جو اس دن اس نے اور

فواد نے پی سی میں دیکھی تھی۔

”ہیلو ایوری ہاؤ۔“ یاشر نے خوش دلی

سے ٹیبل کے قریب آکر کہا تھا۔

”آؤ آؤ بیٹا۔“ مسز علوی نے جلدی سے

بیٹے اور اس کی گرل فرینڈ (وہ اسے گرل فرینڈ ہی

سمجھتے تھے) کا استقبال کیا تھا۔

”پنگی مائی مام، ڈیڈ اور یہ مٹی۔“ یاشر وہیں

کھڑے ہاتھ کے اشارے سے ان لوگوں کا

تعارف کروانے لگا تھا۔

”ہائے۔“ اس نے ایک ساتھ ہی سب کو

نمنا دیا تھا۔

”او کے۔“ مٹی پیت بھر کر کھا چکی تھی، اس نے پلیٹ پر بے کھسکاٹی مٹی اور اٹھ کر باشر کے کمرے کی طرف آگئی تھی، اسے کم از کم پنگی بھا بھی کے روپ میں بری نہیں لگی تھی، علوی صاحب بھی کرسی کھسکا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے۔

”مام پلیز وہ زیادہ دن نہیں رہے گی، بس دو چار دن یہاں رہے گی، اس لئے اسے اچھا پروٹوکول ملے تو ویل اینڈ گڈ، ورنہ دو تین دنوں سے وہ بی سی میں رہ رہی ہے میں اسے دوبارہ وہیں شفٹ کر دوں گا، آپ کو تو پتہ ہے میں اپنی چیزوں اور اپنے لوگوں کے بارے میں کتنا پوزیسو ہوں۔“ وہ مام سے دو ٹوک الفاظ میں کہہ کر بیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

آج تک باپ ستاتا آیا ہے اور اب بیٹا اپنے رجب ڈھنگ دکھانے لگ گیا ہے، مسز علوی کو تو ساری عمر علوی صاحب کے عشقوں نے سولی پر لٹکائے رکھا تھا اور اب یاشر بھی باپ جیسا ہی نکلتا تھا، وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

☆☆☆

”اماں کیا بات ہے بڑی صفائیاں ہو رہی ہیں۔“ وہ سو کر اٹھی تو لیتی بیگم باپ پکڑے محسن دھو رہی تھی، حالانکہ وہ تو کئی گنی دن محسن میں ڈھنگ سے جھاڑو نہیں لگاتی تھی، فرش کا منہ دھلوانا تو بس حرم کی ہی ذمہ داری تھی، اس لئے آج خلاف توقع لیتی بیگم کو باپ پکڑے دیکھ کر پوچھے بتا نہ رہی تھی۔

”تیرے لئے ہی کر رہی ہوں۔“
ابا محسن کے ایک کونے میں پچھی چار پائی کی ادوائن کس رہا تھا اور کان لپیٹے کس رہا تھا۔
”میرے لئے؟“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔

”اور یہ پنگی مائی وائف۔“ اس نے ایک دھماکہ ہی کیا تھا، وہ اگر گرل فرینڈ یا کچھ اور بھی جو بھی کہتا، کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا، مگر تب کے تب کو شک میں مبتلا کر دیا تھا، سب سے پہلے علوی صاحب نے پلیٹ پر بے کھسکاٹی مٹی اور ماتھے پر مل لئے اس حسین و جمیل لڑکی کو ایک نظر دیکھ کر اپنے بیٹے پر نظریں گاڑ لی تھیں۔

”یاشر یہ کیا مذاق ہے۔“
”ڈیڈ یہ مذاق نہیں ہے، میں نے اور پنگی نے لندن میں میرج کر لی تھی اور یہ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے۔“
”اور تم نے ہمیں بتایا تک نہیں۔“ مسز علوی کو شکاک کے بعد ہوش آیا تھا۔

”اب بتا تو رہا ہوں۔“ مشائم خاموشی سے جاول ٹوٹتے ہوئے اس ڈرامے کو دیکھ اور سن رہی تھی، جس طرح کا ان کے گھر کا ماحول تھا یا جتنا وہ فیملی بزرگ دوسرے کے گھروں میں اس میں مام ڈیڈ کا اس طرح کاری ایکشن کم از کم اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”مگر بیٹا تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو، ہمارے کتنے ارمان تھے تمہاری شادی کے۔“
”اوہ مام، کیسی مڈل کلاس عورتوں جیسی باتیں کر رہی ہیں، مجھے تو یوج میں آپ کے منہ سے ایسی باتیں سن کر بہت فنی لگ رہا ہے۔“

”اور تم کیا سن رہی ہو جاول بی بی کو میرے کمرے میں لے جاؤ۔“ مام کو کہنے کے ساتھ ہی اس نے ذرا دور کھڑی ملازمہ کو سختی سے کہا تھا، وہ جلدی سے پنگی کا ہینڈ کیڑی اٹھا کر اور اسے ساتھ لے کر بیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔

”مٹی جاؤ اپنی بھا بھی کو سمجنی دو۔“ پھر وہ مش کی طرف مڑا تھا۔

”ہاں تیرے لئے اور کس کے لئے۔“

”مگر کیوں، میرے کون سا خدا خواستہ راتوں رات سرخاب کے پر نکل آئے ہیں جو میرے لئے اتنا کچھ ہو رہا ہے۔“

”ارے جب لڑکیوں کے پرد کھاوے کے لئے لوگ آتے ہیں تو لڑکیوں کے پر ہی نکل آتے ہیں۔“

”کیا مطلب اماں؟“

”مطلب و مطلب کچھ نہیں، بھابھی اور توحید

آ رہے ہیں۔“

”بھابھی اور توحید مگر کس خوشی میں۔“ وہ جانتے بوجھتے بھی انجان بن رہی تھی۔

”ارے پچھلے مہینے سے کھپ رہی ہوں، تمہارا رشتہ مانگ رہے ہیں، بس میں اور تمہارا ابا راضی ہیں تو بس یہی کافی ہے، اب تم سے کیا صلاح مانگیں، ہم تمہارے ماں پو ہیں جو کریں گے بھلے کو ہی کریں گے۔“ اماں نے اس بار اس کے کہنے کے لئے کوئی منجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

”تمہیں شہر نوکری کرنے کے لئے بھیج دیا، بڑھا لکھا دیا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں بالکل ہی کھلا چھوڑ دیا کہ جو تم چاہو وہ کرو۔“ اماں کی باتیں حریم کی سماعتوں کو کہاں سنائی دے رہی تھیں، وہ ابا کے پاس دوڑی گئی تھی، ابا ہمیشہ کی طرح چارپائی کی ادوائن کس کے کان لپیٹے باہر نکلے تو تھا جب حریم نے اس کا بازو تھام لیا تھا۔

”ابا آج تم ایسے باہر نہیں جاسکتے، میری بات سن کے جانا ہوگا۔“ وہ ابا کا بازو تھام کر اندر کمرے میں لے آئی تھی۔

”میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا نا کہ میں توحید سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو کیا آپ اماں کو اپنی سی بات نہیں سمجھا سکتے۔“ وہ جارحانہ انداز

میں ابا کو کمرے میں لے جا کر بولی تھی۔

لہجی بیگم پاپ اور جھاڑو چھوڑے کمرے کے دروازے پر آکھڑی ہوئی تھی۔

”ابا آج آپ کی بیٹی کی قسمت کی بات ہے آج آپ یوں چپ نہیں رہ سکتے۔“ وہ جانتی تھی لہجی بیگم کا دروازے میں کھڑے ہونا اور ابا کو گھور گھور کر دیکھنا ہی ابا کی کمزوری تھی۔

”تو پھر تمہیں کہاں کرنی ہے شادی۔“ شہباز نے بیٹی کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

”وہیں شہر میں، میرے ساتھ نوکری کرتا ہے، نہال نام ہے اس کا۔“ اس نے ایک نظر لہجی بیگم کو دیکھا تھا اور ابا سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”دیکھا..... دیکھا یہ کروت ہیں تمہاری شہزادی کے، میں یونہی نہیں سمجھتی تھی کہ اس کو رسہ ڈالو مگر تم نے بھی میری سنی جواب سنتے، اب دیکھ لیتا جب سارے پنڈ کو پتہ چلے گا کہ شہباز کی بیٹی نے کیا چاند چڑھایا ہے۔“

”آپ تو چپ کریں آپ کا ہم باپ بیٹی کے معاملے میں یوں ضروری ہے کیا۔“ اس نے لہجی بیگم کو چپ کروانے کی کوشش کی تھی، مگر لہجی بیگم کہاں چپ رہنے والی عورت تھی۔

”اچھا تو اب میں کوئی اور ہوگئی۔“ وہ تو سر پٹنے لگی تھی، ویسے وہ سوتیلی ماں ہی تھی اور سوتیلی ماں کی تعریفوں پر پوری طرح فٹ آتی تھی مگر جب بات اپنے مفاد کی ہوتی تو وہ جھٹ پینترا بدل کر الفاظ اور جملے اور رشتے سبھی کچھ بدل لیا کرتی تھی۔

اس کے اس درد بھرے واویلے پر شہباز کا دل ڈولنے لگا تھا جبکہ حریم نے نفرت بھری نگاہ نام نہاد ماں پر ڈالی تھی۔

”دیکھا..... دیکھا یہ مجھے ایسے گھورتی ہے

”کیا یاشر نے شادی کر لی ہے وہ بھی ہم سب کو بتائے بغیر۔“ مشائم نے مریم کو فون پہ بتایا تو سب کی طرح اسے بھی سن کر شک لگا تھا، وہ اگر چکی کو گرل فرینڈ اور پارٹنر اور جانے کیا کیا بنائے رکھتا تو شاید کسی کو اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا اس کی شادی کا سن کر ہوا تھا۔

”اچھا پھر تو وہ بے حد چالاک ہوگی جس نے یاشر کو قابو کر لیا، ورنہ وہ تو اتنی جلدی کسی کے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔“

”ہاں چالاک بھی اور بے حد حسین بھی۔“ مشائم بولی گئی۔

”یاشر نے آدمی دنیا گھوم رکھی ہے اور حسین سے حسین صورتیں دیکھ رکھی ہوں گی اس نے، اس نے کون سا حسن پہلی بار دیکھا ہوگا۔“

”ہاں یہ بھی ہے مگر چکی میں کچھ تو الگ دیکھا ہوگا جو اس سے شادی کر لی۔“

”اچھا اب مام اور ڈیڈ کیا کہتے ہیں۔“

”ڈیڈ تو کچھ خاص نہیں بولے، مام نے بھی تھوڑا بہت غصہ شو کیا مگر پھر نارمل ہو گئیں۔“

”ہاں انہیں نارمل ہونا ہی تھا، آخر وہ دونوں یاشر کو کیا کہہ سکتے تھے، ان دونوں کے معاشقے اور دوستیاں تو ابھی تک ختم نہیں ہوئیں بیٹے کو کیا کہیں گے، اب مام ایک فنکشن ارنج کرنا چاہتی ہیں جس میں وہ یاشر بھائی کی شادی کو اٹاؤس کر سکیں۔“

”اہا، اہا، اب وہ بھی کر سکتی ہیں۔“ مام کی حالت پر مریم نے قہقہہ لگایا تھا۔

”آپ ہنس رہی ہیں۔“

”تو اور کیا کروں، جب اولاد کے لئے فیصلہ کرنے کا وقت تھا تو مام اور ڈیڈ دونوں کے پاس وقت نہیں تھا تو اب جبکہ اولاد اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہو گئی ہے تو اب کیوں ٹینشن

جیسے کیا کھا جائے گی، ارے اگر آج اس کی جگہ میری سگی اولاد ہوتی تو کیا میرے ساتھ ایسے سلوک کرتی، ارے مجھے لوگ کتنا کہتے تھے تو جتنا مرضی ماں بن کر دکھا دے آستین میں سانپ پال رہی ہے یہ اولاد تیری نہیں بننے والی۔“

”اور مجھے اسی پنڈ کے لوگ کہتے تھے کہ یہ تیری سگی ماں نہیں بننے والی اور آج آپ نے اس بات کا ثبوت بھی دے دیا۔“ وہ بھی دوہرہ بولی گئی۔

”ابا مجھے کسی اور کی بات نہیں سننی بس آپ کو بتا رہی ہوں، مجھے بس نہال سے شادی کرنی ہے، آپ جب کہیں گے وہ اپنی امی جان کو یہاں ہمارے گھر لے آئے گا۔“ حرم جانتی تھی لیکن بیگم کا یہ ماتم رات تک جاری رہنے والا تھا، اس لئے اس نے باپ سے دو ٹوک بات کی تھی اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئی تھی۔

”ارے گڈو کے ابا بھی چپ بیٹھ ہو، ایسی بیٹی کو تو مار کر اسی صحن میں گاڑ دو تو دکھ نہ ہو۔“ اس نے گم صم بیٹھے شہباز کا کندھا ہلایا تھا اور شہباز کو پوری طرح اکسایا تھا۔

”تم سے ہی وہ گھر میں پڑی برداشت نہیں ہوتی تھی، میں نے تو نہیں کہا تھا اسے شہر میں بھیجو نوکری کرنے، تمہیں ہی پیسہ چاہیے تھا پیسہ، اب میں کیا کروں۔“

وہ جوان جہان اور کماؤ بیٹی کو بھی کچھ نہ کہہ سکتا تھا اور سر چڑھی بیگم کو بھی چپ نہیں کروا سکتا تھا اس لئے ہمیشہ کی طرح کھیس منہ پر ڈالا تھا اور لمبی تان کر لیٹ گیا تھا، لیکن بیگم یہاں دال نہ کھتی دیکھ کر اب صحن میں کھڑے ہو کر اونچا اونچا بول رہی تھی آخر کو دو چار ہمسائے بھی سن لیتے تو کیا حرج تھا۔

سمجھ کر ہنسنے لگی تھی۔

”اچھا سنو، وہ تمہاری دوست تھی نا، کیا بھلا سا نام تھا اس کا۔“ مریم نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں یاد آیا، حریم شہباز، وہ کہاں ہے آج کل، تم اب اس کا ذکر کم کم ہی کرتی ہو۔“ مریم کو چلتے چلتے یاد آیا تو مشائم سے پوچھنے لگی تھی گویا مشائم کی دھڑکی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”وہ پینڈو۔“

”کیا مطلب، پینڈو۔“ مریم اس کی طرزِ مخاطب پر حیران ہوئی تھی۔

”ہاں کسی گاؤں کی ہے، لیکن جب ایسی لڑکیاں شہر آتی ہیں تو بڑے اونچے اونچے خواب دیکھنے لگتی ہیں اور اکثر اپنی اوقات دکھا جاتی ہیں۔“

”کیا ہوا، کوئی لڑائی جھگڑا ہو گیا اس سے۔“

”نہیں کوئی نہیں۔“ مشائم نے ٹالنا چاہا تھا۔

”مشائم ایسی بات تو نہیں، کچھ تو ہے، جس کو تم مجھ سے چھپانا چاہ رہی ہو، پلیز مجھے کھل کر بتاؤ کہ کیا بات ہے۔“

”ارے آپ کی کوئی بات نہیں۔“

”مشائم کچھ تو ہے۔“ مریم بھی بغد ہوئی تھی۔

مشائم نے ایک لمبا سانس کھینچا تھا۔

”نہال شیخ یا شہر بھائی کے آفس میں کام کرتا ہے، بس یونہی آتے جاتے مجھے اس سے محبت ہوئی میں نہیں جانتی اور محبت بھی ایسی کہ جس نے پھر سب کچھ بھلا دیا مگر وہ مجھ سے محبت نہیں بلکہ نفرت کرتا ہے اور حریم شہباز جو ایک مجبور لڑکی تھی مجھے جب ہاسپٹل میں ملی تو میں نے

لے رہے ہیں۔“

”اچھا میں آؤں گی ڈرنک، پگنی سے ملنے اور دیکھنے بھی کہ آخر وہ کیا شے ہے جس نے یا شہر علوی کو قاتل کر لیا۔“

”کیا اکیلی ہی آئیں گی۔“

”ہاں اکیلی ہی آؤں گی۔“ مریم نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

منصور آج یوں بھی ڈرنک کے لئے لیٹ تھے اس نے کال کر کے انہیں بتا دیا تھا اور خود رانیور کے ساتھ اپنے گھر آ گئی تھی۔

”کہاں ہیں دونوں۔“ نام سے ملنے کے بعد وہ مشائم کے روم میں آ گئی تھی۔

”اپنے کمرے میں ہیں، ڈرنک ویٹ کریں گی یا میں بلاؤں یا شہر بھائی کو۔“

”نہیں رہنے دو، کھانا لکھنے میں تھوڑا سا تو وقت رہ گیا ہے، آؤ تب تک باہر لان میں تھوڑی واک کرتے ہیں۔“

”لوگ کھانا کھانے کے بعد واک کرتے ہیں اور آپ پہلے۔“ مشائم نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”واک پہ کون سا باندی ہے جب دل چاہے کر لو۔“ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے باہر لان میں آ گئی تھیں۔

”ڈیڈ کہاں ہیں؟“

”چار بجے کی فلائیٹ سے ترکی گئے ہیں۔“

”اوہ کب آئیں گے واپس؟“

”دس دن بھی لگ سکتے ہیں اور زیادہ بھی۔“

”ساتھ کون گیا ہے؟“ مریم نے ذومنی انداز میں پوچھا تھا۔

”گھر سے تو اکیلے ہی گئے ہیں۔“ مشائم

نے بھی باپ کا مذاق اڑایا تھا، مریم اس کی بات

رہتی جب ابا نے برآمدے میں کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا تھا کہ لٹی بیگم بھی نہ لے۔

وہ رشتہ سگا اور خون کا تھا بے شک اس رشتے پر جتنا مرضی گہرا اور پکارنگ لٹی بیگم نے اپنی مرضی کا چڑھا رکھا تھا مگر پھر بھی خون تو جوش مارتا ہی ہے نا۔

”تو آپ کو اس سے کیا، بیمار پڑ جاؤں مر جاؤں۔“ وہ سفاکی سے بولی تھی۔

”مجھے ہے تو تمہیں کہہ رہا ہوں نا۔“ وہ ابا کی مجبوری سمجھتی تھی شاید، اس لئے ہیکے کپڑوں سمیت غسل خانے میں غصے لگی تھی، ادھر شہباز نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔

”مل لو مجھ سے پھر شاید جلدی نہ آسکوں۔“ اس نے اپنا بیگ تیار کر کے رکھ لیا تھا، اگلے دن کا سورج پوری آب و تاب سے طلوع ہوا تھا، اس نے ابا کے گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنے اس فیصلے کے بارے میں سب سے پہلے چاندنی کو آگاہ کیا تھا۔

”کیوں۔“ چاندنی اس کے الفاظ پر نہیں لیچے پھر حیران ہوئی تھی، وہ محسن میں جھارو پھیر رہی تھی، جھارو وہیں چھوڑ کر اٹھ کر اس کے پاس آ گئی تھی۔

”ابا کی بیوی نے میرا گھر پر رہنا حرام کر دیا ہے، اگر میں تو حید سے شادی کر لیتی ہوں تو ٹھیک ورنہ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔“

”یہ خالہ نے کہا تم سے؟“

”ہاں۔“

”پھر اب؟“

”کچھ بھی نہیں بس شہر میں ہی رہوں گی جیسے پہلے رہ رہی تھی، پہلے بھی اپنا کمائی اور کھائی تھی اب بھی ایسے ہی کروں گی ہاں پہلے ایک گھر اور کچھ رشتوں کی ہو کہ رہتی تھی تو پیچھے دوڑتی تھی

اسے یا شرم بھائی کے پاس نوکری دلا دی تو وہیں وہ اور نہال ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے، بس اتنی سی کہانی ہے، اس نے میری محبت پر ڈاکا ڈالا پھر وہ میری دوست کیسے ہو سکتی ہے، اس کے دکھ سے تو میں ہاسٹل چھوڑ کر دوبارہ گھر آ گئی ہوں۔“ وہ لٹی سے مریم کو سب بتاتی گئی تھی۔

”اوہ۔“ مریم کو اپنی چھوٹی بہن کے دکھ پر بہت دکھ ہوا تھا۔

”تم کہو تو میں بات کروں نہال سے۔“ کتنی ساعتوں کے بعد مریم بولی تھی۔

”آپ کیا میری محبت کی ہیکے مانگیں گی۔“ مریم اس کی بات پر چپ رہ گئی تھی۔

”لی بی جی، کھانا لگ گیا ہے بیگم صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش تھیں جب ملازمہ نے آ کر اس خاموشی کو توڑا تھا۔

☆☆☆

نیم کے درخت پر تاڑ تاڑ برش برس رہی تھی، جریم نے شہر میں بھی بہت بارشیں دیکھی ہیں مگر جو رونق گاؤں کی بارش لگاتی ہے وہ مزہ شہر کی بارش میں کہاں، اس نے گہرے کالے بادلوں کو دیکھ کر جلدی سے سارے محسن میں بکھری چیزیں اکٹھی کرنا شروع کر دی تھیں، لٹی بیگم منہ پر لیپٹے اندر بڑی تھی، وہ محسن میں پڑے روٹیوں کے خشک ٹکڑے جمع کر رہی تھی جو بعد میں بکھو کر مرغیوں کو خوراک کے طور پر ڈالتے تھے کہ اچانک کالے بادلوں نے برسات شروع کر دیا تھا، وہ محسن میں ادھر ادھر پھرتی رہی تھی اور جان بوجھ کر خود کو بھگوئی رہی تھی، چھتوں کے پرنالے بہنے لگے تھے اور کچے کچے محسن میں پانی کی آبشاریں سی بہنے لگی تھیں۔

”کیا بیمار پڑو گی۔“ وہ جانے کب تک بھکتی

مگر اس بار پر ہوک ختم کر کے جا رہی ہوں۔“
 ”نہیں ایسے مت کہہ جوری۔“ چاندنی
 جلدی سے اس کے ساتھ چٹختی تھی۔

”پھر بتا کیا کروں، اس دے لے لے اور کھو
 باز سے شادی کر لوں اور اپنی زندگی کو آگ لگا
 دوں، بتا اگر تو کہتی ہے تو ایسا ہی کر لیتی ہوں۔“
 اس کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

”کوئی اور راہ نہیں ہے۔“
 ”نہیں، تو حید یا دیس نکالا۔“
 ”بہت ظالم ہیں خالہ، چا چا کیا کہتا ہے۔“
 ”ایا نے پہلے بھی کچھ کہا ہے جواب کہے
 گا۔“

”مگر اب اور بات ہے، اب بیٹی کی زندگی
 کا معاملہ ہے۔“

”اس کے لئے سارے معاملے اپنی نیکم
 تک ہی ہیں بس۔“ وہ کتنی دیر تک چاندنی کو گلے
 سے لگائے کھڑی رہی تھی۔
 ”رابطے میں رہنا۔“ جاتے جاتے اس نے
 چاندنی کو تاکید کی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہے تو، تجھے میں چھوڑ
 سکتی ہوں یا بھول سکتی ہوں بھلا۔“ چاندنی کی
 آنکھیں بھی برس رہی تھیں، حریم جلدی سے
 چاندنی کے گھر کی چوکھٹ پر کھڑی تھی، کسی اپنے کو
 نا معلوم مدت تک چھوڑنا کوئی آسان تھوڑی تھا۔

☆☆☆

”مریم آپی۔“ یاشر اور چنگی ساتھ ساتھ
 ڈائینگ ٹیبل پر آئے تھے، مشائخ حج کہتی تھی چنگی
 کے حسن سے نظر بچانا آسان نہیں تھا، وہ دم بخود
 ہو کے اسے میز حیاں اترتے دیکھتی رہی تھی، اس
 کی نظر کے ارتکاز کو یاشر کی آواز نے توڑا تھا، وہ
 بڑھ کر مریم کے پاس آیا تھا، مریم اپنی جگہ سے
 اٹھ کر یاشر سے ملی تھی، عاتبانہ تعارف دونوں

طرف تھا، اس لئے یاشر کو بس چنگی کو اشارہ کرنے
 کی دیر تھی، وہ مریم کے گلے ملنے لگی تھی، مریم کو
 اس سے اس گرم جوش کی توقع نہیں تھی اس لئے
 حیران اور پریشان ہوتے ہوئے اسے چنگی کو گلے
 لگانا پڑا تھا، مام نے ماتھے پر ہل چڑھا کر یہ منظر
 دیکھا تھا۔

”کیسی لگی میری بیوی آپ کو۔“ یاشر نے
 پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے مریم سے پوچھا
 تھا، وہ مام کے ماتھے کے بلوں کی پرواہ کب کر
 تھا۔

”تمہاری پسند ہے تو اچھی ہے۔“ مریم نے
 چکن جلفر بڑی اپنی پلیٹ میں نکالی تھی۔
 ”کیوں آپ کو اچھی نہیں لگی۔“

”ارے ایسی کوئی بات نہیں، ہماری پسند تو
 ثانوی حیثیت رکھتی ہے، جس نے زندگی گزارنی
 ہے، اسے اگر پسند ہے تو ہم سب اس کی حیثیت
 اور مقام سے انکار کیسے کر سکتے ہیں۔“
 ”یہ ہوئی نا بات۔“ یاشر اس جواب سے
 خوش ہو گیا تھا، چنگی کو بھی ملے جلے ردعمل والی مریم
 اچھی لگی تھی۔

”اور چنگی کیسی لگی ہماری فیملی۔“ وہ اب براہ
 راست چنگی سے مخاطب تھی۔

”اچھے ہیں سب لوگ۔“ چنگی نے بڑا سوچ
 سوچ کر کہا تھا، جس طرح کا اسے دیکھ کر کیا گیا تھا،
 ان حالات میں سب لوگ اسے اچھے کیسے لگ
 سکتے تھے۔

”یاشر نے بہت تعریفیں کی تھیں اپنی فیملی
 کی۔“ وہ یاشر کی طرف دیکھ کر طنزیہ مسکرا کر بولی
 تھی، یاشر اوپر ہی دل سے مسکرایا تھا۔

”دیکھو چنگی کوئی بھی سر پرانز بندے کے
 لئے ایسے ہی ہوتا ہے اور یاشر کی شادی بھی
 ہمارے لئے سر پرانز ہی تھا۔“ اب کہ مام نے بھی

کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا کہ جس نے گاؤں سے اس کی جان چھڑوا دی تھی، پھر وہ موجد کے ساتھ عیسیٰ میں بیٹھی تھی۔

”اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔“ اپنے قلیٹ میں آکر اسے یوں لگا تھا جیسے ایک دم جنت میں آ گئی ہو، گاؤں کی دھول مٹی فارغ عورتیں، ایک دوسرے کی چغلیاں کرتیں مگر ساتھ ساتھ وہیں تنگ دھڑنگ بچے، کچے صحن جانوروں کی آوازیں اسے کچھ بھی پسند نہ آیا تھا، اس کے برعکس موجد خوب انجوائے کر کے آیا تھا اور اسے اسلام آباد آ کر اک کئی سی محسوس ہو رہی تھی جو اسے ہمیشہ گاؤں سے شہر آ کر محسوس ہوا کرتی تھی۔

”موجد بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ گاؤں کی دھول مٹی سے جان چھڑا کر داس روم سے باہر آ کر بال سلجھاتے ہوئے بولی تھی۔
”تو کھانا بناؤ نا، مجھے بھی تو بھوک لگ رہی ہے۔“

”کیا اتنے سفر کے بعد کھانا میں بناؤں، ویسے بھی اس وقت گھر میں کچھ نہیں ہے۔“ کھانا بنانے کا سن کر ہی اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔

”ارے بابا لے آتا ہوں، مجھے پتہ ہے اتنے دن باہر رہ کے آئے ہیں گھر میں کھانے کو کیا ہوگا۔“ وہ بانیگ کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔

وانیہ نے بیڈ کی چادر جھاڑی تھی اور بیڈ پر گر گئی تھی، اس وقت نہ کوئی تنقیدی نگاہ سے دیکھنے والا تھا اور نہ ہی کوئی فضول بات کرنے والا سو اسے کسی کا ڈرنہ تھا۔

”موجد ٹیبلین بھی لے آؤ نا۔“ موجد کھانا لے کر آیا تو وہ نہایت نرم لہجے اور محاساں بھری آواز میں بولی تھی۔

”اب کیا سارے کام میں ہی کروں گا، میں بھی تو تمہارے ساتھ ہی سفر سے آیا ہوں اور

ان کی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔
”مام میں نے تو انہیں کہا تھا آپ کو پہلے ہی بتا دیں۔“ وہ آج پہلی بار مام سے خود براہ راست مخاطب ہوئی تھی۔

”اس میں ہم تمہارا قصور نکال بھی نہیں رہے ہمیں یا شر سے ہی گلہ ہے۔“

”ٹپلین چھوڑیں اب اس ٹاپک کو، کھانا کھائیں پھر مجھے گھر بھی جانا ہے۔“ مریم نے ماحول سازگار دیکھ کر خوشگوار سے کہا تھا۔

”شکر ہے آج آپ کے آنے سے سب کی کچھ بیزاری تو ختم ہوئی۔“ مشائم نے مریم کے کان کے پاس سرگوشی کی تھی۔

کھانا ختم کرتے ہی مریم کا ڈرائیور اسے لینے آ گیا تھا، مریم ان سے مل کر واپس چلی گئی تھی، پنگی کو یا شر کے والدین کے برعکس اس کی بہنیں زیادہ اچھی لگی تھیں۔

ڈرنے کے بعد مام حسب معمول اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھیں، یا شر اور پنگی باہر واک کے لئے جانے لگے تو پنگی نے مشائم کو بھی ساتھ کھینچ لیا تھا، مشائم کو کیا اعتراض تھا، پہل پنگی کی طرف سے ہوئی تھی وہ خوش خوشی ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔

☆☆☆

موجد حریم سے گاؤں میں ایک اور ملاقات چاہتا تھا، مگر لاکھ کوشش کے باوجود وہ اسے دوبارہ دکھائی نہیں دی تھی، عابدہ بھی اپنے گھر تھی ورنہ اس کی زبانی ادھر ادھر کی کافی خبریں مل جایا کرتی تھیں، حریم سے دوبارہ ملنے کی خواہش دل میں دبائے وہ اور وانیہ بھی واپس اسلام آباد آ گئے تھے۔

”چھٹک گاؤں۔“ اسلام آباد کی صاف ستھری ہوا میں سانس لے کر وانیہ نے سب سے پہلے خدا

ان کے سارے جیون میں
نکلی سی رہتی ہے
اک کمی سی رہتی ہے
لڑکیو! محبت کے خواب
دیکھتی کیوں ہو
تم کو کیا معلوم نہیں

کافی گرم گرم ہی اندر اتری تھی اور اندر جیسے
سب کچھ جل گیا تھا، آنکھیں بند کیے وہ کہیں دور
پہنچی ہوئی تھی، اس گھر میں جہاں اس نے اپنی
زندگی کا سب سے پریش اور لمبا دور گزارا تھا۔
”سو گئی ہو۔“ موحّد نے اس کا کندھا ہلایا
تھا اور بڑے بڑے برے وقت پر ہلایا تھا، کم از کم وہ
اس وقت ہوش اور حال کی دنیا میں واپس نہ آتا
چاہتی تھی۔

”وانیہ!“ وہ پھر بولا تھا۔
”ہوں۔“ وہ جاگ گئی تھی یا شاید سوئی ہی
نہیں تھی بس کہیں کھوئی ہوئی تھی۔

☆☆☆

”خیریت تھی گھر میں سب۔“ رات کو بستر
پر لیٹے تو منصور نے مریم سے پوچھا تھا۔
”جی سب خیریت تھی۔“
”کوئی کام تھا جو یوں اچانک گئیں اور پھر
واپس بھی آ گئیں۔“
”تو نہ آئی کیا۔“ وہ دودھ بولی تھی۔
”ارے بابا میں نے ایسا کب کہا، میں تو
ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔“
”ہاں یا شر نے شادی کر لی ہے۔“ اس نے
منصور سے کہا تھا۔

”اچھا، کب اور کس سے، سر پرائزڈ۔“
”دوبئی میں رہتی ہے، چکی نام ہے، ماں
باپ دونوں پاکستانی ہیں، جانے کب سے دونوں
کی دوستی تھی، جو آخر شادی تک جا پہنچی، لیکن ہمیں

تھکا ہوا بھی ہوں کچھ تو خیال کر لو۔“
موحّد ساری چیزیں نیپل پر رکھ کر خود بھی
کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا، ناچار
اسے اٹھنا پڑا تھا، وہ کھانا نکالنے کے لئے اٹھی تو
موحّد بھی نہانے کھس گیا تھا۔

”اتنے سارے لوگوں میں سے آئے ہیں،
کیسے تنہائی کا احساس ہو رہا ہے نا۔“ کھانے کے
بعد وانیہ کافی بتا لائی تھی جس کے لئے وہ اتنے
دنوں سے تری ہوئی تھی، وہ کافی پی رہی تھی جب
موحّد نے بھی اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا تھا وہ
خاموش رہی تھی، تنہائی کا احساس موحّد کو تھا، اسے
تو نہیں، اس کے اندر تو یہ تنہائی اور خاموشی اسی
دن رچ بس گئی تھی جس دن اس نے سیٹھ عماد
الدین کا محل جیسا گھر چھوڑا تھا، ماں اور باپ کو
اور تمام آسائشات کو چھوڑا صرف ایک موحّد کی
محبت کے پیچھے۔

تم کو کیا معلوم نہیں
خواب دیکھنے والی
جو بھی آنکھ ہوتی ہے
وہ اداس رہتی ہے
آنکھ کے دریچے میں
جو چراغ رکھتے ہیں
بدگمان راتوں کا
ذائقہ وہ چکھتے ہیں
ان کے دل کی راہیں بھی
بے نشان رہتی ہیں
بے امام رہتی ہیں
ان کے گھر کے دروازے
دستکوں سے انجانے
اور ساعتوں کی گلی
آشنائی آہٹ سے
اجنبی ہی رہتی ہیں

منصور نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا تھا۔
 ”ہمارا بھی یہی حال ہے۔“ مریم نے
 منصور کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے منصور
 کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

”کیسا لگ رہا ہے پاکستان؟“ ریحل نے
 فون پر ہنسی سے پوچھا تھا۔
 ”بس سوسو۔“ ہنسی نے منہ بنا کر کہا تھا۔
 ”یہ کیا بات ہوئی، کل کرتاؤنا۔“

”جو مزہ اپنے ادھر کا ہے وہ یہاں کہاں،
 بے شک یاشر کے پاس ہر فلیٹش ہے مگر پھر بھی
 میں کچھ مس کر رہی ہوں۔“
 ”تو پھر کب تک واپسی ہے؟“

”میرا تو دل کر رہا ہے ابھی آ جاؤں، مگر
 یاشر دیکھیں کیا ڈیپائڈ کرتا ہے، پہلے تو اس کی
 ٹیلی منہ سیدھا نہیں کر رہی تھی اور اب کوئی فنکشن
 ارج کرنا چاہتے ہیں۔“

”تمہاری اور یاشر کی میرج کو تو ایکسپٹ کر
 لیا نا انہوں نے۔“ ریحل نے پوچھا تھا۔
 ”نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔“ وہ مسکراتے
 ہوئے بولی تھی۔

”اوکے رکھتی ہوں، رات کو اسکاٹ پر
 بات کریں گے۔“ ریحل کا شمار ہنسی کی بہت اچھی
 دوستوں میں ہوتا تھا، اس لئے جب سے ہنسی
 پاکستان آئی تھی وہ اسے مس کر رہی تھی۔

”اوکے۔“ ہنسی نے موبائل آف کیا اور
 روم فریج نے جوس کا کین نکال کر پینے لگی تھی
 اتنے میں یاشر کمرے میں آیا تھا۔

”جان من کیا ہو رہا ہے۔“ وہ یونہی ہنسی پر
 غار ہوا کرتا تھا، ہنسی نے کین خالی کر کے اس کی
 طرف اچھا لٹا تھا۔

”یار ہمارے پاکستان میں شو ہر دلوں کو مارنا

سب کو تھپی پڑ چلا جب یاشر خود اسے پاکستان لایا
 ہے۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ منصور کو سمجھ نہ آئی
 کہ کیا کہیں، یاشر اپنی مرضی کا آپ مالک تھا اور
 وہ جو کرتا کسی کو اس پر کیا اعتراض تھا۔
 ”ہاں مام ڈیڈ سب شکڈ تھے۔“ وہ خود ہی
 بتاتی رہی تھی۔

”ہوتا بھی چاہیے تھا آخر یاشر ان کا اکلوتا بیٹا
 ہے۔“

”مجھے نہیں پڑ تھا مام کے تاثرات ایسے
 ہوں گے، انہیں تو ہماری پرواہ نہیں تھی مگر مشائخ
 نے بتایا اور میں نے خود بھی نوٹس کیا کہ یاشر کی
 شادی سے وہ غصے میں ہیں اور اس کے ایک طرف
 فیصلے پر پریشان بھی ہیں۔“

”ماں تو پھر ماں ہوتی ہے نا۔“
 ”مگر وہ ہمارے لئے عام ماں نہیں رہیں
 کبھی، ہم نے انہیں کبھی اپنے لئے پریشان نہیں
 دیکھا۔“

”بس کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو بڑے
 بڑوں کو ہلا دیتی ہیں۔“ وہ مریم کے سلکی بالوں
 میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے ہوئے
 بولے تھے۔

”ہاں لیکن اب سب نارمل ہو گئے ہیں۔“
 ”پھر ہماری ٹیم صاحبہ کس چیز کی ٹینشن لے
 رہی ہیں۔“ وہ مریم کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر ہلکے
 چپکے لہجے میں بولے تھے۔

”ٹینشن نہیں لے رہی، بس اچانک اس خبر
 نے شکڈ کیا تھا، مگر ہنسی سے مل کر اچھا لگا، پھر مام
 کی طرح میں نے بھی یاشر کی وائف کی حیثیت
 سے اسے ایکسپٹ کر لیا۔“

”وہ اردو کی ایک مثال ہے نا“ جب میاں
 بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔“ ساتھ ہی

بہت برا سمجھا جاتا ہے۔“ اس نے کین مہارت سے کچ کر کے ڈسٹ بن کی طرف اچھلا تھا اور شرارت سے بولا تھا۔

”تمہارے پاکستان کی تو ہریات ہی نرالی ہے۔“ وہ اب کاؤچ پر نیم دراز ہو گئی تھی۔

”تو کیا تمہیں پسند نہیں آیا۔“ وہ بھی اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔

”میری پسند کو چھوڑو، یہ دیکھو کہ تمہارے ساتھ کہاں تک چلی آئی۔“

”ہوں۔“ وہ اک ادا سے بال جھٹک کر بولی تھی اور یاشر کا دل انہی اداؤں نے تو اٹکا رکھا تھا۔

”ہاں یہ تو ہے، اسی لئے تو میری فیملی حیران و پریشان ہے کہ مجھ پر کسی لڑکی کا اتنا جادو کیسے چل گیا کہ میں نے اپنا لائف پارٹنر ہی بنالیا۔“

”وہ لڑکی بھی کوئی عام نہیں ہے پنگی ہے پنگی۔“ وہ ہنسا کر بولی تھی۔

”اب انہیں بھی پتہ چل گیا ہے نامیری پنگی کا۔“ اس نے اس کے لال گلابی گالوں کو چھوا تھا،

پنگی کا دل محبت کی تال سے زیادہ فخر اور غرور کی لے پر اچھلا تھا۔

☆☆☆

بس بہت تیزی سے گاؤں کے کھیتوں اور کھلیاؤں کو پیچھے چھوڑے جا رہی تھی اور اسی تیزی سے اس کے آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے، اس نے چادر سے تقریباً آدھا منہ ڈھانپ رکھا تھا تاکہ اس کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کے آنسو دنیا والوں کو نظر نہ آ جائیں، یہ دنیا بڑی ظالم ہے پہلے ہی کمزور اور تنہا لوگوں کو جیسے کا جن نہیں دیتی اور وہ اس بھری دنیا میں اس وقت ایک کمزور لڑکی بھی تھی اور اکیلی بھی، وہ پیچھے رہ جانے والے کھیتوں، درختوں اور

لوگوں کو بس کی کھڑکی سے منہ نکال نکال کر دیکھ رہی تھی کہ جانے پھر دوبارہ انہی راستوں پر آیا جائے یا نہ۔

”کراہیے۔“ کنڈیکٹر اس کے قریب آ کر بولا تھا، اس نے منہ اونچی موڑے موڑے پہلے چادر سے صاف کیا تھا اور پھر پرس نکالا تھا کنڈیکٹر کو پیسے دے کر اس نے پرس سے موبائل نکالا تھا

کہ شاید ابا کا فون آیا ہو کہ واپس آ جاؤ، میں نے تمہاری ماں کو منایا ہے، لیکن یہ اس کی خام خیالی ہی تھی، ابا میں اگر اتنا دم غم ہوتا تو وہ آج یوں بے آسرا نہ ہوتی۔

وہ رونے کا شغل جانے کب تک جاری رکھتی کہ نہال کا فون آ گیا تھا۔

”کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”بس میں۔“ وہ بولی تھی۔

”کس کے بس میں۔“ نہال کو تو آج کل یوں بھی ہری ہری ہی سو جیتی تھی، مذاق کرتے ہوئے کہنے لگا تھا۔

”جس کے بھی سمجھ لو۔“

”منہ سے بولو نا، کس کے بس میں ہو۔“ وہ مزے لے کر بولا تھا۔

”کس کے نہیں یہ پوچھو کس کی بس میں ہو، تو بتا دیتی ہوں گاؤں سے شہر آنے والی بس میں بیٹھی ہوئی ہوں۔“ وہ جل کر بولی تھی۔

”میں تو یہی پوچھوں گا کہ کس کے بس میں ہے یہ منہ سی چڑیا اور اس منہ سی چڑیا کا نام و تازک سادل۔“

”نہال پلزز میں بہت پریشان ہوں۔“ اس وقت اسے کبھی بھی قسم کی چھیڑ چھاڑ اچھی نہ لگ رہی تھی۔

”کیوں کیا ہوا۔“ وہ بھی اس کی پریشان سی آواز سن کر سیریس ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں آدھے گھنٹے بعد بس اسٹینڈ پر پہنچتا ہوں۔“
”وہ کیوں؟“

”بھئی تمہیں گھر لے جاؤں گا، امی جان کو ساری بات بتائیں گے، ایسے تمہیں اکیلے ہی پریشان ہونے کے لئے تھوڑا چھوڑ دوں گا۔“
”ٹھیک ہے۔“ وہ بھی شاید بہت کمزور پڑ گئی تھی، مزید بحث کیے بغیر سیٹ سے ٹیک لگا کر بولی تھی۔

”اوکے میں آتا ہوں تمہیں لینے۔“ نہال نے فون بند کر دیا تھا، وہ ہند فون کان سے لگائے دل کی دھڑکنوں کا شور سنتی رہی تھی۔

”وہاں گاؤں میں کچھ کھاتی نہیں رہی ہو کیا۔“ بس کے آنے سے پہلے ہی وہ بس اسٹینڈ پر اس کے انتظار میں کھڑا تھا، اس کا بیگ اس کے ہاتھ سے لے کر ایک نظر اس پر ڈال کر پوچھنے لگا تھا۔

”کیوں؟“

”اتنی کمزور لگ رہی ہو۔“

”بتانا جتنے دن بھی گاؤں میں رہی ہوں سارے دن ٹینشن میں ہی گزارے ہیں۔“

”اور اس ٹینشن کا اثر تمہارے چہرے اور جسم پر نظر بھی آ رہا ہے۔“ وہ اس کا بیگ گاڑی میں رکھتے ہوئے بولا تھا۔

”مجھے چھوڑو میری کہانی اور ٹینشن تو چلتی ہی رہتی ہے، تم بتاؤ تم ٹھیک ہونا اب، پاؤں کا زخم بھی ٹھیک ہے۔“

”ہاں شکر ہے میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“
”پھر کب جا رہے ہو ڈیوٹی پر ملتان۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

”تم مجھے ملتان بھیج کر ہی راضی ہو۔“ وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر

”ہونا کیا تھا، وہی اماں کا جھگڑا، اس بار تو اس نے پکا انتظام کر رکھا تھا اسنے نالائق اور آوارہ بیٹے سے میرا نکاح کرنے کا، لیکن میں نے بھی ابا اور اماں کو صاف صاف بتا دیا کہ میں کسی صورت اس سے شادی نہیں کروں گی بس پھر کچھ نہ پوچھو کہ کیا طوفان اٹھایا اماں نے۔“ اس نے ساری بات نہال کو بتا دی تھی۔
”اور ابا نے اماں کو منع نہیں کیا۔“

”ابا میں اتنی جرأت ہوتی تا تو آج میں یوں دھکے نہ کھا رہی ہوتی، وہ تو اماں کے ڈر سے مجھ سے کھل کر بات تک نہیں کرتے کجا کہ میرے لئے اماں کے سامنے اسٹینڈ لیفا۔“
”پھر.....؟“

”پھر کیا، میں گھر چھوڑ آئی ہوں، پہلے بھی تو ہاسٹل میں رہ رہی تھی اور خود ہی کمزور رہی ہوں اور اب بھی ایسا ہی کروں گی، ہاں یہ تھا کہ پہلے مہینے بعد گھر جا کر گھر اور ابا کی شکل دیکھ آیا کرتی تھی۔“
”اچھا، اداس مت ہو، میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔“ نہال کو محسوس ہوا کہ حریم کا دل بہت ٹوٹا ہوا ہے، وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا تھا۔

”میں نے تمہارا بھی بتا دیا انہیں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں، اماں نے اس پر بھی مجھے ناجانے کون کون سے طعنے دیئے ہیں۔“
”کوئی بات نہیں، یہی سکے اور سوتیلے رشتوں کا فرق ہوتا ہے، تم پریشان مت ہو، کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔“
”راہ خود سے نہیں نکلے گی ہمیں خود نکالنی پڑے گی۔“

”تو ہم خود ہی اپنی راہ نکالیں گے۔“

”کتنی دیر اور لگے گی تمہیں۔“

”بس آدھا گھنٹہ تقریباً اور لگے گا۔“

آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا تھا، آج اگر وانیہ اپنی محبت لے کر درمیان میں نہ آئی ہوتی اور اسے دولت کی چکا چوند نہ دکھائی دی ہوتی تو حریم شہباز اس کی ہوتی۔

”موحد!“ وہ حریم کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا جب اندر سے وانیہ نے اسے آواز دی تھی، اسے وانیہ کی آواز اچھی نہ لگی تھی، وانیہ نے دوبارہ آواز دی تو اسے ناچار اٹھنا پڑا تھا۔

”ہوں، کیا بات ہے۔“ وہ اس کے قریب جا کر بولا تھا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے۔“

”میں نے کہاں جانا تھا، باہر لاؤنج میں تھا۔“ وہ بے زاری سے بولا تھا۔

”ادھر میرے پاس بیٹھو نا۔“ اس نے موحد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا تھا۔

”سر میں بہت درد ہو رہا ہے، دبا دو نا۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جلتی پیشانی پر رکھتے ہوئے بولی تھی۔

”میڈیسن سے ٹھیک نہیں ہوا۔“

”نہیں، بس تھوڑا سا فرق پڑا ہے۔“ وہ ہولے ہاتھ سے اس کا سر دبانے لگا تھا، وانیہ نے تمنائیت سے آنکھیں موند لی تھیں، اسے وانیہ کی جگہ حریم کا چہرہ نظر آنے لگا تھا، اس نے وانیہ کے ایک ایک نقش کو اپنی پوروں سے چھوٹا شروع کر دیا تھا، آنکھیں ناک ہونٹ گال یہ سب حریم کے خدوخال بن گئے تھے، وانیہ دیاں موجود ہوتے ہوئے بھی پس منظر میں چلی گئی تھی، دوسری طرف وانیہ کے سر کا درد بھی غائب ہوا تھا اور بخار کی حدت میں بھی اس پر محبت کس سے کی آئی تھی۔

جب کچھ دیر بعد وانیہ کا چہرہ دوبارہ واضح ہوا تو وہ جلدی سے اس کا سر چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔

”حریم۔“ زبان سے اک لفظ سرگوشی میں

کہنے لگا تھا۔

”میں راضی نہیں ہوں مگر نوکری بھی تو کرنی ہے کہ نہیں۔“

”میں اب ملتان نہیں جاؤں گا۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ میں علوی اعظم سٹریٹ کو چھوڑ دیا ہے، مجھے ایک اور جگہ بہت اچھی جا ب مل گئی ہے۔“

”ارے واہ، یہ تو بہت اچھی بات ہے اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔“ وہ یہ خبر سن کر واقعی خوش ہوئی تھی، اتنے دنوں بعد دل زرا سا مسکرایا تھا۔

”ٹیلی فون پر اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تمہارے ہی تاثرات خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔“

”بڑے چالاک ہو تم۔“

”نہیں وہی الفاظ کہو نا جو کبھی کہا کرتی تھی کہ بڑے گھنے اور مسینے ہو تم۔“ وہ اس کی پرانی بات یاد دل کر ہنسا تھا۔

”چلو جو بھی سمجھ لو۔“ نہال کو ساتھ پا کر اس کی مضبوطی کچھ کچھ واپس لوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

وانیہ کی صحت کچھ خراب تھی، اسلام آباد کا موسم بدل رہا تھا، جاتی گرمیوں اور آبی سردیوں کے دن تھے، وانیہ بھی موسم کی تبدیلی کے زیر اثر آ گئی تھی، فلو بخار مگلا خراب، وہ صبح سے بستر پر چادر لپیٹے پڑی تھی، موحد نے اسے چائے وغیرہ بنا دی تھی اور ساتھ دوائی بھی دے دی تھی اور اب وہ کمرے میں اس کے پاس بیٹھنے کی بجائے باہر لاؤنج میں صوفے پر لٹائی دی دیکھ رہا تھا، بلکہ ٹی وی بس دیکھ ہی رہا تھا، ذہن دول پر تو حریم شہباز سوار تھی، جب سے وہ گاؤں سے ہو کر آیا تھا وہ اسے بھوتی ہی نہ تھی، اس کا دلش چہرہ ایسے ہی

ڈھلا تھا اور دل کے ایوانوں میں گونجنے لگا تھا۔

☆☆☆

”میں تمہاری ماں ہوں میری بیٹی۔“ نہال نے امی کو پہلے ہی ساری بات بتا دی تھی اور جو کچھ بتانے کو رہ گیا تھا وہ حریم کو گھر لاکر انہیں بتا دیا تھا۔

انہیں بھی اس لڑکی کے دکھ پر بہت رونا آیا تھا، انہوں نے اس کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے دل سے کہا تھا۔

نہال کو اپنی ماں پر یقین تھا کہ وہ بہت نرم اور ہمدرد دل رکھنے والی ہیں اور وہ نہال کی محبت حریم شہباز کو ضرور اپنی گود میں چھپالیں گی، وہ ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی تھی، بے حد بے تحاشا، محبت اور تحفظ کا احساس بسا اوقات وہاں سے ہوتا ہے جہاں سے کبھی بندہ سوچ بھی نہیں سکتا ماں کی ممتا کی گرمی اس گود سے ملتی تھی جہاں سے کبھی اپنائیت کا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا کبھی مگر اب سارے رشتے سارے احساسات گویا اسی گود سے جڑے تھے۔

”بس اب ان آنکھوں میں آنسو کبھی نہ آئیں۔“ انہوں نے اس کا چہرہ اٹھا کر اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کیا تھا، وہ اور تیزی سے رونے لگی تھی۔

”امی جان ان محترمہ پر ہر چیز کا الٹا اثر ہوتا ہے اگر آپ یوں کہیں کہ بیٹی اور رولو، تو یہ فوراً چپ کر جاتی، آپ نے کہا اب رونا نہیں تو ان کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔“ وہ شرارت سے بولا تھا، حریم نے روتے روتے اسے گھورا تھا۔

”اچھا اب چپ ہو جاؤ اور منہ ہاتھ دھو آؤ، میں کھانا گرم کر لوں، سڑک کے آئی ہو بیویک لگی ہو گی اور تمہارے انتظار میں ہم نے بھی کھانا نہیں

کھایا، ابھی تک بھوکے بیٹھے ہیں۔“ وہ اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔

”دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ میری ماں بہت اچھی ہیں۔“

”ہاں تم نے صحیح کہا تھا اور غلط تو میں نے بھی نہ کہا تھا، میں نے کہا تھا نا کہ میرے گھر والے بہت برے ہیں اور دیکھو وہ کتنے برے نکلے۔“

”چلو چھوڑو اس بات کو، جاؤ منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔“ نہال نے مسکراتے ہوئے بات بدلی تھی، حریم بھی بہت رو چکی تھی، اب تو آنسو بھی ختم ہونے کے قریب تھے اس لئے اٹھ کر واش روم میں گھس گئی تھی۔

صبح تیار ہو کر وہ آفس آئی تو آفس میں نیا ہی افسانہ چھیڑا ہوا تھا، یاشر صاحب کی شادی کا۔

”واہ یاشر صاحب نے شادی کر لی۔“ اس خبر نے اسے بھی چونکا دیا تھا۔

”کیسی ہے ان کی وائف۔“ اس نے اپنی کولیگ صبا سے پوچھا تھا۔

صبا نے نوز پیر اس کے سامنے رکھ دیا تھا جس میں علوی انڈسٹریز کے چیئر پرسن یاشر علوی اور ان کی وائف پگلی کی تصویر جگمگا رہی تھی۔

”بہت خوبصورت ہے یہ تو۔“ تصویر میں بھی نظر آ رہا تھا کہ یاشر علوی کی پسند کوئی عام سی لڑکی نہیں ہے۔

”ہاں بہت خوبصورت، اور پتہ ہے آج کل یاشر صاحب بھی بہت خوش اور مہربان نظر آتے ہیں۔“ صبا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اچھا ویسے یہ شادی کب کی انہوں نے۔“

”شادی تو جانے کب سے کر رکھی تھی دو ہی

میں، بس انا ولس اب کیا ہے۔“

”ہوں، آج آئیں گے نا۔“

”ہاں آئیں گے کیوں نہیں۔“

”میں سمجھی شاید گھر پر پڑی ہوں گے۔“ وہ بھی مذاق کرتے ہوئے بولی تھی۔

”ارے یہ کون سا نئی شادی ہے، جو بیوی کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہیں گے، وہ تو جانے کب سے ساتھ رہ رہے ہیں۔“ کوئل دور کی کوڑی لائی تھی۔

”چلو ہمیں کیا بیوی کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھیں یا نا۔“ وہ اپنی نیل پر پڑی فائلوں کو سیٹ کرتے ہوئے بولی تھی۔

”ہمیں کیوں نہیں، کئی دل توڑے ہیں یا شر صاحب نے، کئی لوگوں کا چانس مارا ہے، اس چنگی بیگم نے۔“ صبا نے منہ بسورتے ہوئے کہا تھا۔

صبا کے اس طرح کہنے اور منہ بسورنے پر سب قہقہہ مار کر ہنس پڑی تھیں کہ صبا بھی جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

وانیہ کا بخار تو اتر گیا تھا مگر بے زاری اور کمزوری حد سے سوا ہو گئی تھی، کچھ گھر کے حالات بھی خراب ہونے لگے تھے، موحّد کا کام بھی کچھ نہ تھا، بس جو تھوڑا بہت کما رہا تھا اسی سے وال دلیہ چل رہا تھا، وانیہ کا بینک بینکس بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا اور اس بات کی موحّد اتنی ٹینشن نہ لیتا تھا جتنا وہ لیتی تھی۔

موحّد گھر پر نہیں تھا، وہ پہلے تو سستی سے لپٹی رہی اور پھر کپڑے لے کر واش روم میں نہانے لگی تھی، اس کی بیماری نے موحّد کو بھی چڑھا کر دیا تھا، اس نے سوچا تھا کہ فریض ہو کر موحّد کا انتظار کرے تاکہ اس کا موز بھی صحیح ہو۔

وہ واش روم میں تھی اور اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا، وہ فہم کر ڈر بینک نیل کے سامنے آ کر بال سلجھانے لگی تھی، بال سلجھا کر وہ

بینڈ کے ایک سرے پر آ لپٹی تھی تاکہ موحّد کو کال کر کے پوچھ سکے کہ وہ کب تک گھر آئے گا، اس نے موبائل اٹھایا تو ایک بی نمبر سے پانچ مسڈ کالز تھیں اور نمبر بھی پاکستان کا نہیں تھا، لیکن باہر سے تھا اس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوئی تھی کیونکہ اس نے اپنا نمبر نہیں بدلا تھا اس کے پاس وہی نمبر چل رہا تھا جو پہلے سے تھا اور می پاپا کے باہر ہونے کا بھی اسے پتہ تھا تو یہ کہ می پاپا میں سے ایک نے اسے کال کی تھی، وہ بے تابی سے وہی نمبری ڈائل کرنے لگی تھی، مگر وہ کسی پنی سی او کا نمبر تھا، اس کی کوشش بے سود رہی تھی، وہ موبائل سینے سے لگا کر گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی، آج تو می پاپا دونوں بہت شدت سے یاد آ رہے تھے۔

موحّد نے گھر میں قدم رکھا تو نہایت غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا تھا، وہ اندر کمرے میں آیا تو وانیہ کا رپٹ پر بیٹھی موبائل ہاتھ میں پکڑے رو رہی تھی۔

”وانیہ کیا ہوا، سب ٹھیک تو ہے نا۔“ وہ دوڑ کر اس کے قریب آیا تھا۔

”وانیہ کیا ہوا کچھ بتاؤ تو۔“ وہ اس کی خاموشی پر اسے جھجھوڑنے لگا تھا، وانیہ نے موبائل اس کے آگے کر دیا تھا۔

”کیا ہے اس میں۔“ وہ جھنجھلا گیا تھا، پھر موبائل پکڑ کر دیکھنے لگا تھا۔

”یہ تو کوئی ملک سے باہر کا نمبر ہے۔“ وانیہ نے سر ہلا دیا تھا۔

”می یا پاپا نے کال کی ہے ضرور۔“ وہ بولی تھی۔

”اوہ تو اس میں اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے، ویسے بھی ابھی تمہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ واقعی تمہارے پاپا یا می نے کال کی ہے یا کسی

”میں چائے بنا لاؤں۔“ اس نے موحد کی نظروں سے جان چھڑائی تھی اور اٹھ کر کچن میں آگئی تھی اور کچن میں آتے ہوئے موبائل ساتھ لانا نہ بھولی تھی۔

”ہونہہ، ماں باپ کے لئے، کیسی ہوک اٹھ رہی ہے اور ماں باپ وہ جنہوں نے اکلوتی بیٹی سے یوں جان چھڑائی کہ پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔“ وہ پلاؤ کے بڑے بڑے جج منہ میں ڈالتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

اور نے۔“
”موحد نہیں ان میں سے ہی کسی نے مجھے کال کی ہے، میرا دل کہتا ہے اور میں کتنی بد نصیب کہ کال اینڈ نہ کر سکی۔“ اس کا پچھتاوا احد سے سوا تھا۔

”چلو دوبارہ کر لیں گے اگر بات کرنے کی چاہ ہوئی انہیں۔“ موحد کا انداز ”خود پھاڑ اور نکلا چوہا“ والا تھا، وہ کہہ کر واش روم میں ہاتھ منہ دھونے لگس گیا تھا، جبکہ اس کے برعکس دائیہ موبائل ہاتھ میں لیے اس کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی، اس کے لئے تو جیسے آج سب کچھ اس نمبر میں ہی سا گیا تھا۔

”کچھ کھانے کو لاؤ گی یا اس کے ہی درشن کرتی رہو گی۔“ موحد تو لیے سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے بولا تھا۔

”دائیہ میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“ اس نے پہلی دفعہ بات نہیں سنی تو وہ اور قریب آ کر زور سے بولا تھا۔

”ہوں..... آں۔“ وہ چونکی تھی۔

”کھانا لے آؤ۔“

”کھانا، اچھا لاتی ہوں۔“ وہ موبائل ہاتھ میں لے کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

آج اس نے پلاؤ بنایا تھا طبیعت بھی بخار کی کمزوری کے زیر اثر تھی اس لئے کچن میں زیادہ دیر تک کھڑا رہنے کو دل نہیں کر رہا تھا سو جلد ہی بننے والا کھانا بنا لیا تھا۔

پلاؤ گرم کرتے وقت اور ڈش میں نکالنے تک اس کی نظریں کچن کی سلیب پر پڑے موبائل پر ہی پکی رہی تھیں۔

”کھاؤ نا۔“ وہ بھرپور طریقے سے کھانے سے انصاف کر رہا تھا، جبکہ وہ بس برائے نام ہی کھا رہی تھی۔

اچھی کتابیں پڑھنے کی مادت ڈالیں

ابن انشاء

☆ اور دو کی آخری کتاب

☆ غبارِ کندم

☆ دنیا کا کل ہے

☆ آوارہ گرد کی دائری

☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں

☆ پلے ہوئے چین کو چلیے

☆ ہماری گری بھر اسافر

☆ خدا انشاء می کے

☆ اس ہستی کے اک کو پہنیں

☆ چاندیگر

☆ دل وحشی

☆ آپ سے کیا پورا

لاہور اکیڈمی

چوک اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797

URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

www.urdutube.com



بشری سیال

تھے کہ موسیٰ علی وہاں آ گیا تھا، غضنفر علی بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تھے۔
 ”فروا!“ وہ اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔
 ”کیسی ہو؟“ اس نے فروا کا ہاتھ پکڑا جسے اس نے فوراً جھٹک دیا۔

”مجھ سے دور ہی رہیے گا، میں یہاں صرف معصوب کے لئے آئی ہوں، آپ سے میرا ہر تعلق ختم ہو چکا ہے۔“ وہ اٹھنے لگی۔

”اس شخص کو مجھ سے محبت نہیں ہے، کئی بار اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے، میں اس شخص کی شکل بھی نہ دیکھنا چاہتی تھی، مگر میں اس کے سامنے ہار گئی اور میری اس شکست کی وجہ آپ ہیں، صرف آپ، اگر میرے باپ کے گھر کی چھت مضبوط ہوتی مجھے تحفظ اور سہارا فراہم کرتی تو میں کبھی یہاں نہ آتی۔“ غضنفر علی شکوہ سے بیٹھے ہوئے تھے، ابھی وہ کچھ بولنے ہی والے

URDU TUBE

A WAVE OF ENTERTAINMENT

ناولٹ

معاملات میں جیتنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم رشتوں کو ہار جاتے ہیں۔“ موسیٰ علی صاحبانہ انداز میں بولا تھا۔
”اور میں فروا تمہارے سامنے اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں، ابھی تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگتا ہوں، کیونکہ میں تمہی جیتنا چاہتا ہوں، تمہاری محبت پانا چاہتا ہوں فروا۔“ وہ اپنائیت سے کہہ رہا تھا، مگر فروا کو اب اس کی کسی بات پر

”تم اگر معصوب کی سگی ماں ہوتی، تب بھی میں تمہیں اس کو ڈانسنے سے منع کرتا، کیونکہ فروا ہمیں اپنا غصہ بچوں پر نہیں نکالنا چاہیے۔“ اس نے فروا کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس بٹھالیا تھا۔
”مجھے وضاحتیں مت دیں۔“ اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا، مگر موسیٰ علی کی گرفت مضبوط تھی۔
”فروا ہمارے لئے رشتے اہم ہونے چاہیے، نہ کہ جیت اور ہار، جب ہم اپنے

شوخی و مزاحرت سے بھر پور، محبت بھرا لہجہ اس کے آس پاس گونجتا تھا۔

”اللہ!“ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخوں کا گلا گھونٹا تھا، باہر ایک تواتر سے بارش جاری تھی اور اندر اس کی آنکھیں۔

”میری سزا اس دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہے۔“ بادل زور سے گر رہا تھا۔

”فارقلیط!“ اس نے کھڑکی کی سمت دیکھا تھا، جس کے پٹ ہوا کی دستک سے کھل گئے تھے۔

”میں نہیں اچھا، بلکہ میری سزا اچھی ہے۔“

اس کے دل میں درد اٹھا تھا اور رفتہ رفتہ پورے بدن میں پھیل گیا تھا، وہ کمرے سے باہر نکل آئی، اسے عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا، اس نے ہر جگہ ڈھونڈا، فارقلیط حسن کہیں نہ تھا۔

”فارقلیط!“ اسٹڈی کی لائٹ آن تھی، وہ وہاں آگئی، دروازہ اندر سے بند تھا۔

”پلیز دروازہ کھولیں، مجھ سے بات کریں۔“ وہ رو رہی تھی، گڑگڑاہٹ تھی، التجائیں کر رہی تھی، مگر اس وقت فارقلیط حسن پر اس کی کوئی بات اثر نہ کر رہی تھی۔

”فارقلیط! میں آپ کی..... وہی عروہ ہوں..... جس سے..... آپ محبت کرتے ہی.....

مجھے یوں مت انگور..... کریں..... پلیز ایک بار، مجھے..... میری..... غلطی..... تو بتادیں۔“ اس کا وہاں سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور فارقلیط حسن کا دروازہ کھولنے کا۔

وہ بے حد سیاہ رات تھی اور حد درجہ منحوس، اس رات نے فارقلیط حسن سے اعتبار، مان اور بھروسہ چھین لیا تھا اور عروہ غصہ سے فارقلیط حسن کو۔

☆☆☆

اعتبار نہ تھا، اس کی وجہ سے وہ اپنا بچہ کھو چکی تھی اور یہ جرم وہ چاہ کر بھی اسے معاف نہ کر سکتی تھی۔

”اور یہ مت سمجھنا کہ میں معصوب کی وجہ سے تمہیں واپس لانا چاہتا تھا، یہ حقیقت ہے کہ میں نے تم سے شادی معصوب کے لئے کی تھی، مگر اب تم میری بیوی ہو، میں تمہیں کھوٹا نہیں چاہتا۔“ وہ اس کے خیالات سے انجان کہہ رہا تھا، فروا نے سر کو استہزائے انداز میں جھٹکا۔

”عصیزہ کو کھو کر زندہ ہیں آپ، تو میرے بابت سے کیا فرق پڑے گا بھلا۔“ وہ طنز کے نشتر چھوڑنے لگی، موسیٰ علی نے بغور اسے دیکھا۔

”ہر ایک کی اپنی جگہ ہوتی ہے فروا، تم بھی میرے لئے بہت اہم ہو۔“ وہ بولا تھا۔

”مجھے آپ کی کسی بات پر اعتبار نہیں ہے موسیٰ!“ فروا نے سر کو فٹی میں ہلایا تھا۔

”آجائے گا محبت اپنا آپ منوا کر رہتی ہے اور میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں، تمہاری دوری نے مجھے احساس دلایا ہے کہ تم میرے لئے کتنی اہم ہو۔“ وہ بول رہا تھا، محبت بھری باتیں کر رہا تھا، مگر فروا کو ان باتوں سے نفرت تھی، ان پر یقین نہ تھا۔

☆☆☆

سنا ہو گا اذیت کی کوئی حد بھی ہوتی ہے لموہم سے کہ ہم اس حد کے اکثر پار جاتے ہیں فارقلیط حسن اسے اذیتوں کی بھیجی میں جلا چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا، وہ بے یقین سی بیٹھی تھی، اس کا تو خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ اپنے دیر سے آنے پر اس سے معافیاں مانگے گا، اپنی محبت بھری باتوں سے اسے منالے گا، مگر ہر بار وہی نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔

”اس دنیا میں جو سب سے کمزور دل کی لڑکی تھی اسے اللہ نے میری بیوی بنا دیا ہے۔“

دانتوں تلے دہائی۔

”نویلہ! ایک گلاس پانی پلانا بیٹے۔“ غففر علی وہیں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے تھے، نویلہ نے انہیں سلام کیا اور بغور ان کے تھکن زدہ چہرے کو دیکھا اور بچن میں چلی گئی۔

”چائے پیئیں گے؟“ صوفیہ نے لگاوت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ غففر علی نے سرکوفی میں ہلاتے ہوئے صوفیہ کی پشت سے سرٹکا دیا۔

لاؤنج کا دروازہ کھلا تھا اور علیحدہ بیک گھسیٹی ہوئی اندر آئی تھی، چہرے پر شدید غیض و غضب کے تاثرات تھے۔

”پاپا!“ وہ غففر علی کے سامنے جا بیٹھی تھی۔

”میں عدیل کا گھر چھوڑ آئی ہوں۔“ اس نے صوفیہ کے سر پر ہم پھوڑا تھا، پانی لے کر لائونج میں داخل ہوئی نویلہ ٹھک کر رک گئی تھی، جبکہ غففر علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہو؟ ہوش میں تو ہو؟“ صوفیہ گھبرا اٹھیں۔

”ہوش میں ہی ہوں ماما، وہ ایک نمبر کا جھوٹا، مکار اور دھوکے باز ہے۔“ صوفیہ اس کی بات سن کر ششدر رہ گئی تھیں، ایک بیٹی پہلے ہی طلاق لے کر بیٹھی تھی، تو دوسری خود سامان اٹھا کر آ گئی تھی، وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”اب میں یہاں سے تب ہی جاؤں گی جب عدیل مجھے اپنے ساتھ لے کر جانے کے لئے آئے گا۔“ وہ فیصلہ سنا کر اپنے روم کی جانب بڑھ گئی تھی، جبکہ وہ تینوں ہکا بکا اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

زین ندیم نے خوب دل لگا کر محنت کی تھی،

نویلہ، عروہ کے رویے پر حیران تھی، پہلے تو وہ اس سے ملنے پر بھی آمادہ ہو گئی تھی اور پھر کال بھی رسید نہیں کی اور جب وہ پاپا کو ساتھ لے کر اس کے گھر گئی تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا، نویلہ کو اچھا ہوا تھا۔

”وہ کہہ رہی تھی کہ ان کے ہزبینڈ کو پتا نہ چلے، کیا ان کے ہزبینڈ نے ہم سے کالیکٹ رکھنے سے منع کر رکھا ہے؟“ طرح طرح کے سوالات اس کے ذہن میں آ کر اسے بے چین کر رہے تھے، کل اس کا پیپر تھا اور وہ ٹھیک سے پڑھ نہ پا رہی تھی۔

شام کا وقت تھا وہ اور ماما لائونج میں بیٹھی تھیں، وہ پڑھ رہی تھی، جبکہ ماما بلا مقصد چٹیل کھا رہی تھی۔

”تمہارے پاپا نے کبھی مجھے وہ حیثیت اور مقام نہیں دیا جو میرا حق بنا تھا، ہمیشہ کل افراد اور اس کی بیٹیوں کو اہمیت دی۔“ وہ غففر علی کے رویے پر سخت رنجیدہ تھیں، وہ ان سے ناراض تھے درمچ ناشتہ کیے بغیر آفس گئے تھے۔

”ماما آپ کو پاپا کو سمجھنا چاہیے، وہ کیا چاہتے ہیں، اس بات کا خیال رکھنا چاہیے، آپ کو فردا آپنی پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔“ نویلہ ان سے بحث نہ کرنا چاہتی تھی، مگر اب جب وہ خود بات کر رہی تھیں، تو اس نے بھی موقع دیکھ کر کہہ دیا۔

”تھپڑ ہی مارا تھا نہ، گولی تو نہیں ماری۔“ وہ حقارت آمیز لہجے میں بولیں۔

”ایسا مت کہیں ماما، وہ بہن ہے میری۔“ نویلہ کو ان کی بات بہت بری لگی تھی۔

”نہیں ہے وہ تمہاری بہن، تمہاری بہن صرف علیحدہ ہے۔“ وہ نفرت سے پھنکاریں، اسی دم غففر علی اندر داخل ہوئے تھے، صوفیہ نے زبان

تھے۔

”میرا بیٹا بہت ہونہار، بہت قابل ہے، اسے تالائق مت کہو۔“ انہوں نے محبت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

”یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ماما۔“ اس نے ان کے دونوں ہاتھوں کو چوم کر عقیدت سے آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”آپ کی محنت اور صبر کا پھل ہے، اللہ کی طرف سے۔“ دونوں نے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا تھا۔

”ندیم آج زندہ ہوتے، تو بہت خوش ہوتے۔“ وہ ایسے ہی ہر خوشی اور ہر غم کے موقع پر انہیں یاد کیا کرتی تھیں۔

”ماما وہ اب بھی خوش ہوں گے میری اس کامیابی پر، دنیا سے چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جانے والوں سے رشتہ اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔“ ان کی اداسی دور کرنے کی خاطر وہ بولا تھا۔

”بس اب میں تمہارا کوئی بھانہ نہیں سنوں گی، تمہاری لئے لڑکی تلاش کروں گی۔“ ان کی بات پر وہ مسکرا دیا تھا، مگر کچھ بھی بولا نہیں۔

”تم بناؤ تمہیں کیسی لڑکی پسند ہے۔“ وہ اسے کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”آپ جیسی۔“ وہ بے اختیار بولا، تو ماما اس کی بات پر مسکرا دیں۔

”آپ جیسی سچی، محبت کرنے والی، بے ریا اور خالص۔“

”ایسی کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں؟“ وہ استفہامیہ لہجے میں پوچھیں۔

”نہیں ماما۔“ زین ندیم نے نفی میں سر ہلایا۔

اس کے سی ایس ایس کے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے، ماما بہت خوش تھیں، ان کی خواہش تھی کہ جیسے ہی زین کی جاب لگے گی وہ فوراً اس کی شادی کر دیں گی۔

ماما کالج گئی ہوئی تھیں وہ سو رہا تھا، موبائل فون کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی، فون اس کے دوست ساحر کا تھا۔

”ہیلو! اس نے کال رسیو کرتے ہوئے فون کان کو لگایا اور سوئی ہوئی آواز میں بولا۔

”زین تو نے آج کا اخبار دیکھا؟“ وہ بہت ایکساٹڈ تھا، زین سمجھ نہ سکا۔

”نہیں یارا! میں تو سو رہا ہوں۔“

”اٹھ جا میرے یارا! رزلٹ آگیا اپنا۔“ ساحر بہت خوش تھا۔

”اچھا! زین ندیم جیسے نیند سے فوراً جاگ اٹھا ہو۔

”کیا بتا؟ پاس ہو گئے ہم؟“ اس نے پر امید لہجے میں استفسار کیا۔

”میں تو پاس ہو گیا ہوں، مگر تو۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

”میں پاس نہیں ہوا؟“ اس کا دل بچھ سا گیا۔

”یارا! تو نے ٹاپ کیا ہے۔“ ساحر چلایا۔

”کیا؟“ زین ندیم کو یقین نہ آ رہا تھا، اس نے ماما کی واپسی تک کا وقت بہت مشکل ہے گزارا تھا، وہ گھر آئیں تو زین نے انہیں پکڑ کر خوشی سے گھما ڈالا۔

”ارے..... ارے..... زین، یہ کیا کر رہے ہو؟“ وہ چلائیں۔

”آپ کے اس تالائق بیٹے نے سی ایس ایس میں ٹاپ کیا ہے۔“ وہ اس خبر کو سن کر خوشی سے جھوم اٹھی تھیں، ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے

”آہ!“ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”میں اتنا بے تصور نہیں ہوں بیٹا، میں کل افواہ کا مجرم ہوں، اس پر کیے گئے ظلم کی سزا مجھے میری بیٹیوں کے دکھوں کی صورت مل رہی ہے۔“
نویلہ اب کی بار کچھ نہ بولی تھی، لان میں سخت سردی تھی اور پاپا نے جرسی یا سوئٹر، کچھ نہ پہن رکھا تھا۔

”پہلے تم واپس آئی اور اب علیہ۔“ نویلہ ان کی پریشانی کی وجہ جان گئی۔
”علیہ جذباتی ہے، عدیل بھائی پہلے خود تو سیٹ ہو جائیں، پھر اسے بھی بلا لیں گے۔“ اس نے تسلی دی۔

”نویلہ میں چاہ کر بھی تم لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر پا رہا۔“ وہ بے بس دکھائی دے رہے تھے۔

”پاپا آپ اتنا کیوں قفل کر رہے ہیں؟“ نویلہ انہیں اس حال میں نہ دیکھ سکتی تھی۔

”میں نے ابھی عروہ کو خواب میں دیکھا، وہ بہت رو رہی تھی، مجھے پکار رہی تھی، پتا نہیں کیوں نویلہ، بیٹا مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی مشکل میں ہے، مجھے پکار رہی ہے، مگر وہ اپنی ماں جیسی ہے، نہ تکلیف میں واویلا کرتی ہے، نہ کسی کو مدد کے لئے پکارتی ہے، بس تنہا اپنے اوپر جھیلی رہتی ہے۔“ ان کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا درد اور کرب پنہاں تھا، نویلہ بے بسی سے اپنے پیارے پاپا کو دیکھتی رہی۔

”ہم اس کے گھر گئے، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گھر میں ہی ہے، اس نے ہم سے ملنے سے انکار کیا ہے۔“ ان کا دل اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

”بھلا وہ ایسا کیوں کریں گی؟“ محسوس تو

”یہ آپ کا کام ہے، اسے ڈھونڈنا اور ہاں ایک بات کا خالص خیال رکھیے گا۔“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔
”کیا؟“

”اسے اچھی سی چائے بنانی آتی ہو۔“ اس کے سنجیدگی سے مذاق کرنے پر ماما بہت زور سے ہنسی تھیں۔

”بے فکر ہو، بہت اچھی دلہن لاؤں گی بیٹا، جو میرے ہیرے جیسے بیٹے کی قدر کر لے گی۔“
”ابھی فی الحال تو میری ٹریننگ ہوگی، مجھے اس کی تیاری کرنی ہے۔“ زین ندیم نے انہیں اطلاع دی تھی، دونوں ماں بیٹا بہت خوش تھے، شہینہ کا بہت بڑا خواب ان کے بیٹے نے پورا کر دیا تھا۔

☆☆☆

نویلہ نے ڈرائیور کو وہاں ہی اسے یک کرنے سے منع کر دیا تھا، رات وہ پڑھ رہی تھی جب اس نے پاپا کو لان میں بے چینی سے چلتے دیکھا تھا، وہ فوراً آگیاں چھوڑ کر ان کے پاس آئی تھی۔

”پاپا!“ اس کی آواز سن کر وہ چونک کر رک گئے تھے۔

”کیا ہوا ہے؟ آپ اتنی سردی میں یہاں کیوں ٹہل رہے ہیں؟“ وہ فکر مندی سے بولی تھی۔

”محبت ایک انمول خزانہ ہے بیٹا، جو بد بخت اسے ٹھکراتا ہے، ساری زندگی در بدر بھٹکتا پھرتا ہے، چین اور سکون کی دولت تلاش کرتا ہے، مگر اسے حاصل نہیں ہوتی۔“ وہ گہمیر لہجے میں بولے تھے۔

”آپ نے تو کسی کی محبت کو نہیں ٹھکرایا پاپا۔“

نویلہ کو بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

”انہوں نے خود مجھے ملنے کے لئے کہا تھا۔“ نویلہ نے انہیں تسلی دینا چاہی۔

”موسم اچھا تھا، وہ اور ان کے ہرینڈ آؤٹنگ پر گئے ہوں گے۔“ اس نے بات بنانا چاہی۔

”پتا نہیں اس کا ہرینڈ کیسا ہوگا، میں نے آنکھیں بند کر کے ایک اجنبی کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تھما دیا، کیسا باپ ہوں میں۔“ وہ خود کو کوس رہے تھے، پچھتا رہے تھے، کتنے دکھی اور بے بس تھے وہ۔

”وہ بہت اچھے ہیں بابا۔“ نویلہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا، مگر درحقیقت وہ خود بھی پریشان تھی، عروہ نے اسے خود ملنے کا کہا اور پھر نمبر بھی بند کر لیا اور ان سے ملی بھی نہیں۔

”میں کبھی بھی اس سے نظریں نہیں ملا پاؤں گا۔“ نویلہ نے انہیں بمشکل تسلی دے کر کمرے میں بیجا تھا، اگلے روز وہ پیر دے کر عروہ کے گھر جانے کا فیصلہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔

☆☆☆

بے حد سیاہ سفاک اور منحوس رات کا اختتام ہوا تھا اور ایک بوجھل اداس اور غمگین دن کا آغاز ہوا تھا۔

اللہ اکبر

اللہ سب سے بڑا ہے

اللہ اکبر

اللہ سب سے بڑا ہے

اس کی سرخ، سوچی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر گرم سیال بہنے لگا تھا، اسے فارقلیط حسن پر جو بھروسہ، اعتبار اور مان تھا، وہ ٹوٹ گیا تھا۔

”سب سے بڑا تو ہے اور تو بندوں کے اتنے بڑے بڑے گناہ معاف کر دیتا ہے۔“

سانے بہایا کیا مذمت کا ایک آنسو عمر بھر کے گناہ بخشوا دیتا ہے، تیرے بندے اتنے سفاک کیوں ہیں؟ بغیر کسی غلطی اور گناہ کے اتنی کڑی سزا دیتے ہیں، رورو کر خود کو آنسوؤں میں بہا بھی دیا جائے تو معاف نہیں کرتے، تو تو نہیں دھکارتا، کسی ٹوٹے دل کو نہیں ٹھکراتا، پھر تیرے انسان کیوں؟“ اس نے شاور لے کر صاف لباس پہنا اور نماز پڑھنے لگی، نماز کے بعد وہ رب تعالیٰ کے حضور جھکی بے بسی سے آنسو بہا رہی تھی، دل تھا کہ سنبھل ہی نہ رہا تھا، وہ جائے نماز پر بیٹھی گڑ گڑا رہی تھی۔

”اللہ! وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔“
”تو..... مجھ سے..... سب کچھ لے لے..... میرے یہ..... بچے..... بچی..... اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تھا، اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔“
”مگر مجھے..... صرف..... صرف.....

فارقلیط..... دے..... دے..... میں..... اس..... کے..... بغیر..... نہیں رہ..... سکتی..... اور..... اگر..... ان کو..... میری زندگی..... سے..... نکالنا ہی ہے تو مجھے..... موت دے دے۔“
بہت سارا رو کر گڑ گڑا کر وہ کمرے سے نکلی اور دوبارہ اسٹڈی کے باہر جا بیٹھی۔

دن کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا، جب اسٹڈی کا دروازہ کھلا تھا، فارقلیط حسن اس کے پاس سے گزر کر اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا تھا۔
”فارقلیط!“ وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔
”پلیز میری بات سنیں۔“ وہ لمبی انداز میں بولی تھی، مگر وہ ان سنی کر کے چلا گیا تھا۔

”لائیں میں نکال دیتی ہوں کپڑے۔“ وہ وارڈ روپ کی جانب بڑھا تھا، عروہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی، مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔

نومبر 2018

126

بہت محبت سے پیش آئیں، موسیٰ کے ڈیڈی بھی اسے اپنی سگی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے، فردا کو وہ دونوں بہت اچھے لگے تھے، موسیٰ کی ماما اس سے اس کی امی کی باتیں کرتی تھیں، اسے ان سے ہی پتا چلا تھا کہ وہ لوگ غففر علی کے رشتہ دار ہیں۔

”میری امی کا نام تو ساجدہ تھا، پھر آپ سب انہیں گل افزا کیوں کہتے ہیں؟“ وہ دونوں بیٹھی جائے پی رہی تھیں، معصوب علی پاس ہی بیٹھا کھلونوں سے کھیل رہا تھا، فردا نے ان سے پوچھا۔

”ڈاکٹمنس میں اس کا نام گل افزا تھا، ویسے اس کا نام ساجدہ تھا، وہ یونیورسٹی میں غففر کے ساتھ پڑھتی تھی، تو بس غففر کو تو اس کا یہی نام معلوم تھا، اسی لئے ہم سب بھی اسے گل افزا ہی کہتے تھے۔“ انہوں نے اسے تصدیق بتایا۔

”میرے بابا نے میری امی کو گھر سے کیوں نکالا تھا؟“ اس نے کچھ سمجھتے ہوئے سوال کیا، راشدہ بیگم اس کے سوال پر خاموش رہ گئیں۔

”بیٹا! غففر نے اسے نہیں نکالا تھا، آپ کی دادی اور پچھو نے چالیس چل کر اسے نکالا، وہ بیچارہ تو ملک سے باہر تھا، بیٹیوں کی پیدائش کا سن کر دوڑا چلا آیا، مگر تب تک یہ لوگ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو چکی تھیں، گل افزا کو ڈرا دھماکا کر گھر سے نکال چکی تھیں، غففر علی بہت رویا تھا، وہ دن اور آج کا دن، کسی نے غففر علی کو ہتھے نہیں دیکھا، سانپوں کو کسی بوجھ کی طرح اٹھائے پھر رہا ہے۔“ وہ خاموش ہو گئی، مزید کچھ نہ پوچھ سکی۔

”میں نماز پڑھ لوں، پھر لُنج ساتھ میں کرتے ہیں، آپ کے ڈیڈی کسی سے ملنے گئے تھے، آتے ہوں گے۔“ وہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

”ماما! آپ میرے ساتھ کھیلیں۔“ معصوب

”یا اللہ!“ وہ بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھی۔

”کیا ہو گیا ہے فارقلیط کو؟ میں کیا کروں؟“ اس نے سر تھام لیا، وہ کچن میں آگئی اور اس کے لئے ناشتہ بنانے لگی، بارش میں بھجکے اور تمام رات گیلیے کپڑوں کے ساتھ سردی میں اسٹڈی کے باہر بیٹھنے کی وجہ سے اسے نمبر پچر ہو گیا تھا، لیکن اسے اگر اس وقت کچھ یاد تھا تو صرف فارقلیط حسن کی محبت اس کی ناراضی۔

”فارقلیط!“ وہ باہر جا رہا تھا، عروہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

”ناشتہ تو کر لیں۔“ وہ خاموشی سے کچن میں آگیا اور اپنے لئے کافی بنانے لگا۔

”میں نے آپ کے لئے ناشتہ بنا دیا ہے۔“ وہ لپاجت سے گویا ہوئی۔

”فارقلیط!“ اس کی طویل خاموشی عروہ کو کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔

”پلیز مجھ سے بات کریں، میری طرف دیکھیں، ایسے انکورمٹ کریں مجھے۔“ اس نے اپنا سر فارقلیط حسن کے بازو سے ٹکایا، اس نے فوراً اسے جھٹک کر خود سے الگ کیا تھا۔

”آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں، آپ تو مجھ سے محبت کرتے ہیں، فارقلیط، یوئیس نہ پلیز۔“ عروہ نے اس کا بازو پکڑ کر زور سے ہلایا۔

”تمہیں میرے منہ سے اپنے لئے نفرت کا اظہار سننا اچھا نہیں لگے گا، اس لئے مجھے بولنے پر مجبور مت کرو۔“ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتا ہوا وہ وہاں سے نکل گیا، عروہ غففر علی بچٹی بچٹی نگاہوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

موسیٰ علی کی ماما بہت اچھی تھیں، وہ فردا سے

اس سے ضد کرنے لگا تھا وہ فروا کا دوپٹہ اٹھا لایا اور اس کی آنکھوں پر باندھ دیا۔

”اب ڈھونڈیں مجھے ماما!“ وہ زور زور سے ہنس رہا تھا، فروا ادھر ادھر ہاتھ مار کر اسے تلاش کر رہی تھی۔

”نہیں مل رہے مجھے مصعب، کہاں چھپ گئے ہو۔“ وہ جھکنے لگی تھی۔

”ڈھونڈیں نہ ماما، میں یہیں ہوں۔“ وہ شریر ہوا، فروا آواز کی سمت مڑی اور سامنے سے آتے موسیٰ علی سے ٹکرا گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، دوسرے ہاتھ سے آنکھوں سے دوپٹہ کھولا۔

”آپ!“ اسے سامنے دیکھ کر فروا نے ہاتھ چھوڑ دیا، مگر موسیٰ علی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”اگر غلطی سے ہاتھ پکڑ ہی لیا ہے، تو مت چھوڑو فروا۔“ وہ معنی خیزی سے بولا۔

”میں تھک گئی ہوں مصعب، اب بس۔“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، مگر موسیٰ علی نے اسے جانے نہ دیا۔

”کب تک رہو گی ناراض؟“ وہ اسے منانے کے سبب جتن کر چکا تھا، مگر وہ مان کرنے دے رہی تھی۔

”میں ناراض نہیں ہوں۔“ اس نے وہاں سے جانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

”تو پھر مجھ سے اتنی دور دور کیوں ہو؟“ وہ استفسار کرنے لگا۔

”اول روز سے ہی ہم دور تھے اور دور ہیں گے، آپ نے عزیزہ سے کیا وعدہ نبھایا اور مجھ سے شادی کی۔“

”بس فروا؟“ موسیٰ علی نے اسے مزید بولنے سے روکا۔

”اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔“ وہ اسے

ساتھ لئے صوفے کی جانب بڑھا۔

”تم ابھی دو بچوں کو نہیں سنبھال سکتی، میں اس لئے منع کر رہا تھا، لیکن میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔“ وہ اس سے معافی مانگ رہا تھا اور وہ سر جھکائے بیٹھی آنے بہا رہی تھی۔

☆☆☆

نویلہ کا پیر بہت اچھا ہوا تھا، وہ پیر دے کر نکلی اور ادھر ادھر دیکھے بنا، باہر نکلی اور کسی میں عروہ کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی، چوکیدار نے اسے اندر جانے دیا تھا، وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی کچھ دیر اس کا انتظار کرتی رہی اور بالآخر باہر آ گئی۔

”عروہ..... آپ! اسے وہ لاؤنج میں بیٹھی نظر آ گئی، نویلہ اس کے پاس آ کر بولی، تو عروہ اچھل پڑی۔

”تت..... تم..... یہاں..... کیوں..... آئی..... ہو؟“ وہ ہکلاتے ہوئے بولی، مارے خوف کے اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

”میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔“ نویلہ نے اس کے ٹوٹے ٹھہرے انداز اور اجازت ویران حلیے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یہاں..... نہیں آنا چاہیے تھا۔“ اس کے سامنے میز پر کپ میں چائے پڑی تھی، جو کہ پڑی پڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

”کیا بات ہے، آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں اور آپ کی آنکھیں کیوں اتنی سرخ اور سو جی ہوئی ہیں؟“ نویلہ نے نرمی سے محبت بھرے لہجے میں کہا تو عروہ کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہونے لگیں۔

”نویلہ انہیں پتا چل گیا ہے کہ میرا تم سے کانٹیکٹ ہے، جبکہ انہوں نے مجھے منع کیا تھا، تم لوگوں سے ملنے اور بات کرنے سے۔“ اس کی

ملاقات، ابھی تو اس نے محبت کی بارش میں بھیگنا شروع کیا تھا۔

”پلیز جاؤ نولید۔“ وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے رو دی۔

”تمہیں میری قسم بابا کو کچھ مت بتانا، وہ پہلے ہی میری وجہ سے بہت دکھ اٹھا چکے ہیں۔“ عروبہ نے اسے باہر کی جانب دھکیلا تھا اور واپس مڑی اور صوفے پر جا بیٹھی اور اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو بحال کرنے لگی۔

☆☆☆

زین ندیم کی ٹریننگ شروع ہو گئی تھی، جو کہ نو ماہ کے عرصے پر مشتمل تھی، اسے اس سلسلے میں لاہور جانا تھا، ٹریننگ بیٹے کے لئے بہت اداس ہو رہی تھیں۔

”آپ بھی میرے ساتھ چلیں ماں۔“ ان کی اداسی کو بھانپتے ہوئے وہ کہنے لگا تھا۔

”میں اپنی جاب چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں بیٹا۔“ وہ سکراتے ہوئے بولیں۔

”ویک اینڈ پر آیا کروں گا نہ۔“ اسے ان کی تنہائی اور اداسی کے خیال سے دشت ہو رہی تھی، مگر اس کا جانا بھی تو ضروری تھا، ان کے گلے میں بازو ڈال کر انہیں ساتھ لگائے وہ چکن میں لے آیا اور اپنے اور ان کے لئے چائے بنانے لگا، وہ آنکھوں میں امنڈتے آنسو اس سے چھپا رہی تھیں۔

☆☆☆

غففر علی آفس سے واپسی پر فروا کی طرف چلے گئے تھے، وہ اپنے کمرے میں تھی وہ دستک دے کر اندر آ گئے، مصعب علی سو رہا تھا اور وہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔

”السلام علیکم!“ انہوں نے سلام کیا، فروا کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

بات پر نولید نے اسے چوکتے ہوئے دیکھا تھا، وہ بے یقینی تھی۔

”کیا وہ آپ پر پابندیاں لگاتے ہیں؟“ نولید بوہن کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا تھا۔

”نہیں، صرف تم لوگوں سے ملنے سے منع کیا ہے، نولید میں فارقلیط سے بہت محبت کرتی ہوں، ان کے بغیر جینے کا تصور بھی میرے لئے سوہان روح ہے، پلیز مائنڈ مت کرنا۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر نولید کی طرف منت بھرے انداز میں دیکھنے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں دوبارہ یہاں نہیں آؤں گی، مگر بابا آپ کے لئے بہت پریشان ہیں اور ایک اور بات کرنی تھی مجھے آپ سے۔“ اس نے تمہیدی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی جو فریڈ تھی نہ فروا.....“ نولید اتنا کہہ کر رک گئی تھی۔

”عروبہ آپ کی دراصل وہ آپ.....“

”نولید فارقلیط آ گئے۔“ عروبہ از حد خوفزدہ ہو گئی تھی اور بے چینی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”تم..... تم..... پلیز..... یہاں..... ادھر چھپ جاؤ۔“ عروبہ نے اسے صوفے کے پیچھے چھپا دیا تھا، اگلے ہی لمحے فارقلیط حسن اندر داخل ہوا تھا، عروبہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا، وہ اس کی جانب دیکھے بناء اندر چلا گیا تھا۔

”نولید! جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے نکل جاؤ۔“ عروبہ نے فارقلیط حسن کے جاتے ہی اسے ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب دھکیلا۔

”کیوں کر رہے ہیں وہ آپ کے ساتھ ایسا؟“ نولید کا دل اس کی بے بسی پر کڑھنے لگا تھا، وہ عروبہ غففر کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی اذیت سے واقف تھی، اب ہی تو جا کر اسے سکون

”اب کی بار نہیں اٹھاؤ گی نقصان۔“ انہوں نے یقین دہانی کروانا چاہی۔

”آپ میری فکر مت کیا کریں۔“ وہ درشتی سے بولی۔

”اس سے میں خود کو نہیں روک سکتا۔“ انہوں نے جھٹ سے کہا۔

”مجھے بابا کہا کرو نہ، جیسے عروہ کہتی ہے۔“ وہ اس کی منت کرنے لگے۔

”ہاں تاکہ آپ میرے ساتھ بھی وہی کریں، جو عروہ کے ساتھ کیا، میں آپ کو کبھی بھی پایا نہیں کہوں گی۔“ وہ سختی سے کہتے ہوئے لب بچھنے لگی۔

”مجھے یقین ہے کہو گی، جب میں مر جاؤں گا تو بابا، بابا کہہ کر بلاؤ گی، مگر میں واپس نہیں آؤں گا بیٹا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں آپ سے معافی اس لئے نہیں مانگتا کہ آپ مجھے معاف کر دو اور میں پرسکون ہو جاؤں، میں تو ایسا اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ کا جودل جتا رہتا ہے میری نفرت میں، اس سے آپ کو نجات مل جائے۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر کی جانب پڑھے، فردا کے دل کی حالت عجیب سی ہونے لگی تھی، اس کا جی چاہا انہیں روک لے۔

”اگر میرے آنے سے آپ کو تکلیف پہنچتی ہے تو میں دوبارہ یہاں نہیں آؤں گا، خوش رہو میرے بچے۔“ ان کی آنکھوں میں گہری اداسی تھی، فردا چاہتے ہوئے بھی ان کو روک نہ سکی اور وہ چلے گئے۔

☆☆☆

فارقلیط حسن کا غم و غصہ آفس جا کر بھی کم نہ ہوا تھا، اسے یقین ہو چکا تھا کہ عروہ اس سے جھوٹ بول رہی ہے اور اسے دھوکہ دے رہی

”کیا سلام کا جواب نہ دو گی بیٹا؟“ وہ اس کے سامنے جیسر پہ بیٹھ گئے۔

”کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟“ ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سختی سے گویا ہوئی۔

”کیونکہ یہاں میری پیاری سی بیٹی رہتی ہے۔“ انہوں نے ہمت نہ ہاری تھی۔

”اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں اور کوئی بھی چیز مجھے خوشی نہیں دے سکتی اب۔“

”ایک بار دل کو بڑا کر کے دیکھو، ہمت کرو، سب کچھ اچھا لگنے لگے گا۔“ غنفر علی نے ہمت نہ ہاری اور برابر اسے سمجھاتے رہے۔

”میرے لئے یہ سب اب بہت مشکل ہے۔“ وہ آمادہ نہ تھی، کسی طرح بھی ان کی بات نہ ماننا چاہ رہی تھی۔

”بیٹا میں چاہتا ہوں آپ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لو، آگے پڑھو۔“ انہوں نے کب کی سوچی ہوئی بات اس سے کہہ دی اور وہ سن کر بھڑک اٹھی۔

”اس کا کیا فائدہ ہو گا؟“ وہ طنز سے گویا ہوئی۔

”ضروری نہیں بیٹا ہر کام ہم فائدے کو دیکھ کر کریں، ویسے اسٹڈی کمپلیٹ کر کے آپ میرا یا موسیٰ کا آفس جوائن کر سکتی ہیں۔“ انہوں نے پیار سے اسے سمجھایا۔

”جس انسان نے زندگی میں صرف نقصان ہی اٹھائے ہوں تو پھر ہر نیا کام کرنے سے پہلے وہ ضرور سوچتا ہے اور مجھے آپ کا یا موسیٰ کا آفس جوائن نہیں کرتا۔“ اس نے دو ٹوک الفاظ میں انکار کیا۔

عروہ غنفر کے نرم و نازک بازوؤں میں پیوست ہو رہی تھیں۔

”آپ کی آنکھوں پر شک کی بٹی بندھ چکی ہے آپ اب میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گے، اس لئے میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔“ اس نے اپنا بازو چھڑانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے، میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفاک لہجے میں گویا ہوا، عروہ غنفر کے لئے اس کا یہ روپ برداشت کرنا حد درجہ مشکل تھا۔

”بس یہ تھی آپ کی محبت فارقلیط، اتنا ہی بھروسہ تھا مجھ پر۔“ وہ کچھ نہ بولا اور واپس مڑ گیا، چند ثانیے وہ ساکت کھڑی اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی اور پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔

کبھی یاد آئے تو پوچھنا

ذرا اپنی خلوت شام سے.....!

کے عشق تھا تیری ذات ہے

کے پیار تھا تیرے نام سے!

ذرا یاد کر کے وہ کون تھا

جو کبھی تجھے بھی عزیز تھا!

وہ جو مرنا تیرے نام پہ

وہ جو جی اٹھا تیرے نام سے!

ہمیں بے رخی کا نہیں گلہ

کہ یہی وفاؤں کا ہے صلہ!

مگر ایسا جرم تھا کون سا

گئے ہم دعا و سلام سے!

اسے کھانے پینے کا ہوش نہ رہا تھا، یونیورسٹی

کو جیسے بھول گئی تھی، نہ اپنی سدھ بدھ تھی، نہ ہی

اپنی حالت کی پرواہ، اس کی پرواہ تو فارقلیط حسن

کیا کرتا تھا، اسے کب آتا تھا اپنا خیال رکھنا، وہ

جس نے اس کا ناطہ آنسوؤں سے توڑ کر ہلکی کو اس

تھی، اس نے رات بھی کچھ نہ کھایا تھا، صبح ناشتے کے بغیر آفس آیا تھا، اب طبیعت کافی پوچھل اور خراب سی محسوس ہو رہی تھی، اسی لئے وہ گھر واپس آ گیا تھا، عروہ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی، اسے دیکھ کر دل پشیمانوں میں گھرنے لگا، وہ سیدھا بیڈ روم کی جانب بڑھا۔

موسم میں تبدیلی اور ترشی بڑھتی جا رہی تھی، باہر سخت سردی تھی، فارقلیط حسن کھڑکی میں جا کھڑا ہوا، اگلے ہی لمحے وہ باہر آیا۔

”کوئی آیا تھا؟“ اس کے سوال پر عروہ غنفر سنانے میں آگئی تھی، وہ آنکھیں پھاڑے حیرت کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں نے تم سے پوچھا ہے کوئی آیا تھا یہاں؟“ فارقلیط حسن کے لہجے میں سختی درآئی تھی، خوف کے مارے عروہ غنفر کا سانس رکنے لگا تھا۔

”نہیں..... نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔“ فارقلیط حسن نے ٹیبل پر پڑا کپ اٹھا کر زور سے دیوار پر مارا تھا، اس لی دھماکے نے عروہ کو سہا دیا تھا، وہ کب جانتی تھی اس فارقلیط حسن کو۔

”کیوں کر رہی ہو ایسا، کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں، بتاؤ؟“ اس کے لہجے میں چٹانوں کی سختی تھی، اس نے آگے بڑھ کر عروہ کا بازو پوچھا اور اسے ایک جھکے سے کھڑا کر دیا۔

”گیمز آئی تھی وہ؟ کس کا پیغام لائی تھی نویلہ؟“ چمن سے کچھ اس کے اندر ٹوٹا تھا۔

”فارقلیط!“ اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی تیرنے لگی تھی۔

”جھوٹ نہیں، اب اور نہیں، سچ بتاؤ کیوں آئی تھی نویلہ؟“ فارقلیط حسن کی اپنی اگلیاں

”دعا کریں فرما آپ!“ نویلہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔

”پاپا کی کنڈیشن بہت سیریس ہے۔“ اس نے روتے ہوئے بتایا تھا، سامنے صوفیہ بیٹھی تھیں، فرما کی ان پر نظر پڑی تھی، وہ سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

”موسیٰ..... میرے..... میرے..... بابا۔“ وہ بے بسی سے رو دی تھی۔

”وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ موسیٰ علی نے اسے تسلی دی تھی۔

”اگر میرے یہاں آنے سے آپ کو تکلیف پہنچتی ہے تو میں دوبارہ یہاں نہیں آؤں گا۔“ گھیرا اس لہجہ اس کی سماعتوں کو اذیت سے دوچار کر رہا تھا، اس نے خوفزدہ نظروں سے آئی سی یو کے بند دروازے کو دیکھا تھا، نویلہ تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔

”فرما آپی سنبھالیں خود کو۔“ اس نے فرما کو ساتھ لگا لیا۔

”نویلہ..... ان سے..... کہو..... ایک دفعہ..... ہوش میں..... آ جائیں..... مجھے..... انہیں بتانا ہے..... میں ان سے..... کتنا پیار کرتی ہوں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”وہ ٹھیک ہو جائیں گے، آپ دعا کریں۔“ نویلہ نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

تمام رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے گزری تھی، اس کی بیٹی نے کٹھور پن کی انہما کر دی تھی، ایک مرتبہ بھی ان کے پاس نہ آئی تھی، رات جتنی بھی تاریک ہو، سفاک ہو یا بے رحم، بالآخر اختتام پذیر ہوتی ہے، دن ضرور نکلتا ہے اور اس منحوس رات کا اختتام بھی دن کا اجالا

کے لیوں کا راستہ دکھایا تھا، ہر بات یکسر بھول چکا تھا۔

”فارقلیط! نہیں۔“ وہ روئے جا رہی تھی، اس کی کوئی غلطی نہ تھی مگر فارقلیط حسن اسے غلط سمجھ رہا تھا، اس سے دور جا رہا تھا اور وہ چاہ کر بھی اسے روک نہ پا رہی تھی، اس کی طبیعت سخت خراب رہنے لگی تھی، وہ صبح سے بار بار Vomit کر رہی تھی، اس پر گرجنے اور برسنے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل گیا تھا، پوری رات وہ گھر نہ آیا تھا، عروبہ نے روتے ہوئے اللہ سے دعائیں مانگتے ہوئے گزاری تھی رات۔

”یا اللہ! میرے پاس فارقلیط حسن کے سوا کچھ نہیں ہے، اگر تو نے اس شخص کو میرے مشکل وقت کا ساتھی بنا کر بھیجا ہے تو اسے میری زندگی سے کبھی بھی نکالنا مت۔“ وہ منت کر رہی تھی، فریاد کر رہی تھی، فارقلیط حسن کی غلطی اس کے لئے موت کا پیغام تھی۔

☆☆☆

”فرما آپی! پاپا کا ایکسٹنٹ ہو گیا۔“ نویلہ کی فون کال نے اسے دلا دیا تھا، اس کی آنکھیں پتھرا گئیں، دھڑکنیں ختم ہو گئیں۔

”نہیں۔“ موبائل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھے فائل میں مگن موسیٰ علی نے جھٹ سے اسے دیکھا تھا۔

”نہیں..... نہیں..... نہیں۔“ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا، کچھ ہی دیر میں وہ لوگ ہسپتال میں موجود تھے، پورا راستہ وہ رو رہی تھی، موسیٰ علی نے اسے چپ بھی نہیں کروایا تھا۔

”نویلہ..... کیسے ہیں وہ؟“ اسے آئی سی یو کے سامنے ہی نویلہ مل گئی تھی، وہ بھاگ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔

سے زمین نکل گئی تھی، وہ فوراً اسے ہاسپٹل لے گیا تھا۔

”انہیں شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے، جس وجہ سے ان کا بی پی ہائی ہو گیا ہے، اب ہمیں ان کا آپریشن کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر اسے بتا کر غلٹ کے عالم میں واپس مڑ گئی تھی۔

”میرے خدا اسے کچھ نہ ہو، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ ہرگز رتا تھا اس کی پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا، اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے قصور سراسر اس کا اپنا تھا، عروبہ تو بالکل معلوم، بے ریا اور خالص لڑکی تھی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا، وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا نقصان کر چکا تھا۔

سخت پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے حسن بہزاد کو کال کر دی تھی، وہ پہلی فلائٹ سے ہی واپس آ گئے تھے۔

”مبارک ہو آپ کو، اللہ نے آپ کو جڑواں بنایا اور بیٹی سے نوازا ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے مسکراتے ہوئے اطلاع دی تھی۔

”یہ سب کیا ہے فارقلیط؟“ حسن بہزاد حیران تھے۔

”اس کی حالت بہت خراب تھی، کچھ بھی ہو سکتا تھا، اس لئے ہمیں آپریشن کرنا پڑا۔“ ڈاکٹر نے انہیں تفصیل سے بتایا۔

”عروبہ کیسی ہے؟“ فارقلیط حسن کو صرف اس کی فکر تھی۔

”اس نے دو پری میچور بچوں کو جنم دیا ہے، ابھی وہ بہت ویک اور بے ہوش ہے مگر ڈاکٹرز اس کے لئے بہت پر امید ہیں، انشاء اللہ جلد Recover کرے گی۔“ ڈاکٹر جاچکی تھی، حسن بہزاد نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

پھیلنے سے ہو گیا تھا، اس نے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگی، آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں جاری تھی۔

نماز ختم کر کے دعا کے لئے ہاتھ بلند کیے تو دل دکھ سے جھٹکنے لگا، کچھ کہنے اور مانگنے کی ہمت ہی نہ ہو رہی تھی، تمام عمر اس نے خدا سے اس ایک شخص کی محبت ہی تو مانگی تھی، مگر اب جا کر اسے سمجھ آئی تھی کہ جو چیز جو انسان اور جو محبت قسمت میں نہ ہو، اس کے لئے چاہے عمر بھر جدے میں گزر گزرتے ہوئے گزار دی جائے، کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

”یا اللہ!“ اتنا کہنا تھا کہ اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی، جس شخص نے اس گھر سے دل سے اور زندگی سے نکال دیا تھا، وہ اسی کو مانگ رہی تھی، اس کا دل پکار پکار کر اس کا ساتھ پھر سے مانگ رہا تھا۔

”میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اللہ!“ وہ ہاتھ جوڑے بیٹھی بے بسی کی انتہاؤں پر تھی۔

☆☆☆

رات عروبہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی، فارقلیط حسن گھبرا گیا تھا، وہ فوراً اٹھ کر اس کے قریب آیا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس نے عروبہ کا ہاتھ پکڑا۔

”مجھے آپ کی ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ عروبہ نے فوراً اپنا ہاتھ چمڑ دایا، وہ شام کو گھر آیا تھا۔

”تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے، ہمیں ہاسپٹل چلنا چاہیے۔“ مگر عروبہ نے کوئی جواب نہ دیا، کچھ ہی دیر میں وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

”مائی گاڈ!“ فارقلیط حسن کے پیروں تلے

”یا اللہ! میرے پاس اس ایک رشتے کے سوا اور کچھ نہیں بچا، مجھے معاف کر دے، میں نے اپنے باپ کو دھکرا دیا، ان کی محبت کو ٹھکرایا، مجھے پایا واپس لوٹا دے، میں اب ان کی محبت کی قدر کروں گی، میں انہیں کبھی مایوس نہیں کروں گی۔“

اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے اور واپس آگئی، اسے سامنے ہی نویلہ نظر آگئی تھی۔

”ڈاکٹر سے کہو مجھے ان کے پاس جانے دیں، مجھے یقین ہے میں انہیں پکاروں گی تو وہ..... وہ ضرور..... ہوش میں آ جائیں گے۔“ وہ نویلہ کی منتیں کرنے لگی تھی، نویلہ ہنوز خاموش تھی، فردا کی نظر سامنے سے آتے ڈاکٹر پر پڑی۔

”ڈاکٹر..... پلیز..... پلیز مجھے میرے پاپا کے پاس جانے دیں، میں آپ کو یقین دلائی ہوں، میرے پکارنے پر وہ..... وہ ہوش میں آ جائیں گے۔“ ڈاکٹر چند تاپے کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر اسے ساتھ لے کر اندر داخل ہو گیا، اندر پہلے سے دو ڈاکٹر موجود تھے، اس نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے یقین ہے کہو گی، جب میں مر جاؤں گا تو بابا بابا کہہ کر بلاؤ گی، مگر میں واپس نہیں آؤں گا بیٹا!“ وہ سامنے کئی مشینوں میں جکڑے پڑے تھے، فردا کا دل پھٹنے لگا، وہ آگے بڑھی۔

”بابا!“ اس نے انہیں پکارا۔

”بابا! انہیں۔“ تینوں ڈاکٹر اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ تو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں نا، پلیز میرے کہنے پر اٹھ جائیں۔“ وہ انہیں بار بار بلاری تھی۔

”بابا جان!“ اس نے ہاتھ ان کے گال پر رکھا تھا، ان کے دائیں ابرو میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔

”ایسا کیا ہوا تھا کہ اس کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی۔“ فارقلیط حسن کوئی جواب نہ دے سکا، وہ دن بعد عروبہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو گئی تھی۔

حسن بہنہاد نے پوتے کا نام شہیر رکھا تھا، جبکہ فارقلیط حسن نے بیٹی کا نام ماہوش رکھا تھا۔

فارقلیط حسن دونوں بچوں سے بہت پیار کرتا تھا، بیٹی میں تو اس کی جان تھی، وہ شکل و صورت میں بالکل عروبہ پر گئی تھی، جبکہ شہیر کچھ عروبہ جیسا تھا، کچھ فارقلیط حسن جیسا۔

دونوں بچے ہر وقت عروبہ غفنفر کو مصروف رکھتے تھے، فارقلیط حسن نے اسے فل ٹائم میڈرکھ کر دی تھی، جو بچوں کے سب کاموں میں عروبہ کی ہیلپ کرواتی تھی، رات اگر بچے اٹھ جاتے، تو فارقلیط حسن ماہوش کو اٹھا لیتا، عروبہ شہیر کو اٹھائے رکھتی، ابھی بھی وہ دونوں جاگ گئے تھے، عروبہ نے دونوں کو فیڈر پلا کر سلايا تھا۔

”تم یونیورسٹی کب جانا شروع کرو گی؟“

فارقلیط حسن جاگ گیا تھا اور اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”مجھے نہیں جانا یونیورسٹی۔“ اس کی جانب دیکھے بنا، جواب دیا۔

”تمہیں بہت سارا پڑھنا تھا، یاد ہے تمہیں؟“ وہ بولا۔

”مجھے نہ کچھ یاد ہے اور نہ میں یاد کرنا چاہتی ہوں، کیونکہ مجھے تکلیف کے سوا کچھ نہیں ملتا، میری ساری غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں دور ہو چکی ہیں، مجھے میری اوقات میں رہنے دیں۔“ وہ لیٹ چکی تھی، فارقلیط حسن اسے دیکھے گیا۔

☆☆☆

غفنفر علی کی بے ہوشی طویل ہوتی جا رہی تھی، فردا کا رورو کر برا حال تھا۔

توجہ نہ دی تھی، مگر اب وہ اس کی بیوی بن چکی تھی، ایک مضبوط اور خوبصورت بندھن میں اس کے ساتھ بندھ چکی تھی۔

”السلام علیکم!“ اس نے اندر کمرے میں قدم رکھتے ہوئے سلام کیا، اس کی توقع کے خلاف وہ دوپٹہ عام انداز میں لئے بیٹھی، اسی کی جانب دیکھ رہی تھی، نہ تو چہرے پر گھونگھٹ تھا، نہ ہی کوئی حیاہ آلود تاثر، سلام کا جواب نہ پا کر وہ چند لمحوں کے اندر حیرت زدہ سا اسے دیکھتا رہا اور پھر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ زین ندیم نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”بہت بری۔“ وہ بغاوت آنکھوں اور لہجے میں سموتے ہوئے بوی تو زین ندیم نے ابھن آمیز لگا ہوں سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ وہ چونکا۔

”میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، میں اپنے کزن نواز کو پسند کرتی ہوں۔“ اس نے زین ندیم کی سماعتوں پر ہم پھوڑا تھا۔

”مگر میرے والدین کو ایسا لگتا تھا کہ ایک معمولی تنخواہ دار کزن تمہیں کیا دے سکتا ہے، آپ تو بہت بڑے آفیسر ہیں، آپ سے شادی کی صورت میں، مجھے زندگی کی ہر خوشی ہر نعمت مل جائے گی، پتا نہیں والدین بیٹیوں کی خوشیوں کو پیسے کے ترازو میں رکھ کر کیوں تولتے ہیں۔“

زین ندیم ساکت بیٹھا بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مگر میں اس شادی کو نہیں مانتی، آپ ابھی اسی وقت مجھے طلاق دیں۔“ زین ندیم چند لمحوں کی دہن کے منہ سے ایسی بات سن کر ششدر رہ گیا، اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

”کیا فضول بات کر رہی ہیں، جانتی ہیں کیا

”بابا انھیں پلیز، واپس آ جائیں، میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں۔“ غصہ فطری کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی، وہ زور زور سے سانس لینے لگے تھے۔

”آپ باہر جائیں۔“ ڈاکٹر زبیری سے ان کے قریب آئے اور فروا کو ہدایت کی۔

”نہیں۔“ اس نے سر ٹہنی میں ہلایا۔

”پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔“ اسے باہر نکال کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔

”بابا واپس آ جائیں۔“ نویلہ کے گلے لگے بس وہ یہی کہے جا رہی تھی۔

☆☆☆

زین ندیم کی ٹریننگ مکمل ہو گئی تھی اور اب اس کی پہلی پوسٹنگ حیدر آباد میں ہوئی تھی، اس نے بطور اسٹنٹ کسٹروپنا آفس جوائن کیا، تو اس کے سٹاف نے اسے کھلے دل سے ویلکم کہا، وہ نہ صرف خود حسین و جمیل تھا، بلکہ اس کا دل اور سوچ بھی خوبصورت تھی، وہ ایک ایما عمار، فرض شناس اور نرم مزاج آفیسر تھا، مگر کام کے معاملے میں وہ کوئی کوتاہی برداشت نہ کرتا تھا۔

ثمینہ نے اس کے لئے لڑکی پسند کر لی تھی اور اس نے سعادت مندی سے ان کی پسند کے سامنے سر جھکا دیا تھا، فروا سے اسے کوئی دھواں دھار عشق نہ ہوا تھا، نہ ہی وہ اس کا دیوانہ تھا، لیکن وہ اس کی پہلی محبت تھی، اس کی اولین چاہت اور پہلی محبت کو بھلانا اتنا آسان تو نہ تھا، مگر وہ ایک اعلیٰ کردار، اصول پسند اور صاف طبیعت کا مالک تھا، ایسے بے ایمانی اور خیانت ہر گز پسند نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ فروا کی یادوں کو دل کے قبرستان میں دفن کر کے اپنے بیدار دماغ میں داخل ہوا تھا، رشتہ طے ہونے کے بعد ایک دوسرے پر جبر سے اس کا انتہا بیک سے سامنا ہوا تھا، مگر اس نے اس پر خاص

کہہ رہی ہیں آپ؟“ وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اچھی طرح جانتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی سمجھیں اس بات کو۔“ اس کا سکون غارت کر کے وہ اطمینان بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

”میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔“ زین ندیم نے دو ٹوک الفاظ میں اسے باد کر دیا۔

”اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر قائم کیا گیا رشتہ میں بلا جواز ختم نہیں کر سکتا۔“ وہ قطعیت سے بولا تھا۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔“ وہ پہلی بار گہرائی تھی، اس نے اور نواز نے اپنی طرف سے تو بہت اچھی پلاننگ کی تھی۔

”میری امی آپ کو بہت محبت اور شوق سے بیاہ کر لائی ہیں، میں آپ کو ان کے ساتھ ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“ وہ اسے اپنا فیصلہ سنا کر چہنچ کرنے چلا گیا تھا، واپس آیا تو وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

”آپ کو اس شادی سے کچھ نہیں ملے گا، کیا آپ کی غیرت اس بات کو گوارا کرتی ہے کہ آپ کی زندگی میں ایک ایسی لڑکی آئی ہے جس کے دل میں کوئی اور ہے۔“ وہ اسے اکسار ہی تھی مجبور کر رہی تھی، کہ کسی طرح وہ اسے طلاق دے کر نکالے اور وہ جا کر اپنے والدین کو بتائے کہ ان کا فیصلہ کتنا غلط تھا اور پھر اس کی شادی نواز سے ہو جائے۔

”میری غیرت ایک رات کی دہن کو طلاق دینا بھی گوارا نہیں کرتی، چاہے وہ خود ہی کیوں نہ مانگے۔“ وہ سکون سے بولا اور جا کر بند پر نیم دراز ہو گیا اور اپنا موبائل اٹھا کر اسے دیکھنے لگا، وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر رہا تھا۔

”زین صاحب میں آپ کو اپنے ساتھ ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔“ وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اور غصے سے موبائل فون اس کے ہاتھ سے چھینا۔

”کیا بدتمیزی ہے یہ؟“ زین ندیم اٹھ کر بیٹھ گیا اور موبائل اس سے لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے غصے سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”آپ مجھے زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔“ اس نے ہاتھ پیچھے کیا۔

”آپ یہاں آئی اپنی مرضی سے ہیں، مگر جائیں گی میری مرضی سے۔“ وہ اسے چڑا رہا تھا۔

”میں آپ کی زندگی کو جہنم بنا دوں گی۔“ اس نے غم و غصے کا شکار ہو کر کہا۔

”شوق سے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”اور اب میرا موبائل واپس کر دو، اس میں کچھ بھی نہیں ہے، میں بہت شریف بندہ ہوں، میری کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں ہے۔“ اس کی باتیں انتیابیک کا پارہ ہائی کر رہی تھیں۔

”میں آپ سے امپر لیں نہیں ہونے والی۔“ اس نے موبائل فون زین ندیم کے پہلو میں پٹھا۔

”ہو جاؤ گی، ہزاروں لڑکیاں مجھ پر مرتی ہیں، آپ کیا چیز ہو۔“ اس نے تکیہ اٹھا کر منہ پر رکھ لیا، انتیابیک نے فوراً تکیہ کھینچا۔

”ایسا قیامت تک بھی نہ ہوگا، میں صرف اور صرف نواز سے محبت کرتی ہوں۔“ وہ ذرا بھی نہ شرمائی، نہ جھجکی اور نہ ہی اسے زین ندیم سے ڈر لگا۔

”اسے آپ کی بے وقوفی کہوں یا۔“ اس نے تصدائبات ادھوری چھوڑ دی۔

”شوہر کے سامنے محبوب کا نام لینے والی عورت بہادر نہیں بلکہ بے باک لگتی ہے۔“ وہ کہنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔
”اور بے باک عورت اچھی نہیں سمجھی جاتی۔“

”مجھے فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے کندھے اچکائے، زین ندیم اسے دیکھے گیا۔
”اور آپ انھیں یہاں سے، ادھر مجھے سونا ہے۔“ زین ندیم نے بھی مزید بحث کا ارادہ موخوف کیا اور نکیلاٹھا کر صوفے پر چلا گیا۔
اپنے بیڈ روم میں داخل ہونے سے پہلے اسے ذرا اندازہ نہ تھا کہ ایسا کچھ بھی ہو سکتا ہے، وہ ایک ہینڈم لڑکا تھا، اتنی اچھی پوسٹ پر جاب کر رہا تھا، انٹیا بیگ، شمینہ کے کالج کی ایک ریٹائرڈ پروفیسر کی بیٹی تھی اور شمینہ کے رشتہ ماٹلنے پر اس نے خوشی خوشی ہاں کہہ دی تھی۔

☆☆☆

شمیر اور ماہ وش اسے زندگی کا احساس دلانے عروبہ ہر وقت ان دونوں کے ساتھ مصروف رہتی تھی، اس نے فارقلیط حسن کو معاف کر دیا تھا، اس کے سوا وہ کبھی کیا سکتی تھی، اس کا غصہ ناراضی اور ہر بات فارقلیط حسن کی محبت کے سامنے ہار گئی تھی، وہ لوگ انگلینڈ میں شفٹ ہو گئے تھے، سال میں دو بار پاکستان آتے اور کبھی حسن بہزاد ان کے پاس رہنے آ جاتے تھے، عروبہ نے دوبارہ بابا یا نویلہ سے کانٹیکٹ نہیں کیا تھا، فارقلیط حسن کے کہنے پر بھی وہ آمادہ نہ ہوئی تھی اور پھر وہ بھی خاموش ہو جاتا تھا، اس نے اپنا بزنس اشارت کر دیا تھا، اس کا یہاں مستقل رہنے کا پلان تھا، وہ خوب محنت کر رہا تھا حسن بہزاد نے اسے بہت سمجھایا تھا، مگر وہ نہ مانا، اس کا خیال تھا کہ پاکستان میں رہیں گے تو لوگ ان کی لائف کو

ڈسٹرب کرتے رہیں گے۔

”اگر تم یہ بات روزانہ مجھے بتا دیا کرو کہ تمہارے دل میں، میں ہوں تو میری عمر بڑھ جائے گی۔“ شام کا وقت تھا، عروبہ غفغفر کافی کا گگ تھاے لان میں آ گئی، وہ اس درخت کے پاس آ کھڑی ہوئی جس کے تنے پر فارقلیط حسن نے اپنا اور اس کا نام کھودا تھا۔

”فارقلیط!“ اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے تنے پر ہاتھ پھیرا۔

”جیسے اس درخت کے تنے پر ہمارا نام ساتھ ساتھ لکھا ہے اور یہ صدیوں تک لکھا رہے گا، اسی طرح میرے دل پر تمہارا نام لکھا رہے گا، میں اگر اس دنیا سے چلا بھی جاؤں نہ تو میری محبت کا حصار تمہیں اپنی حفاظت اور پناہ میں لئے رکھے گا۔“ اس کا لہجہ آج بھی ان سرد فضاؤں میں گونج رہا تھا۔

”میرا دل چاہتا ہے دنیا تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں اور ساری دنیا کو بتاؤں How much i love“ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور لب مسکرا رہے تھے۔

”دیکھنا ایک دن ہسٹری میں سچا عشق کرنے والوں میں ہم دونوں کا بھی نام لکھا جائے گا، میرا ارادہ یہ ہے کہ مورخ لکھے، ایک شوہر اپنی بیوی پر عاشق ہو گیا۔“

”اس میں کیا Different ہے؟“ سرد ہوا عروبہ کے چہرے سے لگرائی تو اس نے جھرجھری لی۔

”تم خود دیکھو، کبھی کوئی شوہر بیوی کا عاشق ہوتا ہے بھلا۔“ بیرونی دروازہ کھول کر فارقلیط حسن اندر آیا اور بغور اسے دیکھا۔

☆☆☆

فروا کا یونیورسٹی میں لاسٹ سمسٹر چل رہا

child! ” وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے بولے۔
نویلہ کا میڈیکل کالج میں انڈیشن ہو گیا تھا،
وہ پڑھائی میں مصروف ہو گئی تھی، کبھی کبھار وہ فردا
اور بابا کے ساتھ مل کر چائے پینے آ جاتی، وہ وقت
غففر علی کے لئے بہت اچھا ہوتا تھا اور تب وہ
عروہ کو بہت یاد کرتے، نویلہ کے کہنے کے باوجود
وہ اسے کال نہ کرتے تھے، البتہ نویلہ انہیں جھوٹی
تسلیاں دیتی رہتی تھی کہ اس کا عروہ سے رابطہ
ہے اور وہ انہیں سلام کہتی ہے۔

☆☆☆

علیہ کو والدین کے گھر میں آئے ہوئے
بہال سے اوپر کا عرصہ ہو گیا تھا، مگر عدیل اسے
اپنے پاس نہ بلوا رہا تھا، شروع شروع میں تو وہ
کال کرتا، اسے پیار سے سمجھاتا، صوفیہ کی باتیں
کرتا، رفتہ رفتہ دونوں کی لڑائیاں بڑھنے لگیں اور
پھر یوں ہوا کہ عدیل نے اس سے ہر رابطہ ختم کر
لیا۔

صوفیہ بھائی سے سخت ناراض تھیں، جنہوں
نے بہن کو اتنا برا دھوکہ دیا تھا۔
”صوفیہ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ ہر بار
یہی کہہ کر خاموش ہو جاتے، صوفیہ غففر علی کے
پچھے بڑی تھیں کہ وہ عدیل سے بات کریں، مگر
اب تو وہ بات کرنے کے لئے بھی آمادہ نہ تھا،
بالآخر علیہ نے اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر
لیا۔

صوفیہ خود اس کے ساتھ جانا چاہتی تھیں، مگر
ان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی، علیہ تنہا ہی اس کے
پاس جا پہنچی، ٹیکسی اسے عدیل کے پارٹمنٹ کے
سامنے چھوڑ گئی تھی، دل میں ہزاروں خوش گمانیاں
اور دوسوے لئے دہ آگے بڑھی، اس کا خیال تھا
اسے اچانک سامنے دیکھ کر عدیل بہت خوش ہوگا،
دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر داخل ہو گئی تھی۔

تھا، مصعب سکول جانے لگا تھا، وہ باپ دادا اور
دادی کی نسبت اس سے زیادہ اٹچ تھا، فردا بھی
اسے دل و جان سے چاہتی تھی، وہ یونیورسٹی سے
واپسی پر بابا کے آفس جانے لگی تھی، غففر علی میں تو
جیسے نئی زندگی آگئی تھی، فردا بھی سب ناراضی بھلا
کر اب دل و جان سے ان کو چاہنے لگی تھی، ان کا
خیال رکھنے لگی تھی، صوفیہ اور علیہ کی چھٹی نظروں
کو اکتور کر کے وہ اکثر ان کے پاس رہنے کے
لئے آ جاتی تھی۔

”چائے نہیں گے بابا؟“ وہ ابھی ابھی
ایک مینگ سے لوٹے تھے اور خاصے تھکے ہوئے
تھے۔

”ہاں ضرور۔“ اس نے انٹرکام اٹھا کر دو
کپ چائے کا آرڈر دیا، غففر علی صوفیہ پر بیٹھ
چکے تھے، جبکہ فردا ان کی چیئر پر جا بیٹھی۔
”اس سیٹ پر بیٹھ کر میں کسی لگتی ہوں؟“ وہ
شرارت سے گویا ہوئی۔

”بہت پیاری،“ غففر علی مسکرا دیئے۔
”بالکل میرا بیٹا لگتی ہو اور مجھے اطمینان ہے
کہ میرے بعد اس سیٹ کو بہت اچھے طریقے سے
سنجھالو گی۔“ ان کی بات پر فردا کا دل ڈوب سا
گیا تھا۔
”کبھی کبھی آپ بہت گندے بچوں والی
باتیں کرتے ہیں۔“ فردا نے منہ پھلاتے ہوئے
خفگی سے بھرپور لہجے میں کہنا تو غففر علی کو اس پر
ڈھیروں پیار آیا، وہ ہنس دیئے۔

”اچھا سوری، اب نہیں کہتا ایسی بات۔“
چائے آگئی تھی، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے
براہر آ بیٹھی تھی۔

”I love you baba!“ چائے کا
ایک سیپ لیتے ہوئے وہ بے اختیار ہی سے بولی۔
”Love you too my“

ہمت نہ تھی، خاموشی سے باہر نکل گیا، کھانا کھا کر کمرے میں واپس آیا تو وہ وہاں نہ تھی۔ اس کے دل میں انہونی کا خیال آیا، وہ اسے ہر جگہ تلاش کرنے کے بعد لان میں نکل آیا، اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، تیرہ کنال کے اس اسٹنٹ کمشنر ہاؤس کا کونا کونا اس نے ملازموں کو چھاننے کے لئے کہا اور خود سنگی بیچ پر بیٹھ گیا، وہ لڑکی اس کی سوچ سے زیادہ خود سر، ہٹ دھرم اور بے وقوف تھی۔

☆☆☆

رات کافی ہو گئی تھی، وہ آفس سے نکل کر پارکنگ کی جانب بڑھا، دل شادماں و مسرور تھا، اپنی ہی دمن میں وہ چلا جا رہا تھا، کہ دفعتاً باتیں طرف سے ایک گاڑی آئی اور ٹل اس کے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھتا، اس گاڑی سے اس پر اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی تھی، اسے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا اور وہ زمین پر گرتا چلا گیا، ہاتھ میں پکڑا موبائل چھوٹ کر دور جا کر اس پر کال آنے لگی، خون میں لت پت بے بسی کی انتہاؤں پر پہنچتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل کو اٹھانے کی کوشش کی، مگر وہ ناکام رہا، موبائل کی آواز سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی، مگر دل کہیں نیچے ہی بیٹھتا جا رہا تھا، اس کا حرکت کرتا ہاتھ رک گیا تھا، آنکھیں بند ہو گئی تھیں، سامنے درخت پر بیٹھا پرندہ زور سے چیخا تھا، اس کی چیخ کا گلا کسی دوسرے پرندے نے بے دردی سے کھوٹا تھا اور گہری ہوئی سیاہ رات اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ (جاری ہے)

”عدیل!“ اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا، اسے سامنے دیکھ کر دل میں موجود تمام غصہ و ناراضی لحوں میں غائب ہوئی تھی۔ ”بابا کی جان، بابا کا بیٹا۔“ وہ دو قدم آگے بڑھی، اور اس کے قدم ساکت ہو گئے، وہ پچٹی پچٹی نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

انتیا بیگ نے زین کے ساتھ جانے سے انکار کیا تھا اور زین نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا، وہ جب بھی گھر کا چکر لگاتا غمیدہ اس کے سر ہو جاتیں، اس بار تو انہوں نے اس کی ایک نہی اور انتیا بیگ کو زبردستی اس کے ساتھ بیچ دیا، اسے گھر چھوڑ کر وہ آفس چلا گیا تھا، بہت سے ضروری کام تھے جنہیں نشتا تے ہوئے اسے کافی دیر ہو گئی۔ ”کل خان کھانا لگوا دو، میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“ اس نے اپنے خاص ملازم کو ہدایت کی اور بیڈروم میں آ گیا۔ ”انتیا اٹھو کھانا کھا لو۔“ اس کے قریب بیٹھے ہوئے وہ اسے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”انتیا!“ زین ندیم نے اس کا گال تھپتھپایا۔

”میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے یہاں زبردستی لے تو آئے ہو، مگر پچھتاؤ۔“ وہ اس کی بات سن کر رکھا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے ایک دفعہ نہیں کہا، تمہیں ساتھ آنے کے لئے، آپ خود آئی ہیں میرے ساتھ۔“ انتیا کا رویہ ہنک آمیز تھا وہ برداشت کر رہا تھا۔ ”آپ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر روئیں گے، یاد رکھیے گا میری بات۔“ وہ چلائی تھی، زین ندیم تھکا ہوا تھا، مزید اس کی کوئی فضول بات سننے کی

کمرے اور گھر کی تنہائی سے وحشت ہونے لگی تھی
رویکہ کی روتی آنکھیں بار بار آنکھوں کے سامنے آ
رہی تھیں، وہ سر کے بالوں میں انگلیاں پھنساتا
اپنی بے بسی پر کڑھتا دوبارہ وہیں صوفے پر بیٹھ
گیا، موبائل اٹھا کر ہر روز کی طرح اس کا نام
نکالا۔

”رویکہ اسجد علی!“ اس کا پیارا سا نام
موبائل کی اسکرین پر جگمگایا تھا۔

کھڑکی کھلی تھی اور باہر لان میں بکھرے
پھول پتے دیکھتے ہوئے یونہی نظر اٹھا کر آسمان کی
سمت دیکھا تھا، چھوٹی چھوٹی بدیلیوں کے ٹکڑے
آسمان کی نیلاہٹوں کو دھندلا رہے تھے، یہ موسم،
یہ منظر بھی یونہی خواہ مخواہ کی خوشی دیتا تھا، وہ بستر پر
لیٹے لیٹے رویکہ کو آواز دے کر پکڑوں کی فرمائش
کرتا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی جاتی
تھی، بارش کا موسم خود رویکہ کو بھی بہت پسند تھا،

ناولٹ

”کہاں چلی آئی رویکہ، کسی کی خاطر تم نے
اپنا گھر کیوں برباد کر لیا؟“ موبائل ہاتھ میں لئے
وہ یونہی اس سے مخاطب ہوا تھا، اجانک ہی نظر
سائیڈ ٹیبل پر دھرے فوٹو فریم پر جا گئی تھی، ان
دونوں کی نادرن ایریاز کی تصویر تھی، ہنسی مسکراتی
رویکہ مسکراتے ہوئے اسی کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”میرے گھر کی مسکراہٹوں کو کس کی نظر لگ
گئی اور بچے؟ بچے کیسے ہوں گے؟ وہ تو اپنے گھر
کے بغیر کہیں ایک گھنٹہ نہیں رہتے؟ اور میرا
چھوٹا..... وہ تو بابا کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتا.....
اوہ..... رویکہ پلیز واپس آ جاؤ۔“ ضبط کی آخری
حدوں کو چھوٹا وہ عاصم کا نمبر ملانے لگا، عاصم اس کا
برنس پارٹنر اور بہترین دوست تھا۔

”عاصم یار پلیز تھوڑی دیر کے لئے آ جا،
مجھے کچھ پرسنل پرابلم ڈیکس کرنی ہے۔“ اور اس
کی آواز کی پریشانی محسوس کر کے عاصم نے پانچ





دیکھا، وہ سر جھکائے دس سال پیچھے کا سفر کرنے لگا۔

☆☆☆

”یہ آپ سب کے کپڑے میری امی نے پہنا دیوں گے دیئے ہیں۔“ سخی سنواری رویہ نے ایک بڑا سا بیگ اپنی ساس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا انہوں نے بڑے اشتیاق سے کھولا تھا۔

”ارے یہ کیا اتنا ہلکا کپڑا، اور میرے دونوں دامادوں کے تو کپڑے ہی نہیں ہیں اور یہ بڑی بہو کا جوڑا ہے؟“ عجیب سے انداز میں سارے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کاٹ کھانے والی نظروں سے رویہ کی سمت دیکھا تھا۔

”رہنے دیں امی، ہم خود بازار سے دوا چھٹے والے مردانہ جوڑے لے آئیں گے اور ان پہنا دیوں گے کپڑوں میں رکھ لیں گے، کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ دلہن کے گھر سے ”یہ کچھ“ آیا ہے۔“ اس کی ایک تند نے طنز بے انداز میں کہا تھا، دل کو جیسے کسی نے مٹی میں لے کر دبا دیا تھا، اسجد سے نظریں ملی تھیں، وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”اور بھابھی برا مت منائیے گا، میں نے کبھی شلوار میض نہیں پہنی، آپ کے گھر سے میرے لئے شلوار میض کا کپڑا آیا ہے۔“ اس کے دیور اسد نے بھی عورتوں کی طرح دل دکھانے میں حصہ لیا تھا، وہ بمشکل آنسو چھپاتی وہاں سے نکل گئی تھی۔

”گھر تو اتنا بڑا ہے تمہارے سرالیوں کا اور دل، یہ اتنا سا۔“ اس کے نکتے ہی بڑی آپا نے ہاتھ کے اشارے سے بات کرنے ہوئے اسجد کو مخاطب کیا تھا۔

”میں تو ان فضلوں کی رسموں کو مانتا ہی نہیں ہوں آپا پہلے ہی لڑکی والوں کا اتنا خرچہ ہو جاتا ہے۔“ اسجد نے بات ختم کر دی، آپا نے برا سامنے

منٹ میں پہنچنے کا کہا تھا۔

”یار رویہ اتنے سالوں سے ایسی باتیں برداشت کر رہی تھی، اس نے کبھی کوئی بات دل میں نہیں رکھی تھی، تھوڑا بہت غصہ کرتی وہ بھی صرف میرے ساتھ، کسی اور پر تو وہ بھی ظاہر بھی نہیں ہونے دیتی تھی کہ اسے کسی کی بات بری لگی ہے یا وہ کسی کی بات سے ہرٹ ہوئی ہے، وہ سب کی خدمت کرنے میں بھی آگے آگے رہتی تھی اتنا کچھ ہونے کے باوجود کسی بھی موقع پر دعوت کرنا، سب کو اکٹھا کر کے ناراضگیاں ختم کرنا یہی عادت تھی اس کی، یہی فطرت تھی مگر اس بار..... اس بار اس نے نہ غصہ کیا نہ کسی سے کوئی گلہ شکوہ کیا نہ مجھ سے جھگڑا کیا، بس خاموشی سے اپنا بیگ تیار کیا اور امی کے ساتھ چلی گئی، فائق اور شارق کو بھی ساتھ لے گئی، یار اس کے بھائی بھابھی آنے والے ہیں دوپٹی سے، وہ کیا سوچیں گے؟ اتنے سالوں میں وہ کبھی پورے ایک دن کے لئے میکے نہیں گئی تھی اور اب یوں اچانک یوں ناراض ہو کر بنا کچھ کہے سے چلے جانا، کوئی رابطہ نہ رکھنا، میں فون کرتا ہوں تو وہ کال اینڈ ہی نہیں کرتی، امی (رویہ کی امی) کو کال کرتا ہوں تو وہ بڑے آرام سے کہہ دیتی ہیں، دو چار دن کا غصہ ہے، آجائے گی واپس۔“ وہ لان میں بیٹھا عاصم کے سامنے بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

”جہاں تک مجھے معلوم ہے اسجد تمہارے گھر والوں کا رویہ کبھی بھی رویہ کے ساتھ منصفانہ نہیں تھا، ہر موقع پر ہر جھگڑے کے بعد رویہ بھابھی کی عزت نفس کو مجروح کیا گیا، ضروری نہیں ہے کہ وہ تمہاری بیوی ہونے کے ناطے سب کچھ برداشت کر رہے، اب یہ بتاؤ کہ ہوا کیا تھا، شروع سے لے کر آخر تک۔“ عاصم نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسجد کی سمت

”دیکھ لینا رویہ، یہ تمہارا اتنا اچھا ہونا ایک دن رلائے گا تمہیں۔“ وہ اسے خبردار کر رہا تھا۔

”روٹی تو میں بہت ہوں، بات بات پر آنسو آجاتے ہیں، امی کہتی تھیں یہ چڑیا جیسا دل لے کر سرسرا جاؤ گی تو گزارہ نہیں ہوگا مگر آنسو نکال کر میرا سارا غصہ سارا غبار نکل جاتا ہے پھر نہ کوئی غصہ ہوتا ہے نہ کسی سے کوئی ناراضگی اور ہاں ایک بات اور آنسو بھی بس آپ کے سامنے نکلیں گے وعدہ۔“ وہ معصومیت اور سادگی سے بول رہی تھی، اسجد نے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”یار..... اب میں تم سے کیا کہوں؟“ وہ دوبارہ فی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

”میں نے آج چار ہزار دے دیئے اسد بھائی کو کپڑوں کے لئے۔“ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بالوں میں برش کر رہی تھی، اسجد نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔

”تم اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہو رویہ؟ چار ہزار کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔“ اسجد کوچ چار میں غصہ آیا تھا۔

”اور رشتوں سے زیادہ اہم بھی نہیں ہوتے چار ہزار روپے اسجد، میں نے ہمیشہ رشتوں کو اہم سمجھا ہے، پیسے کو نہیں، اس بات کو آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اگر میرے نزدیک دولت کی کوئی اہمیت ہوتی تو آج میں یہاں آپ کے اس چار مرلے کے مکان میں، آپ کی بیوی کی حیثیت سے نہ بیٹھی ہوتی۔“ اس نے آئینے میں دکھائی دیتے اسجد کے عکس کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا، وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”یہی رشتے ایک دن رلائیں گے تمہیں رویہ، تم ابھی ان باتوں سے قطعی ناواقف ہو، جو شخص بہت مخلص ہوتا ہے ناں بالکل چڑیا جیسے نرم

بنا کر سر جھٹکا تھا۔

”اسجد، میں اسد بھائی کو پینٹ شرٹ لے دوں گی، ہم شام کو بازار چلے جائیں گے، کم از کم ان کو شکوہ تو دور ہو، مجھے ذرہ بھی اندازہ نہیں تھا اور امی نے بھی غلطی کی، دونوں نندیوں کے کپڑے کیوں نہیں رکھے؟“ وہ کمرے میں آیا تو رویہ اسی موضوع کو لے کر بیٹھ گئی، یقیناً اس کا دل دکھا تھا مگر اپنی مثبت سوچ کے ہاتھوں مجبور وہ سب کی ناراضگی کے خیال سے افسردہ بیٹھی تھی۔

”کیوں بہت پیسہ ہے تمہارے پاس، انسان تو کبھی کسی کو خوش نہیں رکھ سکتا اور خاص طور پر تم اس گھر میں کبھی کسی کو خوش نہیں رکھ سکو گی، کچلے شکوے کرنا، مین بیچ نکالنا عادت ہے یہاں سب کی۔“ اسجد نے فی وی آن کر کے سامنے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا، وہ اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

”مگر اسجد یہاں تو صریحاً ہماری غلطی ہے، میری اور امی کی۔“ اس کی بات پر اسجد نے غور سے اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

”قدم قدم پر تمہیں محسوس ہوگا رویہ کہ تم ہی غلط ہو..... یہ میرا گھر ہے اور میرے گھر والے..... میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں اور تم بالکل خاموش ہی رہو تو بہتر ہے، آج ایک بار کپڑوں کے لئے پیسے نکالو گی تو عادت ہو جائے گی سب کو۔“ وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا تھا۔

”کوئی بات نہیں اسجد، گھر کے افراد ہی ناراض ہوں تو کیا فائدہ ایسی زندگی کا اور ویسے بھی مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ ایک گھر میں رہنے والے ہی ایک دوسرے سے منہ بسورے زندگی گزاریں۔“ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر برابر میں بیٹھ گئی۔

دل کا مالک، لوگ اس کے خلوص کی خوب نافرمانی کرتے ہیں اور ایسے حساس دل جب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہیں تو رشتوں سے ہی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔“ وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا تھا، وہ اس کی طرف گھوم گئی۔

”آپ ہر وقت منفی باتیں کیوں سوچتے ہیں اجد؟ اور کوئی کیوں کرے گا نافرمانی، میں نے کسی کا برا نہیں سوچا، کبھی کسی کے لئے برا نہیں چاہا تو پھر.....؟ آپ تو ایسے ہی خواہ مخواہ ڈراتے رہتے ہیں بس۔“ اس نے منہ بند کر دیا۔

”اچھا میری پیاری بیوی، بنی رہو مدد رثیا، کرتی رہو سب کا بھلا۔“ وہ اسے شانوں سے تھامتے ہوئے بولا۔

”میں ایسی ہی ہوں اجد، مجھے سب کو خوش رکھنا اچھا لگتا ہے۔“

”ہاں اور کبھی کبھی مجھے اپنی قسمت پر رشک آتا ہے کہ مجھے اتنی نیک اور نرم دل بیوی ملی ورنہ لولوں کی زبان دراز اور جھگڑالو بیویاں دیکھ کر خوف آتا تھا۔“ وہ سچے دل سے بولا، اپنی تعریف سن کر وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

☆☆☆

گھر میں دو نئے کمرے تعمیر کروائے گئے تھے، دو باتھ روم جو دونوں کمروں سے ملحقہ تھے، نیچے کے پورشن میں کچن بھی نیا بنوایا گیا تھا، سیزھیوں کی جدید انداز کی ریٹنگ بھی بنوائی گئی اور اس پر شادی کے تمام اخراجات، اجد کی جیب بالکل خالی ہو چکی تھی، شادی کے بعد وہ رویجہ کا کوئی بھی شوق پورا نہ کر سکا تھا، نہ ہوٹل میں ڈنر کے لئے لے جا سکا، نہ کوئی ہنی مون کا پروگرام بنایا، نہ منہ دکھائی میں کچھ دیا، اب وہ اپنی سلامیوں کے پیسے اور اپنے ذاتی پیسوں سے یوں سب کے لئے شاپنگ کر رہی تھی تو روک بھی نہیں

سکا، رویجہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی، شہر کے ایک مشہور اسکول میں ٹیچر تھی، پڑھے لکھے تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس نے خود اجد کو اپنے لئے منتخب کیا تھا، اجد کا تعلق ایک عام سے سفید پوش گھرانے سے تھا، چند افراد پر مشتمل گھرانہ جس میں صرف اجد ہی تھا جس کی کمائی باقی سب بھائیوں سے بہتر تھی، رویجہ کے اسکول سے ذرا فاصلے پر ہی اجد کا آفس تھا اجد ایک پرائیوٹ فرم میں کام کرتا تھا، رویجہ نے ایک کولیک کے توسط سے ہی اجد کی ساری معلومات لیں تھیں۔

”رویجہ یار تمہارے اور اس کے گھرانے میں زمین آسمان کا فرق ہے، بس یہ اجد ہی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے، باقی گھر کے طور طریقہ اور سب کی عادت بالکل مختلف ہیں، انتہائی سطحی ذہنیت کے لوگ ہیں، تم کس طرح ایڈجسٹ کرو گی؟“ اسی کولیک نے سمجھانا بھی چاہا تھا۔

”میرے دل میں یہ خیال اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے صبح اور جس رب نے یہ خیال دل میں ڈالا ہے وہ ایڈجسٹ ہونے میں بھی مدد کرے گا، اجد دیکھنے میں تو بہت اچھا ہے، بڑا سیریس سا، کام سے کام رکھنے والا۔“ وہ بات کے آخر میں مسکرائی تھی۔

”تیرا کچھ نہیں ہو سکتا، میں سمجھ گئی تیرا مسئلہ۔“ صبح نے مسکراتے ہوئے آنکھ دہائی تھی، وہ کھل کر مسکرا دی۔

☆☆☆

اس رشتے کے لئے اس نے اپنے گھر والوں کو بھی بہت مشکل سے راضی کیا تھا، پہلے پہل تو سب نے نقص نکالا مگر بعد میں اس کی حد سے زیادہ تنجیدگی اور دلچسپی دیکھ کر سب کو خاموش ہونا پڑا، شادی کی تقریب خوش اسلوبی سے مکمل

خوشگوار بنادیا تھا، ٹھنڈی ہوا، اس بات کا سندیہ دے رہی تھی کہ کہیں قریب ہی بارش ہوئی ہے، اجد نے واپسی پر اسے تیار ہونے کو کہا تھا۔

”کھونٹے چلتے ہیں، تمہیں آکس کریم کھلا کر لاتا ہوں۔“ وہ خوشی خوشی تیار ہونے چل دی، خوبصورت نیلے رنگ کے شیفون کے سوٹ میں ملبوس نکھری نکھری رویہ ہنسی مکرانی کمرے سے باہر آئی تھی، اجد کی موٹر سائیکل پر بڑی جیشانی کا فرحان چڑھا بیٹھا تھا، گندے جلیے والا فرحان جس کے پاؤں میں سینڈل بھی نہیں تھے۔

”چلیں؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے بچے کی سمت دیکھا، بھابھی مزے سے چارپائی پر بیٹھیں لہسن پیاز چھیلی رہیں۔

”ہوں چلو۔“ اجد بال ٹھیک کرتا بایک اشارت کرنے لگا۔

”یہ بھی چلے گا ساتھ؟“ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

”ہاں بھی ضد کر رہا تھا کہ میں نے چاچو کے ساتھ جانا ہے، بچہ ہے خوش ہو جائے گا۔“ ساس نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے یوں کہا جیسے یہ کوئی عام سی بات ہو، ان کی نئی نئی شادی تھی اور ایسے میں انہوں نے جان بوجھ کر بچے کی ضد کو بڑھا دیا تھا۔

”اچھا پھر اس کو صاف تو کر دیں، سینڈل کہاں ہیں اس کے؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں ناگواری آگئی، اجد کو احساس تھا مگر وہ خاموش ہی رہا۔

”میلے پر تو نہیں جا رہی تم بی بی، سڑکیں نا پنے جاری ہو، کسی نے بچے کے کپڑے سینڈل نہیں دیکھنے۔“ ان کی آواز اور لہجے کی سختی سے وہ خاموشی سے اجد کے پیچھے بیٹھ گئی، سارا رستہ وہ خاموش ہی رہی، فرحان رنگ برنگے سوال کرتا

کو بچہ، اجد اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا کہ وہ بہت سہولیات اور پیار محبت کی عادی تھی، صرف اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس ماحول میں آئی تھی، وہ دل سے اس کا قدردان تھا، مگر رویہ اس کے گھر والوں کو قبول نہیں تھی، وجہ رویہ کی شخصیت کا اس گھر کے ماحول سے مختلف ہونا ہی تھی، رویہ اردو اسپیکنگ تھی، اس کا رہن سہن، بول چال کا انداز، پہنے اوڑھنے کا طریقہ، یہاں تک کہ کھانے پینے کا ذہب بھی سب سے بہت جدا تھا، ایسے میں گھر کے باقی افراد اسے ہمہ وقت تنقید کا نشانہ بنائے رکھتے تھے۔

☆☆☆

صبح کا وقت تھا، سب ناشتے کے لئے بیٹھے تھے جب رویہ بریڈ کے سلاکس پر کھن لگا کر کھانے لگی، بڑی بھابھی نے طنزیہ انداز میں اس کی سمت دیکھ کر ساس کو اشارہ کیا تھا۔

”بھئی ہو، ہمارے ہاں یہ انگریزوں والے ناشتے نہیں کیے جاتے، تمہاری دیکھا دیکھی بچے بھی ضد کریں گے، پھر ہمارے لئے مسئلہ بن جائے گا، اپنے یہ شوق میکے کی حد تک ہی رکھو تو بہتر ہے۔“ ساس نے روکھے لہجے میں ٹوک دیا، رویہ نے سمجھ گئی میں ترہتر پراٹھے اور سالن کا ناشتہ نہیں کیا تھا، کبھی چھٹی والے دن پراٹھا آٹلیٹ بناتی بھی تو آٹل میں، ان کے ٹوکے پر سلاکس حلق میں اٹکتے لگا تھا، اسی شام فریق میں رکھی جیم کی بوتل جیشانی کے بیٹے نے اٹھانے کی کوشش میں گرا کر چور چور کر دی، وہ خاموش ہی رہی، یہ سب تو اب روزمرہ کا معمول بننے جا رہا تھا، اسے سب نے پہلے ہی منع کیا تھا، بڑی ہمت اور حوصلے سے یہ سب برداشت کرنا تھا۔

☆☆☆

آسمان پر تیرتی بدلیوں نے موسم کو بڑا

☆☆☆

ان دنوں رویہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے تیار تھی، بڑی بھابھی کو پتہ چلا تو وہ بڑے ہی طنزیہ انداز میں بولی تھیں۔

”بھئی یہ پرائیوٹ ڈاکٹر کو چیک کروانا تو پیسے کو ضائع کرنا ہے، سیدھے سرکاری ہسپتال چا کر چیک کرواؤ، آخر وہاں بھی عورتیں ہی جاتی ہیں، اتنا بھی کیا غرہ۔“ اور ان کی اس بات پر وہ بس اسجد کو دیکھ کر رہ گئی، وہ ساس کے ساتھ سرکاری ہسپتال بھی گئی تھی، وہاں کی گندگی اور غلے کی بد فہیڑی سے گھبرا کر اس نے دوبارہ وہاں جانے سے توبہ کر لی۔

”اسجد پلینز آپ میرے چیک اپ اور دوائیوں کے اخراجات کے لئے پریشان مت ہوا کریں، میں خود بیچ کر لوں گی، میرا تھوڑا بہت بینک بیلنس بھی ہے اور میں جاب دوبارہ جوائن کر رہی ہوں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے اسجد کو پریشان دیکھ کر حل نکالا تھا۔

”نہیں یار میں اخراجات کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں بلکہ گھر والوں کی اور تمہاری پسند ناپسند اور اختلاف رائے کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں، کس کی سنوں کس کی نہ سنوں؟“

”میں تو ہر ممکن کوشش کرتی ہوں اسجد کہ وہی کام کروں جس میں سب کی خوشی ہے، جیسا گھر والے کہتے ہیں میں ویسا ہی تو کرتی ہوں۔“ وہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

”اور یہی بات تو مجھے دکھ دے رہی ہے رویہ کہ میں تمہارے دل کو، تمہاری مرضی کو تمہاری پسند ناپسند کو قدم قدم پر مار رہا ہوں باقی سب کی خوشی کی خاطر۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے بولا۔

رہا اور اسجد اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔
”آکس کریم کھاؤ گی رویہ؟“ اسجد نے اسے مخاطب کیا۔

”نہیں میرا موڈ نہیں ہے اسجد۔“ لہجے کو نارمل اور نرم رکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

”مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ تمہارا موڈ کیوں نہیں ہے، بچہ ہے یار، کل کو ہمارے اپنے بچے بھی تو ہوں گے ناں۔“ اسجد نے اس کے دل کی بات پکڑ لی تھی۔

”ابھی ہوئے تو نہیں ناں ہمارے بچے، یہ ٹائم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا، ایک دوسرے کے قریب آنے کا، اور جب میرا اپنا بچہ آئے گا ناں تو کم از کم اتنے گندے چلبے میں، میں اسے کسی کے ساتھ بھی نہیں بھیجوں گی۔“ وہ کہے بغیر یہ رہ سکی، اسجد خاموش ہو گیا، ایک طرف بیوی تھی اور دوسری طرف لاڈلا بیٹھا وقتی غصہ تو اسے بھی آیا تھا ماں اور بھابھی پر مگر پھر بچہ سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی، پھر تو یہ روز کا معمول ہی بننے لگا، وہ روزانہ انہیں دیکھ کر ضد کرنے لگتا، اکثر تو بھابھی انہیں جانے کے لئے تیار دیکھ کر خود اسے باہر لے آئیں، رویہ نے خاموشی اختیار کر لی اور بحث میں الجھنے کی بجائے اب وہ خود فرمان کو صاف سترا کر کے موٹر سائیکل پر بٹھا دیتی۔

”جب گھر سے باہر جاتے ہیں تو صاف سترے ہو کر جاتے ہیں، صاف ستر رہنا تو اچھی بات ہے ناں اور آپ اچھے بچے ہو۔“ وہ اسے پیار سے سمجھاتی تو اسجد کو رویہ پر پیار آنے لگتا، کیسے وہ اپنے دل کو مار کر سمجھوتہ کرنا سکھ رہی تھی حالات سے رویوں سے اسجد کے دل میں اس کی قدر اور بھی بڑھنے لگی تھی۔

”کہیں آپ ایسا مت سوچا کریں، میں خوش ہوں اور سب کو خوش رکھنا تو دیے بھی اچھی بات ہے، انسانی فطرت ہے اسجد کہ پسند کے خلاف کوئی کام ہوتا ہے تو مجھے وقتی دکھ ضرور ہوتا ہے، مگر پھر میں اپنے دل کو سمجھا لیتی ہوں جب رہتا ہے تو سب کی خوشی تو دیکھنی پڑتی ہے ناں۔“ وہ اسجد کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی سمجھا رہی تھی۔

”ہوں بس تمہاری یہی بات تو اچھی ہے، تم حالات کے ساتھ کپور و ماٹو کر لیتی ہو ورنہ میرے لئے بہت مشکل ہو جاتی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے رویہ کی سمت دیکھا۔

”تم میری کمزوری بھی ہو رویہ اور میری طاقت بھی۔“

”بس اب مسکرا دیں اور رات کو میں نے بازار جانا ہے، سوموار سے دوبارہ اسکول جوائن کرتا ہے تو ایک دوریڈی میڈ سوٹ لینے ہیں، کچھ ٹیڑ کو دینے ہیں۔“ وہ اسے تاکید کرتے ہوئے اٹھ گئی۔

”ابھی کیوں جوائن کر رہی ہو رویہ، ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ اس کے پیچھے ہی آکھڑا ہوا، وہ وارڈزروب کھولے اپنے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

”اسکول والے بہت زور دے رہے تھے اسجد، میم کہہ رہی تھیں کہ مجھے مکمل آرام دیں گی، میں نے صرف چار پیڑ لے لئے ہیں اور مجھے بارہ بجے آف بھی دے دیا کریں گی، سیکری بھی ٹھیک ٹھاک ہے اور ویسے بھی اسجد گھر میں اس کمرے کی صفائی کے علاوہ میرا کام ہی کیا ہوتا ہے، میں کوئی بھی کام کر لوں کسی کو خاص پسند نہیں آتا، ابھی کل رات ہی میں نے روٹیاں بنائی تھیں، اسجد بھائی ایک ایک روٹی کا جائزہ لے کر سائیڈ پر

رکھتے رہے، شاید وہ لوگ نہیں چاہتے کہ میں کچن کا کوئی کارڈوں، کل مانا (ساس) نے منع کر دیا کھانا بنانے سے، کہنے لگیں میں خود بناؤں گی۔“

”تمہیں منع کر دیا یا نے؟ حالانکہ بھابھی تو اکثر کھانا بناتی ہیں اور روٹیاں بھی وہی بناتی ہیں خیر۔“ اسجد کو اس کی لکھا بھر کو اتاری صورت دیکھ کر دل سے برا لگا تھا، رویہ کے ساتھ ناروا سلوک اسے دکھ پہنچا رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں، شاید میرے ہاتھ میں ذائقہ ہی نہیں ہے۔“ وہ دوبارہ الماری کی طرف متوجہ ہو گئی، اس لئے رویہ اسے ایسے ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح لگی جو اپنی اتنا کو مار کر مسکراتے ہوئے اپنی شکست کو تسلیم کر رہا ہے۔

”چلو تم دیکھ لو بازار سے کیا کیا لینا ہے پھر چلتے ہیں شام کو۔“ وہ اسے مصروف دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رویہ نے اسکول جوائن کر لیا تھا، اسجد کی وہی مصروفیات تھیں، جو کمایا گھر والوں پر لٹایا، ابھی گھر کی تعمیر کے سلسلے میں وہ ساری جمع پونجی لگا چکا تھا، اب اسدی شادی کا شور اٹھ گیا، اس کے لئے لڑکی دیکھنے کی مہم جاری تھی، ساتھ ہی ساتھ امی کو اور بہنوں کو بری کے کپڑوں زیور اور سب سے بڑھ کر اسد کے کمرے کی فکری، ایسے میں سب کی نظریں اسجد پر تھیں۔

”رویہ کو تو شاید بری کا کوئی کپڑا پسند ہی نہیں آیا اسے کہہ کر وہ سارے کپڑے لے لیں بری کے، وہی کام آجائیں گے، زیور میں انگوٹھی بنوا لیتے ہیں اور باقی کے بارے میں اسجد کچھ کرے گا۔“ امی کی بات پر اس نے حیرت سے انہیں دیکھا، وہ تو ایسے کہہ رہی تھیں جیسے وہ بے خبر تھیں اس کے گئے اخراجات سے۔

کہنے سے خود کو باز رکھا تھا، وقت خود ہی خاموشی اور صبر کا حساب لے لیتا ہے، یہ شاید رویہ کی خاموشی ہی تھی جس نے زونیرا کی شکل میں ایک جھگڑا لوبہ بھج دی تھی۔

زونیرا کے آتے ہی رویہ کو کہیں دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا، اسے کچن کا کام بھی سونپا گیا، رویہ سے دور رہنے کی خاص تاکید کی گئی۔

”معنی معنی ہے رویہ، امجد کو ہمارے خلاف بھڑکانا رہتی ہے، کمرے میں مسمی رہتی ہے، تم اس سے دور ہی رہنا۔“ اور یہ بات کسی نہ کسی طرح رویہ کے کانوں تک پہنچ ہی گئی، امجد ٹھیک ہی کہتا تھا۔

”دیکھ لینا رویہ یہ تمہارا اتنا اچھا ہونا ایک دن رلائے گا تمہیں۔“ اور وہ واقعی رونے لگی۔

☆☆☆

رویہ کی گود میں فائق اور شارق آگئے، اب وہ گھر کے معاملات سے دور ہی رہنے لگی تھی، جاب اور گھر میں بچوں کے ساتھ مصروفیت میں وقت گزرتا رہا، امجد کی وہی روٹیں تھیں، گھر کے بڑے اخراجات کچن کا سامان، امی کی دوائیاں سب اسی کے ذمہ تھیں، ایسے میں رویہ بھی اسے زیادہ پریشان نہیں کرتی تھی۔

”رویہ میں سوچ رہا تھا کہ بیرون ملک جانے کی کوشش کر لوں شاید کوئی کام بن جائے، یہاں رہ کر اس معمولی سی جاب میں تو میں تم لوگوں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتوں گا اور یوں جوائنٹ فیکلٹی میں دن بدن تم لوگوں کے لئے زندگی مشکل ہوتی جا رہی ہے، تم کب تک سمجھوتے کرتی رہو گی، اتنی گرمی ہوئی ہے یہاں کمرے میں اور ہم باہر صحن میں چار پائیاں تک نہیں بچھا سکتے، بچوں کے کھیلنے کی جگہ بھی نہیں اور تم کب تک جاب کر دو گی یار، اپنی صحت خراب کر

”زیور تو کہیے بن سکتا امی، میں نے تو رویہ کے لئے بھی کچھ نہیں بنوایا تھا، ہاں جوائنٹ رویہ کی امی نے مجھے پہنائی تھی وہ میں آپ کو دے دیتا ہوں، کمرے کا خرچ امجد بھائی کر لیں گے اور ولیمہ اور شادی کے باقی اخراجات میں کر دوں گا۔“ اس نے حل پیش کیا۔

”امجد کہاں سے کرے گا بے چارہ، اس کے پاس کہاں سے آئی اتنی رقم، ہاں تم دونوں میاں بیوی کماتے ہو، تم لوگوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ بیوی آپا کی بات پر اس کا ماتھا ٹھنکا تو رویہ کی کمائی پر نظریں میں اب۔

”آپا رویہ اس لئے جاب کر رہی ہے کیونکہ میں اس کے معیار کے مطابق اس کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا، مجھے آپ سب کو لے کر چلنا ہے اور میں نے کہا ناں کہ میں مہندی، ولیمہ کے اخراجات اور بری بنانے کے تمام اخراجات پورے کر دوں گا۔“ وہ بات مکمل کر کے اٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے میں اپنا زیور بچ دوں گی۔“ اس نے بھابی کی کچھ جاتی آواز سی تھی۔

”بچ دیں، ویسے بھی زیور کے معاملے میں اچھی خاصی نا انصافی ہوئی ہے۔“ وہ بات مکمل کرتا چلا گیا۔

”دیکھ لیا امی آپ نے، کیسے بیوی کی زبان بولنے لگا ہے۔“ آپا نے امی کو ٹھوکا دیا تھا۔

”ہاں دیکھ رہی ہوں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اسد کی بیوی عام سی گھریلو لڑکی تھی، اگرچہ اس سے کوئی رشتہ داری نہ تھی مگر وہ برادری کی تھی اور گھریلو فرق بھی کچھ زیادہ نہ تھا، رویہ کو وہ اچھی خاصی تیز طرار محسوس ہوتی تھی، مگر اس نے کچھ بھی

”اور آپ کے چلے جانے کے بعد گھر والوں کی مجھ سے یہ بیگانگی اور بیزاری زیادہ نہیں بڑھ جائے گی؟“ وہم نے سر اٹھا کر۔

”ہاں یقیناً مگر برداشت کرنا پڑے گا، بس چند سال، پھر ہم اپنے گھر شفٹ ہو جائیں گے۔“ وہ پختہ ارادہ کر چکا تھا۔

”ٹھیک ہے، وہ اجنبیت جو اس گھر میں رہتے ہوئے میں نے محسوس کی، میرے بچے بھی محسوس کریں گے، اسجد کیا محبت کرنے اور نبھانے کی اتنی بڑی سزا ملتی ہے؟“ اس نے بھرائی ہوئی آنکھوں سے سوال کیا تھا۔

”ہاں..... شاید۔“ اس نے دور آسمان پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

وہ سب شاید اس کی بے لوث محبت کے حقدار ہی نہیں تھے، اس قابل ہی نہیں تھے کہ وہ اپنا وقت، خلوص اور وفا میں ان پر نبھا کر دے، اسجد کے باہر جانے کی خبر ابلو نے سنی تو آگ بکولہ ہو گئے فوراً سب کو جمع کر لیا۔

”یہ تمہارے کان بھرتی ہے ہمارے خلاف اور تم یہ سمجھنے لگتے ہو کہ بس بیوی ہی سگی ہے تمہاری، باقی تب تو تمہیں الو بتا رہے ہیں، اپنا مطلب نکلوانے کے لئے بات کر لیتے ہیں تم سے۔“ ان کی آواز اور لہجے میں تو نفرت تھی ہی، آنکھوں میں بھی رویہ کے لئے نفرت تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے ابو، رویہ نے مجھ سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی بلکہ یہ تو پہلے دن سے سب کی خوشی میں ہی خوش ہے، چھوٹی سے چھوٹی بات سے لے کر کسی بھی بڑے فیصلے تک رویہ نے کبھی مجھے کسی بات پر ناراض نہیں کیا، وہ سمجھوتہ کرنا جانتی ہے، یہ قطعی میرا ذاتی فیصلہ ہے۔“ اسجد کو اچھا نہیں لگا کہ بحث کا رخ اس کی طرف موڑا

رہی ہو، اس معاش کی دوڑ میں ہم وقت سے پہلے تھک جائیں گے اور کچھ بھی نہیں بنا سکیں گے۔“ اسجد رات کھانے کے بعد گیلری کی ریلنگ پر بازو ٹکائے اسے اپنے خیال سے آگاہ کر رہا تھا، وہ چونک گئی بھلا اسجد کو اچانک یہ خیال کیوں آیا تھا۔

”اور کیا کر لیں گے آپ باہر جا کر؟“ وہ سیدھی ہوئی۔

”اپنا گھر بنانے کے لئے کمائی کروں گا، دن رات محنت کروں گا، یہاں تم اپنا اور بچوں کا خرچ چلانے کے لئے جاب تو کر رہی ہو، میں محنت کی کمائی سے تم لوگوں کے لئے محبت بناؤں گا، اپنا اور تمہارا گھر، یار رویہ میں نے اس گھر کو

اپنے دن رات دیئے، اپنا لڑکپن، اپنی جوانی دی، خون پسینے کی کمائی سے یہ گھر بنایا مگر آج مجھے لگتا ہے کہ اس گھر میں میرے ہی بیوی بچوں کے لئے جگہ تنگ پڑ رہی ہے، تم تو پہلے دن سے ہی کسی کو قبول نہیں تھی، وجہ تمہاری وہ محبت تھی جو تم نے مجھ سے کی، مگر اب مجھے یہ احساس اور بھی شدت سے ہونے لگا ہے، زونیر اور اسد کی شادی کے بعد جو

حالات ہیں ان حالات میں بھی نشانہ ہم دونوں ہی بنیں گے، یہ ہم دونوں ہی تھے جو بھابھی کے بچوں کی وجہ سے لڑنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لیتے تھے، مگر یہاں ہمارے بچوں کی وجہ سے مسئلے بڑھیں گے کیونکہ رویہ یہ تمہارے بچے ہیں، بھابھی کے بچوں کو امی اور بہنوں کا بہت پیار ملا، اسد کے بچے کو ابا کا بہت پیار مل رہا ہے اور میرے بچے شاید انہیں اس لئے قبول ہیں کہ بہر حال وہ میرے بھی بچے ہیں، ان سے کوئی رشتہ ہے، شاید بچوں کی وجہ سے میں یہ سب سوچنے پر مجبور ہوا ہوں۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا، رویہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

گیا تھا۔

رکتے ہوئے بولا۔

”بیٹا یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہم نے یہ بیٹھے بٹھائے باہر جانے کا خیال کیسے آگیا، یہ بھی دیکھ رہے ہیں، پیسہ کمانے کی لالچ نے تمہیں رشوتوں کی پیمان بنی بھلا دی ہے جو یہ تمہارے کان بھرتی ہے تم آ کر وہی سنا دیتے ہو، آنکھیں بند کر کے اسی پر ایمان لے آتے ہو۔“

ابو نے ایک بار پھر قہر بھری نظروں سے رویہ کو دیکھا وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی، وہ کمرے میں آیا تو اس کی گہری سیاہ آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ بہت دیر سے بیٹھی آنسو بہا رہی ہے، وہ اس کی بھیگی آنکھوں کو دیکھ کر مزید بے چین ہو گیا، رویہ نے جب اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا اور اس سے شادی کے لئے گھر والوں کے سامنے ڈٹ جانے کی کہانی سنائی تھی تو اسجد نے اپنے دل سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی اسے رونے نہیں دے گا، کبھی کوئی دکھ نہیں پہنچائے گا، وہ اتنی معصوم سادہ دل اور مخلص لڑکی تھی کہ اسجد کا جی چاہتا تھا اس کا دامن دینا جہاں کی خوشیوں سے بھر دے مگر کیا بے بسی ہی بے بسی تھی، اس کا بس چلنا تو وہ اس کی آنکھوں میں کبھی پانی بھرنے نہ دیتا، کبھی اسے اداس نہ ہونے دیتا، مگر وہ دو پانوں کی چلی میں پستے دانوں کی طرح پس رہا تھا، خود کو دو کشتیوں کا سوار سمجھ رہا تھا، ایک طرف ماں باپ تھے اور دوسری طرف رویہ، جو اسے زندگی سے بھی پیاری تھی، روتے ہوئے وہ آنسو صاف کرتی سیدھی دل میں اترتی جا رہی تھی، اس کی محبت کو نبھاتے نبھاتے وہ جیسے ہر روز ایک نئی آزمائش سے گزرتی تھی اور ابھی بھی یقیناً وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی، اسجد خاموشی سے اس کے پاس جا بیٹھا۔

”آپ صحیح کہتے ہیں اسجد، میرا اچھا ہونا

”ہاں تو بیٹھے بٹھائے تمہیں جگہ تنگ لگنے لگی، بھئی سچ تو یہ ہے کہ تمہاری بیوی پہلے دن سے ہم لوگوں میں گھل مل کر رہنا ہی نہیں چاہتی تھی، اب بچوں کو بھی یہی سکھا رہی ہے۔“ امی کے بولنے پر اس نے تڑپ کر اسجد کی سمت دیکھا، اگر وہ سب کے ساتھ گھل مل کر رہنا نہیں چاہتی تھی تو کیوں شادی کے شروع دنوں میں بھابھی کے بچے کو اپنی ناخوشی کے باوجود ساتھ لے کر گھومتی رہی، اگر وہ گھل مل کر رہنا نہیں چاہتی تھی تو کیوں سب کی پسند کے کپڑوں کے لئے اپنی جیب سے رقم خرچ کرتی رہی، اگر وہ ایسی تھی تو اسجد کی شادی کے لئے ساری بری دے دی، اپنی انگلی دے دی اور تو اور اچھی خاصی نقد رقم ویسے کے کھانے کی مد میں اسجد کے ہاتھ میں تھما دی تاکہ کوئی مسئلہ نہ ہو، اسجد کی مہندی کا سارا انتظام بھی خوشی خوشی اپنی جیب سے کرتی رہی، شادی کے پہلے دن سے لے کر اب تک وہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھی کہ سب خوش رہیں، جاب دوبارہ کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس کی وجہ سے اسجد کو کوئی مسئلہ نہ ہو، گھر والوں کے اخراجات کے لئے وہ پریشان نہ ہو، یہی سوچ کر اس نے اپنا اور بچوں کا تمام خرچ خود اٹھا لیا تھا اور اس پر کہا جا رہا تھا کہ وہ ان لوگوں میں گھل مل کر نہیں رہی تھی، رویہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے کیا ہلڑکی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے؟ یا صرف اسے اسجد سے محبت کی سزا دی جا رہی تھی۔

”میں خود اپنی مرضی سے باہر جانا چاہ رہا ہوں ابو، گھر کے حالات بدل جائیں گے، پھر اب میرے اپنے بھی بچے ہیں، ان کی تعلیم، اخراجات، ان کا مستقبل سب مجھے ہی سوچنا ہے۔“ اسجد رویہ کے خاموش آنسوؤں کو نظر میں

واقعہ جیسے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں دے رہا، میں کمرے میں آپ کے سامنے تو آنسو بہا سکتی ہوں ناں۔“ وہ مسکاتے ہوئے لہجہ بھر کو سر کو اٹھا کر اس سے اجازت طلب کرنے لگی اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خاموشی سے رویہ کا سراپے شانے پر نکا دیا، وہ اس کی شرٹ بھگونی رہی، اجد نے بھی اسے رونے دیا۔

☆☆☆

وہ جب گھر پہنچا تو ساڑھے چار بج رہے تھے، عموماً وہ اس وقت گھر نہیں آتا تھا، آج پاسپورٹ کے سلسلے میں کچھ کام تھا، اسی لئے وہ جلدی گھر آ گیا، اندر سے آبی آوازوں نے وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔

”پریمی نکھی ہے تو ہوا کرے، جب میں نے تم سے کہہ دیا ہو کہ تم اس لڑکی کے پاس نہیں جاؤ گی، نہ بات کرو گی نہ اس کے کمرے میں جا کر بیٹھا کرو گی، ایسا نہ ہو وہ تمہیں بھی اپنے رنگ میں رنگ دے، سب کے ساتھ بیٹھا کرو، رات کا کھانا بھی تم بنایا کرو، جہاں جی چاہے آؤ جاؤ مگر خردار میں تمہیں اجد کی بیوی سے بات کرتے نہ دیکھوں۔“ ابو کی واضح آواز آرہی تھی۔

”سچ کہہ رہے ہیں ابو بڑی نکھی مینی ہے رویہ، جھوٹی جی باتیں اجد کو سنا کر روز اسے گھر والوں کے خلاف بھڑکاتی ہے، بھئی اونچے گھر کی ہوتی ہے تو ہوا کرے۔“ بھابی کی آواز بھی ساعت میں پڑی، وہ سب یقیناً زونیرہ کو سمجھا رہے تھے، وہ نئی بھوٹی، ابو کی برادری کی تھی اور بچ میرن کے ذریعے گھر میں آئی تھی، اگرچہ اس کی مرضی و پسند کا بھی بہت عمل دخل تھا لیکن اس رشتے پر ابو بہت خوش تھے۔

”دیکھنے میں تو بہت معصوم سی لگتی ہے۔“ زونیرہ کی آواز میں کچھ تو ایسا تھا جیسے کوئی اپنی

اعیت بنانے کے لئے کسی دوسرے کا طنز یہ انداز میں ذکر کرتا ہے، اجد کھنکراتا ہوا آگے اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا، سب کے سب خاموش ہو گئے، وہ ایک نظر سب پر ڈالتا کمرے میں داخل ہو گیا، دونوں بچے کھیل رہے تھے، رویہ عصر کی نماز ادا کر رہی تھی، سفید دوپٹے کے بالے میں اس کا سادہ سا چہرہ اجد کو بہت کمزور اور اترا اترا لگا تھا، وہ جسمانی طور پر بے حد کمزور ہو گئی تھی، اوپر تلے دو بچوں کی پیدائش، جاب، گھر کے کام کاج اور اوپر سے یہ ذہنی تناؤ، وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتا رہا، اس کی رنگت بھی جھل سی گئی تھی، دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے رویہ نے دیکھا، وہ اسے ذرا ہٹ کر صوفے پر بیٹھا بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں اجد؟“ وہ جائے نماز پر اسی کے پاس آ بیٹھی۔
”ہوں، کچھ نہیں، سوچ رہا ہوں کہ اتنا کماؤں گا باہر جا کر تمہیں خوب پیسہ سمجھوں گا، کھا کھا کر مونی ہو جانا، میں واپس آ کر اپنی نازک سی رویہ کو ڈھونڈوں گا، مگر مجھے کہیں نہیں ملے گی۔“ وہ اسے ہشانے کے لئے شرارت سے بولا، وہ اس کے کندھے پر مکا مار کر ہنس دی۔

”توبہ ہے اجد، حد کرتے ہیں آپ بھی، اور یہ آج آپ جلدی کیسے آ گئے، خیر تو ہے۔“ وہ گھڑی کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

”ہاں پاسپورٹ ملنے کا تاخیر تھا، وہی لینے جا رہا ہوں، اسی لئے جلدی آ گیا، میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں، تم اور بچے تیار رہنا رات کا کھانا باہر کھا کر آئیں گے۔“ وہ اسے تاکید کرتا دروازے سے کچھ ضروری کاغذ لے کر نکل گیا، کچھ دیر پہلے کی باتوں نے اور رویہ کی خاموشی اور صبر نے دل میں مزید محنت اور اس کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ

بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

اجد کے جانے کے بعد وہ بہت مضبوط ہو گئی، وہ جاتے ہوئے اسے بہت کچھ سمجھا کر گیا تھا۔

”تمہیں بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا رویہ، میری غیر موجودگی میں تمہارے لئے مشکلات اور بھی بڑھ جائیں گی، مگر تم ہمت نہ ہارنا اور پلیز اپنی امی کے گھر میں کوئی بات نہ بتانا، یار میرا بھرم قائم رہنے دینا، بس تھوڑی سی ہمت اور، میں یہ جو اپنے اور تمہارے درمیان دوری لے کر آ رہا ہوں تو یہ بھی تمہارے اور بچوں کے اچھے مستقبل کے لئے، تم جاب تو کر رہی ہو ایسے میں میں آسانی سے گھر کے لئے جوڑ سکوں گا، پھر جب میں واپس آؤں گا تو ہماری اپنی جنت ہوگی چھوٹی سی خوشیوں سے بھری پرسکون جنت اور وہاں رویہ اجد کے لیوں پر ہمیشہ مسکراہٹ رہے گی، یہ وعدہ ہے میرا۔“ اور اسے وعدے لے کر وہ چلا گیا، رویہ کے لئے اس بھرے پڑے گھر میں تنہائی اور بھی بڑھنے لگی، زندگی اور بھی مشکل ہونے والی تھی۔

☆☆☆

دونوں بچے بھی اس کے ساتھ اسکول جانے لگے تھے، واپسی پر کاموں کا انبار انتظار کر رہا ہوتا تھا، سبھی جو وہ کپڑے دھو کر تاروں پر پھیلا کر اسکول جاتی تو واپسی پر وہ پورے چھت پر بکھرے گرے ہوتے انہی دنوں ساس اور سسر نے اسے الگ کرنے کی ہم چلا دی۔

”بھئی رویہ تو کوئی کام کرتی ہی نہیں، صبح صبح میک اپ کر کے نکل جاتی ہے اسکول کے بہانے ساری صفائی ستھرائی تو بڑی بہو اور زونیرہ ہی کرتی ہیں، کپڑے دھونا، استری کرنا سب انہی

کے ذمہ ہے، وہ بس اپنے ہی کام نبٹا لے تو بہت ہے۔“ ساس نے سب کے سامنے کہا۔

”مگر میں الگ کیسے ہو سکتی ہوں امی، ایک کمرہ ہے میرے پاس، میں چولہا اور برتن وغیرہ کہاں رکھوں گی؟“ وہ روہاسی ہوئی، یہ نیا امتحان تھا حالانکہ اجد گھر کے اخراجات کی مد میں پہلے بھی ماں کو رقم دیتا تھا اور اب بھی ہر ماہ باقاعدگی سے بھیج رہا تھا، ہاں رویہ اپنی اور بچوں کی ضروریات کے لئے ہی ملازمت کر رہی تھی۔

”بھئی یہ تمہارا مسئلہ ہے، کمرے کے اندر ہی رکھ لو چولہا ویسے بھی تم کون سا سارا دن گھر ہوتی ہو؟ آدھا دن تو باہر نکل جاتا ہے اور بچے کون سا ابھی روٹی سالن کھانے کی عمر کے ہیں ایک انڈہ بھی بھون لوگی تو بگڑا رہا ہو جائے گا مگر بی بی مجھے گھر میں لڑائی جھگڑا نہیں کروانا، دوسری دونوں بہو ویں بھی انسان ہیں، وہ سارا دن کلوہو کے تیل کی طرح لگی رہتی ہیں اور تم بن ٹھن کر چلی جاتی ہو۔“ ساس کے الفاظ دل میں کھب سے گئے، کلوہو کے تیل کی طرح تو وہ لگی ہوئی تھی، نہ ٹی وی پر ڈرامے دیکھنے کا وقت ملتا تھا، نہ صبح دیر تک سو سکتی تھی، نہ فروٹ کھانے اور دھوپ سینکنے کا وقت ملتا تھا نہ گرمیوں کی دوپھروں میں اسے سی کولر کی ٹھنڈک میں قبولہ کرنے کا وقت تھا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ بن ٹھن کر چلی جاتی تھی، ان کی نظر میں اس کی زندگی بہت آسان تھی، وہ اپنی عادت اور فطرت کے مطابق خاموش ہی رہی۔

”جی..... میں بیچ کر لوں گی۔“ وہ سر جھکائے چلی گئی۔

”یہ محبت کی آزمائش ہے اور اجد مجھے اس آزمائش میں پورا اترنے کے لئے تیار چھوڑ کر خود پردیس جا بیٹھا ہے۔“

☆☆☆

اسجد کے جانے کے بعد زندگی واقعی بہت مشکل ہو گئی تھی، گھر کے اور بچوں کے اخراجات میں ساری تنخواہ نکل جاتی تھی، اس نے اسجد کو الگ ہونے کے متعلق بھی بتا دیا تھا، وہ سن کر واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

”تم کمرے میں چولہا رکھ کر کیسے کوئنگ کرو گی رویہ، میں امی سے بات کرتا ہوں، ٹھیک ہے تمہیں الگ کرنا چاہتے ہیں تو کر دیں مگر یوں تو ہرگز نہیں، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، کوئی حادثہ ہو گیا تو؟“ اور اس نے اسجد کی بات کاٹ دی۔

”وہ لوگ بھی تو سمجھدار ہیں، اس بات کو سمجھتے ہیں، مگر انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ میرا مسئلہ ہے اور بقول امی کے میں آدھا دن تو گھر سے باہر ہوتی ہوں، آپ پریشان نہ ہوں اسجد، میں سنبھال لوں گی، مجھے اب ہر طرح کے حالات کو سمجھ کرنا آ گیا ہے۔“ اس نے اسے تسلی دی تھی، مگر اسجد نے اسی رات امی سے اس سلسلے میں بات کی تھی، انہوں نے پھر عدالت لگا لی۔

”تو عادت گئی نہیں تمہاری چغلیاں لگانے کی اور کان بھرنے کی۔“ اسے ایک بار پھر کٹھنرے میں کھڑا کیا گیا تھا، پہلے دل کا غبار نکالنے اور سہارا دینے کے لئے اسجد موجود ہوتا تھا لیکن اس بار وہ تنہا تھی، بالکل اکیلی اور وہ سب کھڑے تھے نظر میں جمائے۔

”میں نے کوئی چغلی نہیں لگائی۔“ وہ بے حد پست آواز میں بولی تھی، بڑی بھابھی اور زونیرا کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ ابھری تھی، وہ اپنی تذلیل بھی خاموشی سے سہہ رہی تھی۔

”اچھا، اسی لئے اسجد بھرا بیٹھا ہے وہاں، اس کے خیال میں بڑا ظلم ہو رہا ہے اس کی بیوی بچوں پر، رویہ بی بی بات بات پر جھوٹ بولنے کی عادت ہے تمہیں، پتہ نہیں تم چاہتی کیا ہو،

بڑی خاموشی سے فساد ڈلوادیتی ہو۔“ بڑی آپا کی بات پر وہ ضبط کرتی وہاں سے چلی گئی، آنسو ایک تو اتر سے بہنے لگے اس نے دونوں بچوں کو گود میں لے کر سارا غبار آنسوؤں کی صورت بہہ جانے دیا، عجیب زندگی تھی، وہ اپنے میاں سے بھی کوئی بات نہیں کر سکتی تھی، اس گھر میں ہر بار اسے ہی مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا اور ہر بار دو چار آنسو بہا کر پھر سب کو راضی کرنے کے چکر میں صبر کا دامن تھام لیتی۔

☆☆☆

اسجد نے پہلے پلاٹ خریدا اور پھر مکان کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا، مکان کی ہر شے رویہ کی پسند سے خریدی جا رہی تھی، وہ سارے غم اور شکوے بھلا کر اپنے مکان کی خوشی میں خوش تھی، انہی دنوں اسد اور زونیرا کے جھگڑے شروع ہو گئے، وجہ شاید احساس کمتری اور حسد ہی تھا، زونیرا سے کسی طور رویہ کا مکان برداشت نہ ہو رہا تھا، اگرچہ وہ سر کی لاڈلی، بہوشی مگر اس کے باوجود وہ ہر دوسرے دن اسد سے جھگڑا کرنے لگی تھی، وہ خوب گالم گلوچ کرتی، غیر اخلاقی زبان استعمال کرتی تب رویہ کمرے کا دروازہ بند کر کے آیت الکرسی پڑھنے لگتی، اس وقت اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ حسد ایک دن اس کی زندگی میں آگ لگانے کی کوشش کرے گا۔

☆☆☆

اسجد واپس آ گیا، زندگی کے مشکل دن ختم ہونے کو تھے، اس غیر حاضری میں رویہ کے لئے ہر دن اذیت کا دن تھا، اس نے کمرے میں چولہا رکھ کر کھانا بھی بنایا تھا، اسکول سے واپسی پر پینے کا پانی فلٹریشن پلانٹ سے بھر کر بوتلیں اور گلاب پھر کر اپنے کمرے میں لائی تھی، سودا سلف کے لئے خود بازار گئی تھی، گرمیوں میں بند کمرے میں جس

تفصیلی جائزہ لیا اور جیب میں ڈال لی۔
 ”جی، اسی لئے میں نے زونیرہ سے ذکر
 نہیں کیا ڈائری والی بات کا، مناسب نہیں لگتا،
 ویسے بھی میں نے تو سرسری سی نگاہ ڈالی ڈائری پر
 اور جیسے ہی اندازہ ہوا کہ یہ اس کی پرسنل ڈائری
 ہے واپس رکھ دی مگر ایسے وہ نہ جانے کیا سمجھ لیتی،
 بہر حال اس کی ذاتی چیز تھی۔“ اس نے جو کیا
 ٹھیک کیا۔

”ہاں صحیح کہہ رہی ہو، ابھی کچھ دن پہلے
 سویرا (اججد کی چھوٹی بہن) کا فون آیا تھا، وہ بھی
 بتا رہی تھی کہ زونیرہ اور اسد کے بہت جھگڑے ہو
 رہے ہیں، وجہ پوچھ رہی تھی میں نے لاعلمی کا
 اظہار کر دیا، خیر رویہ تم بھی دور ہی رہا کرو ان
 کے معاملات سے یہاں اس گھر میں بات کا جھگڑو
 اور لفظ کی کہانی بنتی ہے، کوئی ثبوت یا صفائی مانگے
 بغیر کئی بار تم یہ سب بھگت چکی ہو، بس کچھ دن اور،
 پھر ہم اپنے گھر چلے جائیں گے، کوئی مسئلہ نہیں ہو
 گا۔“ وہ اسے سمجھانے لگا۔

”مطلب؟“ اس نے نا سنجی سے اججد کی
 سمت دیکھا۔

”مطلب یہ کہ اسد اور زونیرہ کے جھگڑوں
 کی کوئی تو وجہ ہوگی اور جس دن وہ وجہ سامنے آ
 گئی، بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا ہم لوگوں کے
 لئے۔“

”ہوں، سمجھ سکتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر بچوں کی
 پھیلائی چیزیں سمیٹنے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ لوگ اپنے مکان میں شفٹ ہو گئے،
 صاف ستھرا جدید انداز میں بنا گھر اس کی جنت
 تھا، اس نے جاب چھوڑ دی، اب وہ سارا وقت
 گھر اور بچوں کو دینا چاہتی تھی، اججد اور رویہ نے
 بڑی محنت اور چاہ سے گھر کو سجایا تھا، وہ اسے

زودہ ماحول میں ساری ساری رات بچوں کو نپکی
 جلاتے جاگتی تھی، کپڑے دھوئے اور برتن دھوئے
 کے لئے سلائی کے پانی کا انتظار کیا تھا کہ موٹر چلا
 کر پانی استعمال کرنے کی اسے اجازت نہیں تھی،
 بچوں کے ذرا سے کمرے سے نکلنے پر سوباتل سی
 تھیں، اس نے ایک دن گھبرا کر زونیرہ سے کہہ
 بھی دیا۔

”زونیرہ تم جب اپنے کمرے سے نکلتی ہو تو
 پلینز کمرے کا دروازہ بند کر دیا کرو، بچے چھوٹے
 ہیں انہیں تو پتہ نہیں کبھی کوئی چیز اٹھا کر نقصان کر
 دیا تو۔“ اور اس کی اس بات پر زونیرہ نے
 مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا، پھر اکثر
 ہی وہ اپنے کمرے سے نکلتے وقت کمرہ لاک کر
 دیتی تھی۔

”آج میں نے زونیرہ سے کہا کہ کمرہ لاک
 کر دیا کرو، کل غلطی سے یہ آپ کا چھوٹو اس کی
 ڈائری، اٹھا لایا، مجھے جیسے ہی اندازہ ہوا کہ یہ کسی
 کی پرسنل ڈائری ہے میں نے واپس رکھ دی،
 مجھے تو ویسے بھی بہت ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی جھگڑا
 نہ ہو۔“ اس نے اججد کو بھی بتایا۔

”اچھا کیا، بچہ ہے اور بچے کو کیا پتہ، بڑوں
 کو خود احتیاط کرنی چاہیے۔“ اججد جو گھر کے لئے
 بجلی کے سامان کی لسٹ بنا رہا تھا اس نے بھی سر
 اٹھا کر تائید کی۔

”ہاں ویسے تو منع کرنے کے باوجود بعض
 اوقات بڑی بھابھی کے بچے آ جاتے ہیں میرے
 کمرے میں، بعض اوقات زونیرہ کا حماد بھی آ جاتا
 ہے، ابھی چند دن پہلے حماد نے آتے ہی میرا
 موبائل اٹھا کر زمین پر دے مارا، مگر مجھے اچھا
 نہیں لگا شکایت کرنا۔“ اس نے وضاحت دی۔

”بچے ہیں یار، بچے سب کے سانچے
 ہوتے ہیں، نا سمجھ ہوتے ہیں۔“ اججد نے لسٹ کا

نادر ن ایریاز کی سیر کے لئے بھی لے کر گیا تھا۔
 ”لورویجہ احمد، تمہاری محبت اور وفا کا چھوٹا
 سا صلہ۔“ اس کی ٹٹھی میں گھر کی چابی تھامتے
 ہوئے احمد نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اس کے
 سارے نکلے شکوے دھلنے لگے، ساری تھکن اتر
 گئی۔
 ”ہم لوگ سب کی دعوت رکھ لیں گے،
 سب کو راضی اور خوش رہنا چاہیے۔“ وہ اپنی پرانی
 جون میں بولی تھی، احمد مسکرا دیا۔
 ”اف..... یہ تمہارے اندر کی اچھی لڑکی۔“
 ”میں ایسی ہی ہوں احمد، میں اپنے گھر کی
 خوشی میں سب کی دعوت کروں گی اور آپ مجھے
 منع نہیں کریں گے، میں سب کے دل میں اپنی
 محبت تو نہیں جگا سکتی مگر اپنے دل کو سب کی خوشی
 اور محبت سے صاف اور روشن ضرور رکھ سکتی ہوں،
 مجھے کیونہ اور نفرت دل میں رکھنا ہی نہیں، دل اللہ کا
 گھر ہوتا ہے اور اللہ کے گھر کو گندہ نہیں کرتے۔“
 وہ معصومیت سے بولی، احمد کو اس پر ڈھیروں پیار
 آیا تھا۔

☆☆☆

دعوت سے اگلے روز ہی گھر سے کال آئی
 تھی، روپیجہ جو سب کی دعوت کر کے بہت خوش
 تھی، سب کو ایک ساتھ ہنسا بولتا دیکھ کر مطمئن تھی
 چونک گئی۔

”خیریت ہے احمد؟“

”نہیں روپیجہ خیریت نہیں ہے، وہ تم نے
 ایک دفعہ مجھ سے ذکر کیا تھا ناں کہ تم نے غلطی
 سے زونیرا کی ڈائری پڑھ لی تھی۔“

”ہاں بتایا تھا۔“

”یار وہ بات میں نے سویرا سے کر دی اور
 جان بوجھ کر نہیں کی تھی، سویرا آنا چاہ رہی تھی
 رہنے کے لئے مگر بچوں کی شرارتوں اور جھگڑوں

کی وجہ سے کتر رہی تھی، اس پر اسد اور زونیرا
 کے جھگڑوں کی بھینک بھی اس تک پہنچ چکی تھی تو
 میں نے ذکر کر دیا کہ بچے ہیں، ان کی شرارتوں
 اور نادانیاں تو عمر کے ساتھ ہی ختم ہوں گی اور جب
 ہی میں نے یہ ذکر کر دیا مگر مجھے نہیں یہ تھا کہ
 سویرا یہ بات امی اور اسد تک پہنچا دے گی، اس
 نے کہا کہ رویجہ نے جان بوجھ کر زونیرا کی ڈائری
 پڑھی ہے اور زونیرا پر الزام لگایا ہے کہ وہ اچھے
 کردار کی نہیں ہے، سویرا نے سچ میں ایسا کیا یا
 بات آگے پہنچتے پہنچتے ایسی ہو گئی، یہ تو اللہ کو ہی علم
 ہے مگر رویجہ وہاں گھر میں خوب جھگڑا ہو رہا ہے،
 زونیرا نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے اسد اسے
 طلاق کی دھمکی دے رہا ہے، سارا الزام تم پر لگ
 رہا ہے رویجہ، ان کا گھر برباد ہو رہا ہے۔“ احمد
 واقعی پریشان تھا۔

”نہیں احمد میں نے کبھی زونیرا پر الزام
 نہیں لگایا اور اگر سویرا نے ایسا کچھ کہا ہے تو یقیناً
 کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی، وہ دونوں باشعور ہیں،
 عقل مند ہیں، یوں سنی سنائی بات پر جھگڑا کیوں
 کریں گے۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”لیکن اب تو جھگڑا ہو گیا ناں اور ابو کہہ
 رہے ہیں کہ میں تمہیں لے کر وہاں آؤں تاکہ
 دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو۔“

”لیکن احمد میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں
 کیا کروں گی جا کر مجھے تو وہ لوگ تب بلا میں تا
 جب میں نے اسد بھائی سے، ابو سے، امی سے یا
 خود زونیرہ سے کہا ہو کہ وہ ایسی ہے، مجھے کیا مل
 جائے گا ایسا کہہ کر؟“ وہ رو دینے کو تھی، احمد کو
 اس پر ترس آنے لگا۔

”ابھی ہم لوگ چلتے ہیں، شاید غلطی میری
 ہے، میں نے جو سویرا سے بات کی اس نے بڑھا
 چڑھا کر بیان کر دی، الزام تم پر لگ گیا، اب ہم

شکوہ کتنا نظروں سے اجد کی سمت دیکھا، وہ نظریں چرا گیا۔

”اگر کسی کا راز سنجال کر امانت سمجھ کر واپس رکھ دیا جائے تو یہ گناہ ہے اور اگر گناہ ہے تو میں معافی مانگتی ہوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔“ وہ واقعی ہاتھ جوڑے معافی مانگ رہی تھی۔

”صرف معافی؟ ایسی باتوں پر قتل ہو جاتے ہیں رویہ، بات میرے کردار کی ہے اور اس ایک بات کو لے کر اسد نے کئی مرتبہ مجھ سے جھگڑا کیا، میرے کردار پر شک کیا، مجھے مارا اور طلاق کی دھمکی دی، میرا گھر برباد ہو رہا ہے تو صرف تمہاری وجہ سے ہم نے بڑھا چڑھا کر اجد کو بتایا، اجد نے اپنی بہنوں سے ذکر کیا اور یوں تم نے آگ لگا دی، میرے دل میں گئی ہے آگ اتنی آسانی سے نہیں بجھے گی۔“ زونیرا پاگلوں کی طرح بول رہی تھی، رویہ کو اس پر ترس آنے لگا۔

”دیکھو زونیرا ابھی بھی کسی تیسرے کی وجہ سے اپنا گھر برباد نہیں کرنا چاہیے، پھر بھی اگر لاشعوری طور پر میری کسی غلطی کی وجہ سے تمہارا دل دکھا ہے تو میں ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر تم دونوں میاں پیوی سے معافی مانگتی ہوں۔“

”رویہ صحیح کہہ رہی ہے، میں بھی معافی مانگتا ہوں تم میری بھابھی ہو، ہمارے گھر کی عزت ہو، اگر نادانستگی میں کوئی غلطی ہوئی تو ہم معافی مانگتے ہیں، تم لوگ اپنا گھر برباد نہ کرو۔“ اجد نے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے معافی مانگی تھی۔

”یہ آج جو کچھ بھی ہوا، سب تمہاری وجہ سے ہوا، تم نے جو بھی الزام لگائے وہ جھوٹ پر مبنی تھے، اسی لئے آج تک کوئی جج سامنے نہیں آیا۔“ اجد کے ابو نے وہی قہر بھری نظریں رویہ پر

لوگ جا کر معافی مانگ لیتے ہیں۔“

”معافی! کس چیز کی معافی؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اسد اور زونیرا اس سے رشتے اور عمر میں چھوٹے تھے۔

”میرے لئے اور سب کو خوش کرنے کے لئے یہ سب کرنا ضروری ہے رویہ، بے شک بات ایک غلط فہمی سے بڑھی ہے مگر بہر حال بڑھ چکی ہے، تم تیار ہو جاؤ، ہمیں کوئی فالتو بات نہیں کرنی پس جا کر اسد اور زونیرہ سے معافی مانگنی ہے۔“ اجد نے اسے تیار ہونے کا کہہ کر کال ملائی تھی۔

”ہم لوگ آرہے ہیں، رویہ معافی مانگنے کے لئے تیار ہے۔“ وہ شاید اجد بھائی سے بات کر رہا تھا، رویہ کے دل میں دھڑام سے کچھ ٹوٹا تھا، وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی بے بنیاد الزام خود اپنے سر پر لے کر معافی مانگنے جا رہی تھی، اپنی اتنا اور عزت نفس کو محض ایک محبت کی خاطر خود اپنے ہی پاؤں سے چل کر دوسروں کے سامنے اپنی ذات کا تماشہ بنانے جا رہی تھی محض ان سب کی اتنا کی تسکین کے لئے۔

☆☆☆

محض معافی مانگنے پر وہ لوگ خوش نہیں تھے، زونیرہ نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا، وہ ایک نفسیاتی مریضہ لگ رہی تھی۔

اسد نے باقاعدہ ایک عدالت لگا رکھی تھی، رویہ کو کسی مجرم کی طرح کنہرے میں کھڑا کر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

کب پڑھی ڈائری؟ کہاں پڑھی؟ اجد کو کیا بڑھا چڑھا کر بتایا؟ زونیرا کی بابت الزام کیوں لگایا؟ وہ ہکا بکا سب کی شکلیں دھکتی رہی۔

”مجھے ایسا کیوں لگا رہا ہے جیسے ہم معافی مانگتے نہیں بلکہ پیشی جھگڑتے آئے ہیں۔“ اس نے

اٹھائی تھیں۔

وہ گاڑی سے پشت ٹکائے کھڑی تھی، آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں، اسجد نے جان بوجھ کر ان نظروں سے نظریں چرائی تھیں، اس کی انا کے قتل میں وہ بھی برابر کا شریک تھا۔

”تم ٹھیک ہو روید؟“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس نے اس کے زرد پڑتے چہرے کی سمت دیکھا۔

☆☆☆

شک تو اسے کئی دنوں سے تھا مگر یہ خوشی آنے سے پہلے بچھڑ جائے گی، اندازہ نہیں تھا، وہ امی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس آئی تھی اس کا مس کیرج ہو گیا تھا۔

”بہت زیادہ ٹینشن لینے سے ہوا ایسا، ابھی زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے اور اتنی ٹینشن لے لی، اس نے کیوں روید تم تو بڑی لکھی ہو، تمہیں پہلے ہی آنا چاہیے تھا میرے پاس؟“ ڈاکٹر زارا نے ہنسی سے کہا، وہ سر جھکائے بیٹھی رہی، دل خون کے آنسو رو رہا تھا، ایک محبت کو نبھاتے نبھاتے آج وہ اپنا ہی نقصان کر بیٹھی تھی۔

”جب دوسرا بیٹا پیدا ہوا تھا تو بہت شوق تھا اسے بیٹی کا، آخر بات کیا تھی، کون سی پریشانی ہے روید؟“ امی نے بھی اس کے اترے چہرے کی سمت دیکھا۔

”نہیں..... کچھ نہیں۔“ بیٹگی پکوں کو جھپکتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا۔

”اس کا خوب خیال رکھیے گا آئی، خون کی بھی بہت کمی ہے اور یہ اس نقصان کی وجہ سے مزید ڈپریشن میں جاسکتی ہے، آپ سے کچھ دن اپنے پاس ہی رہیں، بے شک یہ اس خوشخبری کے لئے خود بھی شیور نہیں تھی مگر جو نقصان ہو گیا، اس سے تو باخبر ہے، سو پلیز آئی اس کا خیال رکھیے گا؟“ ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں لکھ کر دیں اور امی کو

”کب سنا آپ نے میرے منہ سے کوئی الزام، آپ کوئی ثبوت لا سکتے ہیں اپنی اس بات کا یہ سارا جھگڑا میری وجہ سے ہے۔“ اس کے لبوں تک آیا جملہ محض اسجد کی محبت میں زبان سے نہ نکل سکا تھا۔

”اور زونیرا بیٹی تم فکر نہ کرو، میں خود تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہیں کھلا بھی سکتا ہوں اور تمہارا دفاع بھی کر سکتا ہوں، دیکھ لو میں نے وعدے کے مطابق اس سے سب کے سامنے معافی منگوا لی۔“ ابو نے زونیرا کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دی تھی، روید کے سامنے سب ہولے بننے لگے، آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا، من من کے ہوتے قدموں کو کھینچتی وہ باہر کی طرف بڑھنے لگی، آخری منظر جو آنکھوں نے دیکھا، وہ اسجد کا زونیرا کے سر پر دھرا ہاتھ تھا، آج اس محبت نے اس کی عزت نفس کو بری طرح مجروح کیا تھا، وہ بچی نہیں تھی، سارے کھیل کو اچھی طرح سمجھ گئی، حسد اور جلن کی وجہ سے جو نفرت زونیرا کے دل میں تھی، اسے نچا دکھانے کے لئے وہ آج اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی، اس گھر کے افراد جنہیں عزت دینا، جنہیں خوش رکھنا اس کے لئے بہت ضروری تھا، وہ اس گھر کی چوکھٹ سے نکلتے ہوئے وہ ساری عزت، سارا پیار اپنے پاؤں کی شوکر سے وہیں چھوڑ آئی، جب خلوص کے بدلے میں ذلت ملے، جب عزت کے بدلے میں بے عزتی ہو، جہاں انصاف کا ترازو پکڑنے والے ایک پلڑے پر دست شفقت رکھ دیں، تو دوسرا پلڑا ہلکا ہو کر اپنا اصل وزن بھی کھونے لگتا ہے، زندگی میں پہلی بار اسے نفرت محسوس ہوئی تھی۔

”روید..... کیا ہوا؟“ اسجد پیچھے ہی آیا تھا،

مجھے فون کر کے بلایا، بے ہوش پڑی تھی، میں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی، تین گھنٹے ہسپتال رہے ہم لوگ تو یہ خبر ملی کہ زیادہ ٹینشن کی وجہ سے یہ سب ہوا، تمہیں اطلاع دینے کے متعلق پوچھا تو کہنے لگی کہ تمہاری کوئی مینٹل ہے، تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔“ وہ جو کچھ سنارہی تھیں، اسجد کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اس روز جھڑا ہوا، روپیہ باہر گاڑی سے فیک لگائے کھڑی تھی، اسے بیمار لگی تھی، اس نے اسی وقت ڈاکٹر کو کیوں چیک نہ کروایا۔

”ادوہ خدایا۔“ وہ بالوں میں انگلیاں پھسائے خود کو ملامت کرنے لگا، دوسروں کا گھر بچانے کے چکر میں اس نے اپنی جان سے پیاری بیوی کو ایک بار پھر آندو دیئے تھے، ایک بار پھر اس کی عزت نفس مجروح کی تھی اور اٹھانے میں اپنا اتنا بڑا نقصان بھی کر ڈالا تھا، یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ کیا گزر رہی ہوگی روپیہ کے دل پر، اس روز جس طرح سب عدالت لگا کر بیٹھے تھے روپیہ سے وکیلوں کی طرح جرح کر رہے تھے وہ اپنی بیوی کے لئے کچھ بھی نہ بولا تھا محض اس لئے کہ اس کے بھائی کا گھر بار ہے۔

”مجھ سے بڑا بے وقوف اس پوری دنیا میں نہیں ہوگا کوئی۔“ میز کو ٹھوکر مارتا وہ آؤس سے تیزی سے باہر نکلتا تھا۔

☆☆☆

روپیہ جا چکی تھی، وہ فون کر رہا تھا وہ اس کا فون نہیں اٹھا رہی تھی، وہ بچوں کو بھی لے گئی تھی، اس نے آنٹی کو فون کیا تو انہوں نے تسلی دی اور کہا۔

”دو چار دن میں غصہ اتر جائے گا تو آ جائے گی، میری بیٹی دل کی بہت اچھی ہے، وہ زیادہ دیر کسی سے ناراض نہیں رہتی، بس دل ٹوٹا

تاکید کی تھی، ڈاکٹر سے واپسی پر امی سیدی اس کے ساتھ ہی آئی تھیں وہ پینکنگ کرنے لگی۔

”مجھے کچھ تو بتاؤ روپیہ؟ ٹھیک ہے عورت کی زندگی میں ایسا ہو جاتا ہے مگر کوئی وجہ بھی تو ہو؟ ماشاء اللہ سے پیار کرنے والا شوہر ہے، اپنا گھر ہے، دو پیارے بیٹے ہیں، کبھی تو ایک بیٹی کی جو شاید تم نے خود اپنی بے وقوفی سے ختم کر دی، کیا سوچتی رہی اتنا؟“ وہ ماں تھیں اس کا زور پڑتا چہرہ دیکھ کر خفگی سے بولیں۔

”گھر چل کر بتاؤں گی امی۔“

”تم نے اسجد کو بتایا؟“ امی کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”میری طبیعت کافی دنوں سے ٹھیک نہیں تھی میں سوچ رہی تھی کہ ایک دو دن تک ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی کہ یہ سب ہو گیا اور اس ٹینشن کی وجہ سے میں اسجد سے بھی بات نہ کر سکی، دو دن بس یونہی سرچکراتا رہا، کھانا پینا بھی چھوٹ گیا بی بی لو ہوا اور بس بے ہوش ہونے کو تھی جب آپ کی کال کر کے بلایا تھا۔“ وہ بیک کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔

”وہی تو پوچھ رہی ہوں میرا بچہ کہ کیا پریشانی تھی ایسی کون سی فکر تھی جو تیری اتنی بڑی خوشی کھا گئی۔“

”کہاناں امی گھر چل کر بتاتی ہوں، میں کچھ دن آپ کے ساتھ ہی رہوں گی۔“ اور اس کی اس بات پر ان کا ماتھا ٹکا تھا، وہ اسجد کو فون کرنے کی نیت سے باہر نکلی تھیں۔

”تم دونوں کا جھگڑا ہوا ہے کیا؟“

”نہیں آنٹی کیوں؟“

”کچھ تو ہوا ہے، آج صبح سے میں اس کے ساتھ ہسپتال میں تھی، روپیہ کا مس کیرج ہو گیا ہے اسجد، اسے خود بھی ابھی کفر نہیں تھا، وہ تو صبح

تھی تو رویہ بہر حال ان کی بڑی بہو تھی، عمر اور رشتے سے قابل احترام، انکل کو چاہیے تھا کہ وہ پہلے تم سے اور رویہ سے بھی اکیلے میں سارے معاملے کی چھان بین کرتے، غلط فہمی کہاں سے شروع ہوئی، بات کا رنگ کہاں بدلا، اس کی تہہ تک جاتے پھر سب کو اکٹھا کر کے یہ معافی والا کام کر کے، انہوں نے بیٹھے بٹھائے رویہ پر فرد جرم عائد کی اور سزا سن کر معافی بھی منگوائی اور سب کے سامنے ذیل بھی کیا اور تم..... تمہیں خدا نے اپنی بھابی کا محافظ نہیں بنایا، اس کا دفاع کرنے کے لئے وہاں تمہارے منصف والد صاحب اور باقی صاحب اقتدار ہمتیاں موجود تھیں، کم از کم تمہیں رویہ کا دفاع کرنا چاہیے تھا۔“ عاصم نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ شرمندگی سے سر جھکا گیا۔

”شاید مجھے بھی عادت ہو چکی تھی کہ رویہ کے ساتھ تو کیسا بھی سلوک کر لو وہ پھر بھی کسی سے ناراض نہیں ہوگی، شاید انجانے میں، میں خود ہی اس کا دل توڑنے کا سبب بنا۔“ وہ شرمندہ تھا۔

”اب فی الحال خاموش ہو جا، کل صبح خود جا کر معافی مانگ بھابی سے اور خدا کے لئے آئندہ اپنی فیملی کی عزت اور خوشی کا خیال مقدم رکھا، والد صاحب کی عزت ضرور کر، مگر ان کی عزت کرنے کے چکر میں اپنا بسا بسا گھر بھی خراب نہ کر بیٹھنا، کیونکہ وہ تجھ سے جو عزت چاہتے ہیں ناں وہ صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ تیری وہ نفسیاتی مریضہ بھابی بھی شامل ہوتی ہے، وہ بیوی جو تیرے ساتھ ہر دکھ سکھ میں محبت کرتی رہی تیرے رشتوں کو جوڑ کر رکھنے کی کوشش میں خود ہلکان ہوتی رہی، جو تیری محبت میں تیرے گھر کے ماحول میں خوشی سے رہنے لگی، کہیں اسے نہ کھودینا

ہے درد تو ہو گا بیٹا۔“ وہ شاید آنٹی کو سب کچھ بتا چکی تھی، ابجد نے فون بند کر دیا، بے بسی سی بے بسی تھی، وہی گھڑ والے جن کے سامنے وہ اسے مجرم بنا کر خود لے کر گیا تھا، معافی منگوائی تھیں، اب نفرت سی محسوس ہو رہی تھی ان سب سے، رویہ کی سادگی اور خوش اخلاقی کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا، اسے وہ دل یاد آنے لگا جب وہ اسد کے پینٹ شرٹ کی رقم کے لئے اس سے ابھی تھی، اس کی مہندی کے اختتام میں سارے خرچے خود کر رہی تھی، اسی اسد نے بغیر کسی ثبوت کے بغیر کسی بات کے خوب صلہ دیا تھا۔

”الو ہوں میں۔“ اس نے خود کو ملامت کرتے ہوئے عاصم کا نمبر ملایا تھا۔

☆☆☆

پورے دس دن ہو گئے تھے رویہ کو گئے، اس نے ساری بات عاصم سے کی تھی۔

”وہ تو سب کچھ خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی عاصم، یار پھر اس نے ایسا کیوں کیا، اس ساری ٹینشن کی وجہ سے جو نقصان ہوا، وہ اکیلی رویہ کا تو نہیں تھا، میرا بھی ہوا، وہ چلی کیوں گئی؟“

”برداشت کی ایک حد ہوتی ہے ابجد میرے دوست، پانی کی گھاگھر کو بھی بھرتے رہو تو وہ بہہ نکلتی ہے، انسان کا دل ہے، کچھ لوگ جھگڑا کر کے دوسروں پر غصہ کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں، جیسا تمہاری بھابی نے کیا، سب کی ہمدردیاں بھی یورگیں اور دل کا غبار بھی نکال دیا، اس وقت رویہ بھابی کے دل پر کیا گزر رہی تھی یہ کسی نے نہیں سوچا نہ کسی نے بعد میں تسلی کے یا ہمدردی کے دو بول بولے، یار مجھے تو انکل پراسوس ہو رہا ہے، اتنا عمر رسیدہ تجربہ کار شخص ایسا کیسے کر سکتا ہے، اگر اسد اور زونیر کو کوئی غلط فہمی

پار اور برانہ ماننا، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں عزت راس نہیں آتی، تیرے گھر والے انہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، بہت کر لی ان کی عزت اور بہت کروالی رویہ سے سب کی عزت، اب اپنی بیوی کو وہ عزت اور وہ مقام دے جو تیرا رب تجھ سے چاہتا ہے۔“ عاصم جو کچھ سمجھا رہا تھا سید حادل میں اتر رہا تھا، اسے رویہ کے پاس جانے کی جلدی تھی۔

☆☆☆

وہ بھی آنکھوں سے اسے دیکھتی اتنی کمزور اور مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی، اسجد کو دیکھتے ہی وہ اس سے جا لگی۔

”نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر۔“

”تو پھر چھوڑ کر کیوں آگئی، بچوں کو بھی لے آئی، میں کس حال میں تھا تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا، کال کر رہا تھا تو تم رسیو ہی نہیں کر رہی تھی۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

”بہت دل دکھا تھا اسجد، بہت رونا آ رہا تھا، مجھے اپنی گود کے اجڑنے کا اتنا دک نہیں تھا جتنا اس ذلت کا تھا جو سب کے سامنے ہوئی، اگر بات صرف معافی مانگنے کی ہوتی تو مجھے آپ کی محبت میں وہ بھی قبول تھی، معافی مانگنے سے کوئی چھوٹا نہیں ہو جاتا مگر اسجد وہ لوگ تو پہلے سے سوچے بیٹھے تھے کہ باقاعدہ عدالت لگا کر سوال کرنے میں مجھے مجرم ثابت کرنے کی کوئی کسر چھوڑی انہوں نے؟ وہ گناہ وہ جرم جو میں نے کیا ہی نہیں اور آپ کے ابو نے کہہ دیا کہ جو کچھ ہوا میری وجہ سے ہوا؟ کب دیکھا انہوں نے کب سنا اور کہہ دیا کہ میں جھوٹی ہوں، وہ مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہیں، آج تک..... آپ سے محبت کا، غیر برادری سے ہونے کا، یہ کوئی گناہ ہے؟“ وہ اس کے سینے سے لگی دل کا غبار نکالنے لگی، اسجد

نے بولنے دیا۔

”اب مجھ سمجھ آگئی ہے ناں کہ اس روز جو کچھ ہوا اس کی وجہ صرف وہ حد اور جتن ہے جو زونیرہ تم سے کرتی ہے، ابو کی نفرت اور باقی سب گھر والوں کا رویہ بھی پہلے دن سے واضح ہے، بس میں ان سب کو راضی کرنے کے چکر میں تھیں ناراض کر بیٹھا مگر تمہاری ناراضگی بہت مہنگی پڑ رہی ہے یار، عاصم سے بھی بہت ڈانٹ پڑی مجھے، اب چل رہی ہوں ناں گھر؟“ اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

”ہوں، ویسے بھی کل کی فلائٹ سے بھائی بھابھی آ رہے ہیں تو ان کے آنے سے پہلے تو مجھے اپنے گھر جانا ہی ہے، مجھے اپنے شوہر کی اور اپنے گھر کی عزت بہت پیاری ہے۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کچھ جتائے ہوئے بولی۔

”چلو پھر پیکنگ کر لو، میں باہر آئی کے پاس ہوں، بچے بھی بہت خوش ہیں کہ ہم گھر جا رہے ہیں۔“ وہ باہر کی طرف بڑھا۔

”میری ایک شرط ہے اسجد۔“ وہ اس کی طرف گھوی۔

”شرط؟“ اس کی سنجیدگی پر وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”میں آپ کے گھر والوں کے پاس اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک میرا دل نہیں مانے گا، آپ جانتے ہیں کہ میں دل میں نفرت اور کینہ نہیں رکھتی، مگر اب میرے دل میں ان سب کے لئے وہ عزت بھی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی، میں یہ بھی نہیں کہتی کہ میں وہاں بھی نہیں جاؤں گی، زندگی میں انسان کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے، بہت سی باتیں فراموش کر کے رشتے نبھانے پڑتے ہیں مگر اس وقت تک جب تک میرا دل نہ مانے۔“ وہ درخواست

محبت سے ہماری زندگی رویہ کی منتظر تھی۔

☆☆☆

کر رہی تھی۔
”اگر تم نہ بھی کہتی تاں رویہ تو یہ بات میں
تم سے پہلے کا سوچ بیٹھا تھا کہ جس گھر میں
تمہاری عزت نہیں تم وہاں نہیں جاؤ گی۔“ وہ اس
کے سامنے آ رکا۔

”میرا نام آپ کے نام سے جڑا ہے ابجد،
میں نے نکاح تائے میں اللہ اور اس کے رسول
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گواہ بنا کر آپ کی وفا اور
محبت کا وعدہ کیا ہے، آپ کی عزت کا خیال رکھنا
فرض ہے مجھ پر، بس ایک آپ کا نام ہے جو مجھے
محبت کی اس ڈور سے باندھے آج واپس لے کر
جارہا ہے۔“ وہ سر جھکائے اپنی محبت کا اعتراف
کر رہی تھی۔

”بس بہت رلا دیا تمہیں اب اور نہیں، بس
تم جلدی سے آ جاؤ، تمہارا گھر اور تمہارا دیوانہ
شدت سے تمہارا منتظر ہیں۔“ وہ اس کے چہرے
پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا تھا۔
”اور میں بھی تو منتظر تھی، اپنے شوہر کی
طرف سے محبت کے ساتھ ساتھ عزت اور مقام
بھی حق تھا میرا۔“ وہ بڑے مان سے اس کی
طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”رویہ ابجد، صرف ایک نام نہیں ہے پاگل
لڑکی بلکہ میری خوشی اور میری عزت ہے، میرے
گھر کا سکون اور میری اولاد کی جنت ہے، بس
مجھے قدر اس وقت آئی جب انہوں نے زخم لے،
خدا نے اسی لئے اس رشتے کو معاشرے کی اکائی
کہا ہے، کسی دوسرے کی خاطر اب ابجد علی ناں
تمہاری آنکھوں میں آنسو آنے دے گا نہ تمہاری
عزت نفس پر کوئی حرف، یہ وعدہ رہا۔“ اس نے
اس کا ہاتھ دبایا تھا، گھر تک واپسی کا سفر
مسکراہٹوں اور آنے والی زندگی کے خوبصورت
وعدوں کے ساتھ مکمل ہوا تھا، ایک نئی پرسکون اور

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء:

- ☆ اور وہی آخری کتاب.....
- ☆ غمزدگم.....
- ☆ دنیا گول ہے.....
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....
- ☆ چلتے ہو تو چین کو چلیے.....
- ☆ ہماری پھر اسافر.....
- ☆ خط انشاء میں کے.....
- ☆ اس سبق کے اک کو پڑھیں.....
- ☆ چاند گھر.....
- ☆ دل دہشی.....
- ☆ آپ سے کیا پڑا.....

ڈاکٹر مولوی عبد الحق

- ☆ تو انکار دو.....
- ☆ انتخاب کلام میر.....

ڈاکٹر سید عبداللہ

- ☆ عیث نثر.....
- ☆ عیث غزل.....
- ☆ عیث اقبال.....

لاہور اکیڈمی

چوک اور دو بانہ زار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797

سہ ماہی نور

مہینہ ماہ نمبر



”خدا کا نام لیں امی کچھ سوچ سمجھ کے بات منہ سے نکالا کریں۔“ تلملاتے ہوئے وہ خالدہ بیگم سے الجھ کر بولی۔

”اب ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟“

”یہ مجھے نہیں پتہ، ہاں انتظار ضرور پتہ ہے کہ یہ مسئلہ کشمیر نہیں ہے جو آج تک کسی حل ہی نہیں ہوا، یہ میرے اور بابا کا مسئلہ ہے، جو حل ہوگا اور اسے حل ہونا پڑے گا۔“ اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے خالدہ بیگم کو سخت نگاہوں سے دیکھا۔

”اچھا، ویسے بابا ایک بات تو ہے کہ تمہارے بابا اور تم دونوں ہی انڈیا اور پاکستان کی طرح اپنے موقف پہ ڈٹے ہو۔“

”اور آپ سفراتی تعلقات کو ٹھیک کرانے کے چکر میں مسئلہ کو اور الجھائے دے رہی ہیں۔“ وہ اس وقت سخت الجھن کا شکار تھی،

صبح سے ہی گھر میں سرد جنگ جاری تھی، احسان صاحب ایک جانب اپنی بات پر بضد تھے، تو دوسری جانب بابا اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی، خالدہ بیگم دونوں کے درمیان ایک عجیب سی پوزیشن میں گھری ہوئی تھیں، احسان صاحب کو کچھ کہنا چاہتی تو ان کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہو جاتا، دوسری جانب بابا کو سمجھانے بیٹھیں تو وہاں کا تو حال ہی عجب تھا۔

”بجائے اس کے کہ آپ بابا کو سمجھائیں مجھے سمجھانے آئیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوتے۔“

”اب یہ کیا بات ہوئی؟ آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں گویا یہ مسئلہ کشمیر ہو۔“ بابا جھنجھلائی بولی۔

”ایسا ہی سمجھو۔“ خالدہ بیگم اپنی بات پر زور دے کر بولیں۔

مکمل ناول



”میں دونوں میں سے کسی کی بھی حمایت نہیں کر رہی۔“
 ”اچھی بات ہے۔“ ماہا نے جیسے شکر کا کلمہ پڑھا۔

”تم اور تمہارے بابا، خود اپنے بچ کے مسئلے مسائل حل کرو، مجھے تو بخشو۔“ خالدہ بیگم جو صبح سے دونوں پارٹیوں کو اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کر چکی تھی، تھک ہار کر تنک آ کر بولیں کہ بے ساختہ ہی ماہا کے ہونٹوں کے کونے پھیلے مسکراہٹ چھپانے کی خاطر وہ خالدہ بیگم سے چہرہ چھپا گئی۔

☆☆☆

احسان صاحب کا اپنا گارمنٹس کا ویل سٹلڈ امورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بڑی ہی خوش اسلوبی سے پچھلے پچیس سال سے چلا رہے تھے اب تو گارمنٹس کی دنیا میں ان کی کمپنی کا اچھا خاصا نام تھا، روپے کی اچھی خاصی ریل پیل تھی، ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے اپنی خاندانی روایات کو اپنے گھر کے ماحول میں زندہ رکھا ہوا تھا، جدید زمانے کے تقاضوں کے ساتھ لے کر چلتے ہوئے اور اپنے خاندانی اقدار کو زندہ رکھنے کی بھرپور مثال احسان صاحب کے خوبصورت تین کنال کے کشادہ بنگلو میں صاف دکھائی دیتی تھی، جہاں اپنی والدہ خورشید بیگم، بیگم خالدہ اپنی لاڈلی بیٹی ماہا اور گھر میں نوکروں کی فوج سمیت رہائش پذیر تھے۔

بیٹی ماہا کی پرورش کرتے وقت دونوں میاں بیوی نے خصوصاً والدہ کی ہدایات پر بطور خاص دھیان رکھا تھا۔

خورشید بیگم روپے پیسے کے بے جا اصراف پر بلا تھک اپنی ماں ہونے کا حق وصول کرتی تھیں۔

خالدہ بیگم کا احسان صاحب کی بات کی جانب جھکاؤ اسے الجھن میں الجھائے جا رہا تھا۔
 ”تمہارے پاپا کچھ غلط نہیں کہتے۔“ خالدہ بیگم نے مصالحتانہ انداز اپنایا۔

”کچھ غلط نہیں تو کچھ ٹھیک بھی نہیں۔“ وہ ان کی بات سن کر تنک کر بولی۔

”مالی بیٹا انہوں نے زندگی گزار دی ہے، زندگی کے تجربات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔“ خالدہ بیگم کا رویہ اور لہجہ ہنوز تھا۔

”اگر زندگی انہوں نے گزار دی ہے تو کچھ زندگی میں نے بھی جی ہے۔“ ماہا اپنے موقف پر سختی سے ڈٹی ہوئی تھی۔

”زندگی جیسے اور گزارنے میں فرق ہوتا ہے، تم نہیں سمجھو گی۔“ اس مرتبہ خالدہ بیگم کا لہجہ پر سوچ انداز لگے تھا۔

”مجھے اس وقت سمجھنا بھی نہیں، آپ کو پاپا کو سمجھانا چاہیے کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دیں۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی۔

”تم کیوں نہیں چھوڑ دیتیں ضد۔“ اس مرتبہ خالدہ بیگم محفوظ انداز میں مسکرائیں۔
 ”ناممکن۔“ ماہا سر جھٹک کر بولی۔

”وہ تمہیں دنیا کی سرد گرم سے بھانا چاہتے ہیں، چاہتے ہیں کہ تم زندگی کو جیو، کل کے جیو، ہنر کسی تکلیف کے۔“ خالدہ بیگم نے سمجھایا۔

”میں بھی یہی چاہتی ہوں، امی میں بھی جینا چاہتی ہوں، ہنر کسی تکلیف کے۔“ وہ لگاتار انہیں اپنی بات کے لئے کنوینس کر رہی تھی۔

”تم جس راستے پر چلنا چاہ رہی ہو، اتنا آسان نہیں ہے۔“ خالدہ بیگم کے لہجے میں تنبیہ کی اور گہرائی تھی۔

”امی آپ میری حمایتی ہیں یا پاپا کی۔“ اس مرتبہ ماہا زچ ہوئی۔

”خالدہ تمہیں کتنی مرتبہ منع کیا ہے بچی کے اتنے کپڑے نہ بنوایا کرو۔“ خورشید بیگم نے بہو کو ٹوکا جو کچھ دیر پہلے ہی بازار سے شاپنگ میں ماہا کے تین فراک خرید لائی تھیں۔

”امی جان ابھی پچھلے ماہ تو لئے تھے تو۔“
”پچھلے ماہ نہیں، محض تین ہفتے پہلے ہی چار فراکیں لائی ہو۔“ خالدہ بیگم کی بات ٹوکتے ہوئے انہوں نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”بیٹی ہے اور بیٹیوں کے کپڑے تو جتنے بھی ہوں اتنے ہی کم ہیں۔“ دھیمے انداز میں ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اپنی نظروں کے سامنے فرلوں والی فراکیں دیکھیں۔

”پہلے الماریاں بھر بھر کے رکھی ہیں، دو سے تیسری مرتبہ باری نہیں آتی کہ اٹھا کر دے دیتی ہوں۔“ خورشید بیگم نے گھر کا۔

”امی جان، آپ ہی کی پوتی ہے۔“ ہنوز مسکراہٹ لئے خالدہ بیگم بولیں۔

”جانتی ہوں، اسی لئے کہہ رہی ہوں، مگر جائے گی، روپیہ پیسہ بڑا مناسب انداز میں خرچ کرنا چاہیے، چنی عمر ہے، ابھی عادتیں بگڑ لیں تو ساری عمر تکلیف میں گزرے گی۔“ اس مرتبہ خورشید بیگم کے انداز میں گہرائی تھی۔

”آپ تو ایسے ہی سوچ سوچ کر بلکان ہوتی ہیں۔“ اس کی بات سن کر خالدہ بیگم نے تسلی آمیز لہجے میں بولیں۔

”زندگی گزاری ہے میں نے، خدا باپ کا سایہ سر پر سلامت رکھے، روپیہ پیسہ کی تنگی اب نہ دیکھائے لیکن آج کم میں گزر کرنا سکھاؤ گی تو کل کو کم میں رہنا بھی سیکھے گی، ساری زندگی ماں باپ نے سر پر نہیں رہنا، اگلے گھر بھی تو بھیجنا ہے روپیہ پیسہ سنبھالنا بھی آنا چاہیے اور تم ماں ہو، آج سکھاؤ گی تو کل کو برا وقت پڑا تو آسانی سے کاٹ

لے گی۔“ لہجے میں مستقل کی تشویش لئے خورشید بیگم کے لہجے میں پوتی کی فکر تھی۔
”آپ کہتی تو ٹھیک ہیں۔“ ان کی بات سمجھتے ہوئے خالدہ بیگم نے تائید میں سر ہلائی۔
”اگر تمہاری سمجھ میں آجائے۔“

”امی جان..... میں میری..... غلط کہہ بھی کہے سکتی ہیں۔“ لہجے میں چاہت لئے انہوں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”آگے بیٹا۔“ احسان صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور خورشید بیگم کی جانب چلے آئے۔
”کیسی ہیں؟“ ان کے قریب ہی تخت پوش پر بیٹھ گئے۔

”شکر ہے مالک کا، تم سناؤ آفس میں دن کیسا رہا؟“ خورشید بیگم نے قریب بیٹھے احسان صاحب کے کندھے پر مانتا بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”اے دن۔“ ہونٹوں پر مدہم مسکراہٹ سجائے احسان صاحب نے جواب دیا۔
”ہوں۔“

”یہ آپ کی بہو کا منہ کیوں پھولا ہوا ہے، خبر تو ہے نا۔“ خالدہ بیگم کو اپنے سامنے فراک پھیلانے دیکھا تو شرارتی انداز میں بولے۔

”ہیں، یہ کس نے کہا۔“ ان کی بات سن کر بے ساختہ ہی خالدہ بیگم متوجہ ہوئیں۔

”مجھے تو ایسا ہی لگا، جب میں کمرے میں داخل ہوا تو دونوں ساس بہو میں کچھ بحث جاری تھی، جو کانوں نے سنی اسی سے اندازہ لگایا کہ میدان جنگ خاصا گرم ہے۔“ شرارتی انداز میں ان کی بات کا تفصیلاً جواب دیا تھا احسان صاحب نے۔

”امی جان دیکھ لیں اپنے عینے کو، ان کا بس نہیں چلتا کہ ہم دونوں میں لڑائی کرا دیں۔“

خالدہ بیگم نے ساس کو شکایت لگائی جواباً خورشید بیگم مسکرائیں۔

”واللہ مجھے تو حسرت ہی رہی پچھلے پندرہ سال سے کبھی تو بیوی اور ماں میں جھگڑا ہوا اور میں دونوں کو منادوں، بھی ایک کو کبھی دوسری کو، مگر جال ہے جو دونوں میں اختلاف رائے بھی ہو اور جہاں موقع دیکھتا ہوں لگتا ہے کہ چلو اب دل کی مراد برآئی، اب ہوا جھگڑا وہیں پر الٹا منہ کی کھائی پڑی ہے، دونوں پاریاں مل کر الٹا میری جان کو آ جاتی ہیں۔“ احسان صاحب نے کھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ سن رہی ہیں امی جان، اپنے بیٹے کے عزائم۔“ ان کے الفاظ نے جلتی پرتیل کا کام کیا تھا، خورشید بیگم سے کہے بنانہ رہ گئیں۔

”سن بھی رہی ہوں اور دیکھ بھی رہی ہوں۔“ خورشید بیگم مسکراتے ہوئے بولیں، جانتیں تھیں بیٹے کی شرارت کو اس لئے ہلکے انداز میں لیا۔

”اوروں کے شوہر دعا کرتے ہیں کہ ان کی بیگم اور ماں بھی تو اکٹھے مل بیٹھیں اور ایک یہ ہیں کہ ہر وقت ہم دونوں کو لڑوانے کے چکر میں رہتے ہیں۔“ خالدہ بیگم رو ہانسی ہوئیں۔

”خالدہ تم بھی کس کی باتوں میں آ جاتی ہو، معلوم ہے کہ ایسے ہی تمہیں چھڑنے کو کرتا ہے۔“ خورشید بیگم نے ان کے غصے اور اچھے لہجے کو سلجھانے کو نلی آمیز لہجے میں کہا۔

”آپ نے ہی ڈھیل دی ہوئی ہے۔“ خالدہ بیگم زچ ہو کر بولیں۔

”ہں یہ کیا بات کہی، خود اس سے پوچھو گی تو اس کا خیال ہے کہ میں نے تمہیں ڈھیل دی ہے، ایسے ہی اس کی باتوں پر دل ہلکان کرتی ہو۔“ احسان صاحب نے پھر سے ساس بہو کی

گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور خبردار جو تم نے اب ایک لفظ بھی بولا تو۔“ خورشید بیگم نے احسان صاحب کو گھر کا۔

”میری تو۔“ میری مجال جو ساس بہو کے درمیان ایک لفظ بھی بولا۔“ وہ مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے کانوں کی لوؤں کو ہلکے سے چھوتے ہوئے بولے۔

”جانتی ہوں، تمہاری تو یہ تمہاری مجال کو۔“ خورشید بیگم اپنے بیٹے کے لہجے کی شرارت بھانپ کر زیراب مسکراتے ہوئے بولیں۔

”چلو خالدہ کھانا لگواؤ، بھوک لگ رہی ہے۔“ فرا کوں کو تہہ لگاتے خالدہ بیگم سے بولیں، وہ انہیں منظر عام سے ہٹانا چاہ رہی تھیں، اپنی بہو کی طبیعت سے خاصی واقف تھیں۔

”جی امی جان بس پانچ منٹ میں کھانا لگوا رہی ہوں۔“ جواب دیتے ہوئے خالدہ بیگم نے بھی وہاں سے نکلنے میں عافیت جانی، زیادہ دیر رکھتیں تو احسان صاحب کی باتیں انہیں رلا دیتیں۔

☆☆☆

وقت پر لگا کر دس سال کا عرصے تیزی سے طے کر گیا، ماحول میں رچی رچا اعتدال پسندی کی فضا نے ماہا کی شخصیت کو نکھار دیا تھا، ایک سلجھے ماحول نے کبھی روح کو پروان چڑھایا، ایک نظر ماہا کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ کروڑوں کی جائیداد کی مالک لڑکی میں خندہ پیشانی کا سامنہ رومی اور عاجزی کی زندگی کتنی گتھن آزمائشیں ساتھ لئے آئے گی، آنے والے وقت نے یہ بات ثابت کر دی تھی، لیکن کچھ ایسا انہوتا ہوا تھا کہ جس نے احسان بھگو کی فضا میں کشیدگی کے احساس کو اجاگر کر رہا تھا۔

ایف اے کے پیرز سے فارغ ہوئے ماہا کو

دو دن ہوئے تھے کہ اس نے رات کو کھانے کی ٹیبل پر احسان صاحب کے سامنے ایک عجیب سا مطالبہ کر دیا کہ جس نے احسان صاحب سمیت خالدہ بیگم کو بھی حیران کر دیا وہیں پر خورشید بیگم بھی حیرت زدہ کی گئیں۔

”کیا ہوا، آپ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں، اب ایسی کون سی انوکھی بات کر دی۔“
”تم نے بات ہی ایسی کی ہے ماہا۔“ خالدہ بیگم بولیں۔

”ایسی مطلب؟“ ماہا نے ابھرا چکاتے پوچھا۔

”تمہارے بننے کھینے کے دن ہیں، دو دن پہلے تمہارا امتحان ختم ہوا ہے، ریٹ کرو، بلکہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومو پھرو۔“ سرسری انداز میں خالدہ بیگم بولیں اور بریانی بھری ڈش اٹھا کر ماہا کے سامنے کی۔

”ریٹ ہی تو کر رہی ہوں پچھلے دو دن سے اور دو دن پہلے ہی تو سہیلیوں کے ساتھ تھی۔“
لہجے میں بے زاری تھی، اس نے خالدہ بیگم سے چاولوں بھری ڈش پکڑے واپس ٹیبل پر رکھ دی۔

”وہ تو کاج آنا جانا تھا، پھر پیر زمین ساتھ تھیں، اب تو ویسے گھومنے پھرنے کی بات کر رہی ہوں، بہت دنوں سے تم شاپنگ رہی نہیں گئیں، ایسا کرو اپنی سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام بنالو۔“ خورشید بیگم نے پوتی کو دادی سے دیکھا۔

”پلیز آپ میری بات کو ان باتوں میں نہ ٹالیں، آئی ایم سیریس، کیوں بابا کیا خیال ہے آپ کا؟“ دادی کی بات انگور کرتے ہوئے ماہا نے بیک وقت اپنے ماں باپ کو مخاطب کیا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ تم بھی ایکزام سے فری ہو تو کیوں نہ اگلے ہفتے ہم دوہی چند دن کے چلیں، مجھے ایک بزنس میٹنگ اینڈ کرنے دوہی

جانا ہے تو تم دونوں مان بٹی بھی ساتھ چلو، تین دن کا ٹور ہے اچھی آؤٹنگ رہے گی، بلکہ تم دونوں شاپنگ بھی وہیں کر لینا۔“ احسان صاحب نے بچوں کی مانند ماہا کو بہلایا۔

”واؤ That a great idea اچھا ہے میں آپ کے ساتھ میٹنگ بھی اینڈ کر لوں گی، بزنس فیلڈ کی شروعات ہی دوہی بزنس میٹنگ اینڈ کرنے سے ہوگی، ساری زندگی مجھے یہ بات نہیں بھولے گی۔“ ان کی بات کے جواب میں ماہا ایکسانڈ ہوتے ہوئے بولی۔

”خالدہ بچی کو دودھ میں بادام ڈال کر دیا کرو، ساتھ میں کاجو بھی پیس کر، پڑھائی کی ہے تو دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔“ خورشید بیگم نے ماہا پر ایک نگاہ ڈالی اور بہو کو یقین کی، ہونٹوں کے کونے مسکراہٹ کے انداز میں اوپر کواٹھے۔

”دادی جان، آپ میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔“ ماہا نے منہ بسورا۔

”کو بھلا، اس عمر میں مذاق کرتی اچھی لگتی ہوں۔“ خورشید بیگم کے لہجے میں ہنوز شرارت تھی۔

”آپ تو مجھ سے بات ہی نہ کریں۔“ ماہا اپنی دادی کے نان سیریس لہجے کو بھانپ کر روٹھے انداز میں بولی۔

”ایسے بات کرتے ہیں، دادی ہیں تمہاری۔“ خالدہ بیگم نے گھر کا۔

”تو مجھے کب انکار ہے، اپنی دادی ہیں تو ہی ایسے بات کر رہی ہوں، کسی کی دادی ہوتی تو لفٹ بھی نہیں کرائی تھی، لیکن اس وقت میزادل کر رہا ہے کہ میں واقعی یہ کرسی پر بیٹھی خاتون کو لفٹ نہ کرواؤں، کیونکہ اس وقت اپنی سے زیادہ کسی کی دادی لگ رہی ہیں۔“ ماہا کے انداز پر خورشید بیگم سمیت احسان صاحب اور خالدہ بیگم کے ہونٹوں

☆☆☆

وقتی طور پر معاملہ سیٹل ہو گیا، خالدہ بیگم اور ماہا، احسان صاحب کے ہمراہ دوہی چلے گئے، ایک ہفتے کا بزنس ٹور تھا جو احسان صاحب نے مزید ایک ہفتہ فیملی کی خاطر Extend کروا لیا تھا، ماہا کے دماغ میں بزنس کی دنیا میں قدم رکھنے کی خواہش جو ذہن میں اچانک سے ابھری تھی، اس کو واپس اپنی جگہ لانے میں احسان صاحب کو خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا، ایف ایے کے بعد ماہا بزنس میں باپ کا ساتھ دینا چاہتی تھی، احسان صاحب جس کے خاص مخالف تھے، خالدہ بیگم تو سرے سے اس بات کی قائل نہ تھیں اور خورشید بیگم نے سنا تو انہوں نے ہنس کے ٹال دی۔

احسان صاحب نے دنیا داری نبھائی تھی صرف گھر کے اندر بینشیں گھر کے باہر کی دنیا سے بھی اچھی طرح واقف تھے، وہ یہ بات سمجھ رہے تھے کہ خالدہ بیگم یا خورشید بیگم کو سمجھانا جتنا آسان ہے، ماہا کو کسی بات پر آمادہ کرنا اتنا ہی مشکل، وہ آج کے دور کی لڑکی تھی اور ایک باشعور گھرانے میں اس کی پرورش ہوئی تھی، جہاں اس کے ذہن کو کھل کر سوچنے کی اجازت تھی، وہ دلائل کے بنا سمجھتی نہ تھی اور اس کے سوالوں کے جواب میں دلائل دینا اتنا آسان نہیں تھا، پھر حال اس وقت جیت احسان صاحب کی ہوئی تھی کیونکہ ابھی ماہا کے سوالوں کو احسان صاحب کے دلائل کا سامنا کرنا پڑا تھا، کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن احسان صاحب جیسے دنیا دار انسان کے لئے ناممکن بھی نہیں تھا۔

ایگریمنٹ دو سال کی خاموشی کا ہوا تھا، اس ٹاپک پر بات نہ کرنے کا خاموش ایگریمنٹ لیکن دو سال بعد وہ اس کے سوالوں کے جواب میں دلائل نہیں دے پائے تھے، انہوں نے اپنے

پرسکراہٹ ابھری، ساتھ ہی چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔

”پاپا پھر کیا سوچا۔“ پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے ماہا بولی۔

”دوہی چلو تم ماں بیٹی ساتھ میں، تم دونوں گھومنا پھرنا شاپنگ کرنا، میں بزنس ڈیل کر لوں گا۔“ احسان صاحب نے روٹی کا ٹوالہ بناتے ہوئے کہا۔

”پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔“ ماہا نے پلیٹ میں بچ زور سے چٹا تھا۔

”ایسا کرتے ہیں مرغی کی ٹانگ پکڑ لیتے ہیں۔“ احسان صاحب کی حس لطافت چھڑی تھی۔

”آپ سب مجھے بچہ سمجھ رہی ہیں۔“ ماہا کے لہجے میں برہمی تھی۔

”بچہ ہو تو بچہ ہی سمجھیں گے نا۔“ خالدہ بیگم نے رمان سے جواب دیا، ماہا نے خالدہ بیگم کی بات سن کر تیزی سے کرسی کھٹکا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا، کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچا۔“ خالدہ بیگم بولیں۔

”مجھے نہیں کھانا۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

”بچوں والی ضد۔“ احسان صاحب بولے۔

”I am not a child“ وہ پیر پٹختی ہوئی اسے کمرے کی جانب بڑھی، خورشید بیگم نے ایک ٹھہری سانس لی اور پھر دھیمے سے لہجے میں بولیں۔

”بچی ہے، انجانے میں ضد کر بیٹھی ہے، چلو تم دونوں کھانا کھاؤ۔“ یہ کہتے ساتھ ہی کمرے کی فضا میں خاموشی چھا گئی تھی۔

برنس ایڈمنسٹریشن کی کتابیں پڑھ لوں نہیں سیکھ
 باؤں کی، زندگی کے کسی بھی شعبے میں آگے بڑھنے
 کے لئے کسی Sincere ساتھ کی ضرورت ہوتی
 ہے اور میری یہ رہنمائی آپ سے بہتر کوئی نہیں کر
 سکتا۔“ مفصل اور رسائیت بھرے لہجے میں ماہا
 بولی تو بولتی ہی چلی گئی۔

”میری بیٹی واقعی بڑی ہو گئی ہے۔“ بہت
 دیر بعد احسان صاحب بولنے کے قابل ہوئے
 تھے، انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ باتوں میں ماہا
 سے جیت نہیں سکتے۔

”پاپا یہ حقیقت ہے کہ جس بیٹی کی رہنمائی
 میں اس کا باپ اس کا ساتھ دے وہ دنیا کی کسی
 بھی جنگ کے میدان میں ہار نہیں سکتی۔“ ماہا کا
 لہجہ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا۔

”پاپا دو سال پہلے میں نے آپ سے ضد کی
 تھی، آج ضد نہیں کروں گی، لیکن آپ کو ضرور سوچنے
 کے لئے کہوں گی آپ کو میری بات میں ذرا سی
 بھی سچائی نظر آئے تو مجھے اچھا لگے گا، پاپا برنس
 کرنا میرا شوق ہی نہیں میری ضرورت بنی ہے،
 زندگی کو جینے کا، میں ان لڑکیوں کی طرح نہیں جینا
 چاہتی جن کے فیصلے ان کے گھر والے کرتے
 ہیں، میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے عقل کل
 سمجھیں، میں خود کو کسی اسی عقل کل کی حیثیت
 سے دیکھوں جہاں میری ہی من مانی ہو، بس
 چاہتی ہوں کہ جو بھی فیصلہ کروں اپنے دل و دماغ
 سے کروں گی، آپ لوگوں سے مشورہ لوں، نہ کہ
 لوگوں کے لئے فیصلوں پر کٹھ پتلی کی طرح سر
 جھکائے عمل کرنی جاؤں چاہے وہ میری زندگی
 کے لئے غلط ہی کیوں نہ ہو۔“

”اور پاپا میرا دل کہتا ہے کہ آپ بھی اپنی
 بیٹی کے لئے ایسا ہی سوچتے ہو گئے۔“ احسان
 صاحب کو اپنی بات کے جواب میں خاموش پا کر

دلائل کو کسی چھوٹے سے بچے کے معصوم سے
 بہلاؤے محسوس ہو رہے تھے، یک دم ہی انہیں
 احساس ہوا کہ جس خاموش ایگریمنٹ پر انہوں
 نے دو سال پہلے زبان سے مہر لگائی تھی وہ صرف
 ان کے ہونٹوں پر لگی تھی، ماہا کے ہونٹوں پر بھی
 ایک ظاہری چپ تھی، لیکن اس کی سوچ پچھلے دو
 سالوں سے احسان صاحب کے دلائل سے لڑنے
 کے گر کھ رہی تھی۔

”نہیں پاپا اب نہیں، دو سال پہلے آپ نے
 مجھے یہ کہہ کر خاموش کروا دیا تھا کہ ابھی چھوٹی
 ہوں پڑھائی کی ضرورت ہے، برنس ڈیلر کے
 لئے ایتھور ہوں۔“

”وہ تو اب بھی ہو۔“ احسان صاحب جواباً
 رساں سے بولے۔

”ہر کوئی ہوتا ہے آپ بھی تھے جب آپ
 نے برنس اشارت کیا تھا، میں بھی ہوں لیکن آپ
 کے سہارے اور خدا کے آسرے میرا راستہ اتنا
 مشکل نہیں ہوگا۔“ ماہا کے لہجے میں ایک انجانی سی
 امید تھی کہ بہت دیر تک وہ ماہا کے چہرے کو دیکھتے
 رہے۔

”مجھے پسند نہیں ہے اور پھر اماں جان کو بھی
 تو سمجھانا آسان کام نہیں ہے۔“ کچھ دیر بعد
 انہوں نے اپنی بات کی تائید میں جواز دیا۔

”جہاں تک دادی جان کا تعلق ہے تو وہ تو
 کبھی بھی نہیں چاہیں گئیں کہ مجھ پر زندگی کی کوئی
 مشکل پڑے، میری زندگی آسان برآسائش
 گزرے وہ ان کے پیار کا اظہار ہے لیکن مجھے
 معلوم ہے کہ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے، ایک
 نہ ایک دن تو مجھے یہ سب دیکھنا ہے، خدا آپ کا
 سایہ سر پہ سلامت رکھے لیکن پاپا پلیز آپ
 پر یکسر کھلی سوچیں تو غلط تو نہیں، آج آپ کی
 Guidance میں جو کچھ میں سیکھوں گی وہ لاکھ

وہ ایک مرتبہ پھر بولی۔ احباب میں بھی الگ ہی تذکرے تھے لیکن جو

باتیں سن کر احسان صاحب ساکت سے اپنی جگہ بیٹھے رہ گئے تھے۔ اس میں سال کی لڑکی کی زبان سے یہ تمام

باتیں سن کر احسان صاحب ساکت سے اپنی جگہ بیٹھے رہ گئے تھے۔ اس میں سال ہو گئے تھے اس بزنس کی دنیا میں لوگوں کے ساتھ ڈیل کرتے، بہت سے نئے بزنس میں بھی اس بزنس کی دنیا میں ابھرتے دیکھے تھے، لیکن کچھ تھا جس سال کی لڑکی کی باتوں میں جو انہیں حیرت میں ڈال گئی تھی اور وہ لڑکی، خود ان کی اپنی بیٹی تھی، بات یہاں تک ہوئی تو بھی انہیں اس قدر حیرت نہ ہوئی، لیکن ان کی حیرانگی کی وجہ یہی کہ وہ بیس سال سے اس بچی کی پرورش کر رہے تھے اور انہیں بھی احساس ہی نہ ہوا کہ وہ بیٹی کس قدر ٹیلنٹڈ ہے، آج وہ دیکھ رہے تھے، ان کی باتوں کے سامنے ان کے دلائل نامکام ہو گئے تھے، کل کو اس لڑکی کی باتیں دنیا کے دلائل کو اپنے سامنے پاکام کر سکتی تھیں، یہ بات ان کی حیرت کا باعث تھی تو کچھ غلط بھی نہ تھا، خاندان میں جس نے بھی شاحیرت کا اظہار کیا۔

”یہ احسان کو کیا سوچی، بیٹی کو کس کام میں لگا دیا۔“

”اگر اتنا ہی تھا تو اس کی شادی کا سوچتے۔“

”ذرا سا بیٹی کو کیا پڑھا دیا، خود کو کیا سمجھتے لگے ہیں۔“

”شادی کی عمر کو پہنچی ہے لڑکی۔“

”اب گھر سے نکل کر مردوں میں دھکے کھاتی پھرے گی۔“

”اتنا پیسے کا جنون کہ بیٹی کو بھی اس کام میں لگا دیا۔“

غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں نہ صرف خاندان میں لوگوں کی زبانوں پر، بلکہ دوست

احباب میں بھی الگ ہی تذکرے تھے لیکن جو باتیں بھی تھیں احسان صاحب کے سامنے کرنے کی کسی کو ہمت نہیں تھی، سوائے خورشید بیگم کے، خالدہ بیگم نے کہنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن احسان صاحب نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔

”میں جو کرنے چلا ہوں، خالدہ سمجھ کر ہی کر رہا ہوں۔“ خورشید بیگم کے سوالوں کے سامنے بھی احسان صاحب ہی جواب دہ تھے۔

”لڑکی ذات ہے کس روپے پیسے کے چکر میں پھنسانے لگا ہے اولاد کو۔“

”امی جان، لڑکی ذات ہے اس لئے تو ایسا سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں، میری زندگی کہاں تک ہے اگلیوں اولاد ہے بہن بھائی بھی نہیں، خالدہ گھریلو خاتون ہے، باہر کی دنیا داری نہیں جانتی، ایسے میں ماہا کو ضرورت سے اس بزنس کو سیکھنے کے گھر، سمجھنے کے طریقے۔“

”دنیا بہت ظالم ہے۔“ خورشید بیگم کے لہجے میں انجنا خوف تھا۔

”جانتا ہوں بہت اچھی طرح، اسی لئے تو اسے اس ظالم دنیا سے لڑنے کے طور پر پتے سیکھانا چاہتا ہوں۔“ احسان صاحب کے لہجے کی گہرائی خورشید بیگم کی تجربہ کار شخصیت سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

”اس کے کھیلنے کودنے کی عمر ہے، اتنی بڑی ذمہ داری اس کے سر پر ڈالنے چلا ہے احسان، ابھی ساری عمر بڑی ہے یہ سب کام سیکھنے کی۔“

لہجے میں پوتی کی محبت تھی، نگاہوں میں اس کا بچپنا۔

”اس کی عمر بڑی ہے لیکن میری عمر کا کیا پتہ۔“ پر سوچ دھمے انداز میں احسان صاحب گویا ہوئے۔

”خدا تم تینوں کو میری زندگی کی باقی

خود کیا کچھ سوچتا رہتا ہے۔“ خورشید بیگم نے بہت گہری نظروں سے احسان صاحب کے چہرے پر پھیلی تشویش کو پڑھا۔

”پہلے نہیں سوچتا تھا، لیکن آپ کی پوتی کی باتوں نے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، جو بچپن برس کی عمر میں، میں نہ سوچ پایا وہ آپ کی پوتی نے محض تیس برس کی عمر میں سوچنا شروع کر یا۔“ بات کے اختتام پر ایک نرم سی مسکراہٹ احسان صاحب کے ہونٹوں پر در آئی۔

”جیسے تمہاری مرضی، باب ہو اس کے،“ ہی سوچا ہو گا اس کے مستقبل کے بارے میں۔“ اس لمحے انہوں نے ساری دنیا کے سامنے ماہا کی خواہش کی خاطر اسٹینڈ لیا تھا، لیکن کچھ عرصے میں ہی انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ جو دیکھائی دینے پر بڑی آسان سی بات لگتی تھی وہ دراصل میں اتنی آسان نہیں تھی، دنیا کو ان کی بیٹی کا بزنس میں آنا چاہیے کھٹکنے لگا۔

☆☆☆

عمران، احسان صاحب کا چھوٹا بھائی اور ان کے بزنس کا 25% شیر ہولڈر تھا، انہیں ماہا کے بزنس میں احسان صاحب کا ساتھ دینے کے بارے میں علم ہوا تو جیسے گھر میں ایک طوفان آ گیا تھا، عمران، یو کے میں اپنی بیوی اور دو بیٹے علی اور جبران سمیت رچے تھے، پچھلے دو سال سے وہ پاکستان نہیں آئے تھے، خورشید بیگم جب بھی انہیں پاکستان آنے کا کہتیں اپنی جاب اور بچوں کی پڑھائی کی مصروفیت کا کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ احسان صاحب بھی گاہے بگاہے انہیں پاکستان آنے اور بزنس میں ساتھ دینے کا کہتے تو وہ بزنس کر ٹال دیتے۔

”بھائی جان، آپ ہیں نا یہاں تو مجھے بزنس کی کیا فکر۔“ عمران کا لہجہ سرسری تھا۔

سائیس لگائے، کہیں فکس ڈپازٹ کروا دیے اس کے لئے اور بھی تو بہت طریقے ہیں، پلاٹ وغیرہ لے دیے، سونا بھی تو ہے نا، زندگی کے برے وقت ساتھ دیئے جاتا ہے۔“ خورشید بیگم نے ہلکا سا سوچ کر مشورہ دیا۔

”جی امی جان، جو خدا نے تو فیض دی ہے تو اس کے نام کافی کچھ کیا ہے اور آپ کو بھی فلم ہے۔“

”ہاں جانتی ہوں اور کچھ بھی اس کے نام کر دے شاید اسی سے تمہیں تسلی ہو جائے۔“ وہ ابھی تک شش و پنج کا شکار تھیں۔

”امی جان بات تسلی کی نہیں ہے، میں چاہے یہ ساری دنیا بھی اس کے نام کر دوں، جب تک اسے سنبھالنے کا طریقہ نہیں آئے گا تب ان زمینوں جائیدادوں کا کوئی فائدہ نہیں، دنیا اتنی سیدھی نہیں ہے جتنا نظر آتی ہے، کل کو شادی کرنی ہے کیسا انسان ملے، دلوں کا کیا پتہ ہوتا ہے، اسے سمجھ ہونی چاہیے، دنیا داری آتی چاہیے۔“ احسان صاحب کے چہرے کے تاثرات لہجہ اور الفاظ میں گہرائی تھی۔

”بہت بڑی ذمہ داری ہے بیٹا، منہ سی جان ہے۔“ بہت سے لمحے خاموش رہنے کے بعد خورشید بیگم کچھ بولنے کے قابل ہوئیں۔

”آپ ان باتوں کو سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں، میں بھی کون سا اس کے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالنے لگا ہوں، آج کل امتحان سے فارغ ہوتی ہے، اپنے ساتھ لے جایا کروں گا، کچھ اسی بھانے آفس کا ماحول دیکھ لے گی، کچھ آؤ تنگ بھی ہو جائے گی، چھوٹی چھوٹی باتیں اور گر، پیسے کو سنبھالنے کا طریقہ جائیداد کی دیکھ بھال یہ چیزیں سیکھ لے تو اچھا ہے۔“

”احسان بیٹا مجھے سوچنے سے روکتا ہے اور

”خدا آپ کو لمبی زندگی عطا کرے، آپ کا سایہ ہم سب پر اور خالدہ بھابھی ماہا پر سلامت رکھے انہی لمبی نہ سوچا کریں۔“ عمران ہلکے پھلکے لہجے میں گویا ہوئے۔

”زندگی کے جس مقام پر میں ہوں وہاں ایسی سوچیں تو آتی ہیں، بہر حال میں اگلے ماہ ہی یو کے کہنی کی براجم کھول رہا ہوں، تم نے کوئی جگہ پسند کرنی ہے آفس کے لئے تو کر لو اپنی مرضی سے، اسٹاف فی الحال تو یہاں سے بھیجوں گا دو ماہ کے ویزے پر۔“

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“

ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے بھائی کو ماہا کے بزنس انوالومنٹ سے سب سے زیادہ اعتراض تھا۔

”احسان بھائی، یہ کیا سوچی آپ کو جولڑکی ذات کو اس روپے کے چکر میں ڈال دیا۔“ عمران کا لہجہ جھنجھلا یا ہوا تھا۔

”ضروری سمجھا، میرا بیٹا کوئی نہیں، ایک ہی بیٹی خدا نے دی ہے، جس پر لاکھ شکر ہے، لیکن اس کے چینے کے سہارے کو ضروری سمجھا۔“ احسان صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کی بات کا بہت مفصل انداز میں جواب دیا۔

”آپ ہیں نا، پھر میں ہوں، علی اور جبران ہیں، وہ بھی تو آپ کے ہی بیٹے ہیں۔“ ہلکے سے جھنجھلائے دے دے انداز میں بولے۔

”مجھے عزیز ہیں بیٹوں کی طرح، تمہاری طرف سے تو یہی سکون ہے مجھے۔“ ان کا لہجہ نسلی آمیز اور اطمینان بخش تھا۔

”کہاں کبھی پھرے گی بزنس کی اونچ نیچ کو سمجھنا، ایک عورت کے بس میں نہیں ہے۔“ احسان صاحب اس مرتبہ عمران کے کبے الفاظ پر چونکے بنانہ رہ سکے۔

”تم بھی تو شیر ہولڈر ہو، تمہارا نہ ہونا میں کئی مرتبہ بہت محسوس کرتا ہوں، کئی بزنس کمپنیز سے ایگریمنٹ کرتے ہوئے انہیں تمہارے نہ ہونے پر اعتراض ہوتا ہے۔“

”آپ کو ایگل اتھارٹی دے رکھی ہے بزنس ڈیلنگ کی، تو پھر کسی بھی کمپنی کو اعتراض کرنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔“

”پھر بھی پرافٹ اینڈ لاس کی تمہیں بھی تو خبر ہونی چاہیے، ابھی تک اللہ کا شکر ہے کہ اتنے سالوں میں کوئی بڑا لاس نہیں ہوا، جو بھی پرافٹ ہوتا ہے کم یا زیادہ تمہارے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا ہوں، لیکن تمہیں ان تمام باتوں کی خبر ہونا چاہیے۔“

”بھائی کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، مجھے آپ پر اعتبار ہے، میں نے بھی آپ سے نہیں پوچھا اور بھائی صاحب سچی بات ہے میں یہاں بہت بڑی ہوں اپنی لائف میں کہاں پر پاکستان آؤں ان بزنس کو ڈیل کرنے کے لئے، آپ ہیں نا، وہاں سب بیچ کرنے کے لئے۔“ عمران کے لہجے کی لا پرواہی ہنوز تھی۔

”ہاں میں سوچ رہا ہوں کہ کمپنی کی ایک براجم یو کے کھول دوں، تم وہاں پر بزنس کمپنیز سے ایگریمنٹ کرنا، بزنس بھی ایکسڈ ہوگا اور ساتھ میں یو کے رہ کر تم بھی بزنس میں انوالو ہو جاؤ گے، مجھے بھی اس طرح تسلی رہے گی۔“

”آپ نے مجھے ضرور گھسیٹنا ہے اس بزنس میں۔“ اس مرتبہ عمران قدرے جھنجھلا کر بولے۔

”آج نہیں تو کل تمہیں ہی تو سنبھالنا ہے، میرا تو کوئی بیٹا نہیں ہے، جو بزنس کو سنبھالے، تم نے ہی ماہا کی دیکھ بھال کرنی ہے میرے بعد۔“ احسان صاحب نے نامحسانہ انداز میں عمران کو سمجھانے کی کوشش کی۔

تلاش کا گھر سکھاؤ گا، فائدہ قسمت کے سپرد کرتا ہوں۔“ احسان صاحب نے اپنے تئیں بات ختم کی تھی، لیکن یہ سب محض اس لئے اور اس وقت تک کے لئے تھا، آنے والے وقت میں انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ماہا کو بزنس کی فیلڈ میں لانا اور اسے اسٹینڈ دینا اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھ کر اس راستے ماہا کے مقدم چل پڑے تھے۔

ایک نیا محاذ تب کھلا جب انہوں نے ماہا کو بزنس ایڈمنسٹریشن میں یونیورسٹی داخل کرایا۔ سب سے پہلا اعتراض کرنے والے عمران صاحب تھے۔

”بھائی صاحب آپ گھر ~~خلاصہ~~ کے اصول بھول رہے ہیں۔“ عمران کا لہجہ خاصا تھا۔

”میں نے خاندان کے اصول کبھی بھی بدلنے کی کوشش نہیں کی۔“

”یہ بدل نہیں رہے تو اور کیا ہے، آپ نے ماہا کو بزنس ایڈمنسٹریشن میں داخلہ کیوں لینے دیا۔“ پہلی بات کا جواب دیتے ہوئے ہنوز انداز میں عمران نے اگلا اعتراض اٹھایا۔

”اس نے میرے کہنے پر بھی داخلہ لیا ہے۔“ انہوں نے سارا الزام اپنے سر لیا تھا۔

”ہمارے خاندان کی کسی لڑکی نے آج تک بزنس میں قدم نہیں رکھا۔“ عمران کا انداز جتنا والا تھا۔

”اگر تم سمجھ رہے ہو کہ یہ خاندانی اصول ہے تو میں تمہیں ایک بات کلیر کر دوں کہ ابا جان اور دادا جان نے آج تک کسی لڑکی کی تعلیم حاصل کرنے سے نہیں روکا، جہاں تک بزنس کرنے کا تعلق ہے تو آج سے پہلے کسی لڑکی نے اس فیلڈ میں آنے کی خواہش نہیں کی، صائمہ باجی کا تو جانتے ہونا انہوں نے لیچرار شپ کی تھی وہ بھی

”مجھے تمہاری سوچ پر حیرانگی ہوئی، ساری زندگی تم نے انگریزوں میں گزار دی، زندگی کا ساری اہم کی نسل سے چنا، اس ملک اور سوسائٹی جہاں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے، ابھی تک ذہن میں وہی دقیانوسی سوچیں پال رکھی ہیں۔“ بہت دیر بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوئے، ابھی تک وہ اسی گمان میں تھے کہ شاید انہیں غلط سنائی دیا ہو، عمران نے کچھ اور بولا ہو۔

”بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیکن آپ کو خیال رکھنا چاہیے کہ میں یو کے میں رہتا ہوں لیکن آپ کو پاکستان میں رہتے ہیں، وہاں لوگوں کی سوچ میں عورت ذات کی مرد سے برابری کا حق نہیں ہے۔“ عمران نے لاشعوری طور پر اپنی بات کا دفاع کیا۔

”وقت بدل گیا ہے اور لگاتار بدل رہا ہے، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور اسی دنیا میں ہی پاکستان بھی ہے، تم آج سے تقریباً تین سال پہلے کی باتیں کر رہے ہو، نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ انٹرنیٹ کی سہولت نے پاکستانیوں میں بھی شعور اجاگر کیا ہے، تیس سال پہلے عورت کا جو مقام تھا اب اس میں بہت فرق آ گیا ہے، جو چار قدم مرد کے پیچھے تھی آج قدم کے ساتھ قدم ملا کر کھڑی ہے۔“

”پھر بھی بھائی صاحب، آسان نہیں ہے بزنس ڈیل کرنا، بہت سڑاٹنگ آئی کیو ہونا چاہیے، حاضر جوانی اور موقع کی تلاش اور اس سے فائدہ اٹھانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔“ ناگواری اور اجنبیت عمران کے لہجے میں وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

”ماہا میں آئی کیو اور حاضر جوانی کی صلاحیت خدا نے دی ہے، جہاں تک موقع کی تلاش اور اس کا فائدہ اٹھانا ہے، تو میں موقع کی

صاحب نے دو ٹوک لہجے میں بات کا اختتام کیا اور فون کال منقطع کر دی۔

لیکن ان کے کہنے کے باوجود بات ہوئی تھی عمران نے اطلاع دی تھی کہ کچھ لیگل ورک کے لئے وہ فیملی سمیت پاکستان آ رہا ہے، فون کرنے کے ہفتے بعد ہی وہ پاکستان میں موجود تھا، فیملی سمیت دس دن کے اس ٹور میں بہت سے بزنس ریلڈ ڈیفیلے ہوئے تھے، عمران صاحب کے شیئر میں مزید پندرہ فی صد کا اضافہ ہو کر ٹوئس پینتیس فی صد کا بزنس شیئر ان کے نام ہو گیا تھا، اس سے اہم فیصلہ تھا کہ جہاں ماہا کو احسان صاحب نے بزنس ایگریمنٹس میں لیگل اتھارٹی دی تھی وہیں عمران نے اپنے بڑے بیٹے کو اپنا معاون قرار دیا تھا، آنے والے وقت کو لے کر احسان صاحب ٹھیکے ضرور تھے، لیکن پھر بھی اپنے دل کی پھٹی حس کو محض وہم خیال کرتے رہے، ابھی دو سال کا مزید عرصہ گزرا تھا کہ وہ اپنے دل کے وہم کو حقیقت کی سطح صورت قرار دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

عمران دو سال بعد دوبارہ اچانک ہی پاکستان اپنی فیملی سمیت آیا، اس مرتبہ اس کے آنے کا خاص مقصد تھا، دو ماہ کے اس وزٹ ٹور کے شروع کے ایک ماہ اس نے یہ کہہ کر گزارے کہ تمام فیملی کا دل پاکستان آنے کو تھا، سب سے ملنے کو بے تاب تھا اس لئے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا، لیکن ایک ماہ بعد ہی اس نے اپنے مطالبے کو خواہش کا روپ دے کر خورشید اور احسان صاحب کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”تم نے مجھے کس عجیب سی مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ بہت دیر بعد خورشید بیگم نے پہلو بدل اور پرسوج انداز میں بولیں۔

”مشکل کیسی امی جان، میرا خیال تھا کہ

یونیورسٹی لیول کی۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی احسان صاحب کے لہجے میں سختی در آئی، انہوں نے اپنی گفتگو میں خالہ زاد بہن کا حوالہ دیا۔

”یکچرار شب اور بات ہے اور بزنس کرنا اور بات، مردوں میں نکل کر کام کرنا ہوتا ہے۔“ ہمارے ابا تو اتنا نیرو ماسنڈ نہیں تھے، انہوں نے ہم دونوں کی پرورش کی، اگر میں ایسی بات کرتا تو بات ماننے والی بھی تھی کہ اسی ملک کی اسی سوسائٹی میں رہا ہوں اس لئے خیالات بھی ایسے ہیں، لیکن مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ تم فرنیگوں میں رہ کر بھی اتنے چھوٹے ذہن کی سوچ رکھتے ہو۔“ اس مرتبہ احسان صاحب کے لہجے کے ساتھ الفاظ میں بھی سختی تھی، انہیں اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر بیٹی کی زندگی کی خاطر وہ کچھ کرنا چاہ رہے ہیں تو وہ حال بھی انہیں ہی بننا پڑے گا۔

”آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔“ عمران صاحب کا لہجہ سوچتا ہوا تھا، انہوں نے احسان صاحب کو ایک مرتبہ پھر سے اپنی بات سے ہٹنے کو سوچنے کا کہا۔

”عمران، سمجھنے کی بات میری نہیں، سمجھنا تمہیں ہے جو میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اس پر قائم ہوں، ہاں اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں، ایک بات اور بتا دوں کہ اب چشتی بھی بزنس ڈیپلگرو اور ایگریمنٹس ہو گئے میرے دستخط کے ساتھ ماہا کے دستخط کے بغیر کوئی بھی اپرول نہیں ہوگی۔“ اپنی بات ختم کرنے کے ساتھ ہی ایک دھماکا انہوں نے کیا۔

”نہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ عمران صاحب ٹھٹکے۔

”وہی جو تم سن رہے ہو اور آئندہ تم اس ٹاپک پر کوشش کرنا کہ بات نہ ہی کرو۔“ احسان

جانتی ہوں کہ اسے کیا پسند ہے کیا نہیں، کھانے سے لے کر زندگی گزارنے کے ہر انداز میں۔“ خورشید بیگم کے لہجے میں کئی اندیشے اور وہم پنہاں تھے، کئی فکریں تھیں، جن میں سے چند ایک کو انہوں نے الفاظ کا روپ دیا تھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے امی جان۔“ خاصے اطمینان بخش لہجے میں عمران بولے، کمرے میں موجود باقی نفوس خاموش تھے۔

”اس کے ہر انداز میں گہری چھاپ ہے میری، اس کی ماں کی، اس زمین کی۔“ وہ ہنوز بچے تھے لہجے میں بات بوہاتے ہوئے بولیں۔ ”جہاں تک میں نے زندگی گزاری ہے اور میری نگاہ کی رسائی ہے، ماہا اور علی میں نہہ نہیں سکے کی۔“ کمرے کی خاموش فضا میں خورشید بیگم کی آواز ابھری اور پھر ایک طویل عرصہ کے لئے خاموشی چھا گئی۔

”آپ ماہا سے پوچھ لیں۔“ بہت دیر بعد عمران صاحب بولنے کے قابل ہوئے۔ ”مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے ماہا کا رشتہ تمہارے بیٹے کے لئے قبول نہیں ہے۔“ دونوں انداز میں کمرے میں خورشید بیگم کی آواز گونجی۔

”امی جان! احسان بھائی سے بھی تو پوچھیں؟“ عمران کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی، انہیں ہاتھوں سے چلتا ہوا خاندانی بڑس لٹکا محسوس ہوا۔

”ماہا کے مستقبل کے بارے میں مجھے احسان سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ خورشید بیگم کی بات سن کر جہاں عمران تلملائے وہیں پرا احسان صاحب نے سکھ کا سانس لیا۔

”مجھے بھی تو پتہ چلے کہ آپ کو ماہا کے مقابلے میں میرے بیٹے میں کون سی خامیاں نظر آ

آپ کو سن کر خوشی ہوگی۔“ عمران کا لہجہ خاصا خوشگوار تھا۔

”خوشی تو جب ہوتی کہ تمہاری اولاد کے مزاج ہمارے ساتھ ملتے۔“ خورشید بیگم نے اپنے اوپر اوڑھی چادر کا پلو دائیں کاندھے پر ٹھیک کیا۔ ”کیا مطلب امی جان؟“ عمران نے اچنبھے سے ماں کو دیکھا۔

”چھوڑو مطلب کی بات۔“ وہ دانستہ سرسری انداز میں بولیں۔

”نہیں مجھے کھل کر بتائیں کہ آپ خوش کیوں نہیں ہیں۔“ وہ اپنی بات پراڑے تھے، انہوں نے ماں سے اپنی چھچی کبھی بات کا جواب مانگا۔

”ماہا کی پرورش میری نظروں کے سامنے ہوئی ہے، بلکہ یوں کہو کہ میرے ہاتھوں میں ہوئی ہے، اتنا اس کی ماں اس کے قریب نہیں ہے جتنا وہ میرے قریب ہے۔“ بہت دیر بعد وہ گویا ہوئیں، انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عمران اپنی بات کا جواب لئے نہیں ملے گا اور اس نازک مسئلے کو انہیں ہی نہایت جہاندیدی سے سلھانا ہے۔

”جانتا ہوں امی جان کہ آپ کو ماہا کی عزیز ہے۔“ خورشید بیگم کی بات سن کر اطمینان بھرا سانس عمران کے حلق سے برآمد ہوا۔

”جانتے ہو اس کا میرے قریب ہونے کا مطلب؟“ ابھرو اچکا کر خورشید بیگم نے سوالیہ انداز میں پوچھا، کچھ ایسا تھا خورشید بیگم کے لہجے میں کہ عمران صاحب سمیت احسان صاحب اور خالدہ بیگم بھی نظر اٹھائے ان کے چہرے کو دیکھنے لگے۔

”میں اسے جانتی ہوں، اس کے دل کے حال سے واقف ہوں، اس کے اٹھنے بیٹھنے اوڑھنے پہننے ایک ایک ادا سے واقف ہوں،

سے نکلتے ہی بہت لمبے لگے تھے کمرے کے
سانے کو ٹوٹے میں۔

”تم دونوں کیوں بیٹھے ہو یہاں، چلو جاؤ
اپنے کمرے میں احسان۔“ پرسوج نکلیں اٹھا کر
خورشید بیگم نے دیکھا تو احسان اور خالدہ کو
کمرے میں موجود پایا کر کہا۔

”اور خالدہ تجھے ایک کپ چائے بنا کر دو،
دودھ کم ڈالنا، سر میں درد گر دیا ہے عمران کی بحث
نے۔“

”جی..... جی..... امی جان۔“ ان کے بے
جان وجود میں جنبش ہوئی تھی، احسان صاحب
کے وجود کے سانے بھی چمک گئے تھے، وہ
خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور دھیرے قدم
اٹھاتے خورشید بیگم کے قریب چلے آئے، ان کے
قریب بیٹھ کر بے اختیار کی ان کے دائیں گھٹنے پر
دونوں ہاتھ رکھ دیئے، اگلے لمبے سر جھکائے نگاہ
جھکائے ان کے لبوں نے جنبش کی۔

”شکریہ امی جان، آپ نے میری بہت
بڑی مشکل اپنے سر ڈال لی۔“ آواز دھیمی سی تھی۔
”کوئی شکریہ کی ضرورت نہیں ہے، ماں
ہوں تمہاری۔“ ان کی بات سمجھتے ہوئے وہ سرسری
انداز میں بولیں۔

”ماں تو عمران کی بھی ہیں۔“ احسان
صاحب کا لہجہ کھوجتا ہوا تھا۔

”غلط بات اگر تم بھی کرو گے تو میں نہیں
مانوں گی، آج جیسے تمہارا ساتھ دیا ہے ویسے ہی
عمران کا ساتھ دو گی، زیادہ خوش فہمی دل میں
پالنے کی ضرورت نہیں۔“ بات ختم کرتے ساتھ
نئی ہلکے سے لہجے میں خوشگوار ریت کی جھلک تھی۔

”ویسے ابھی تو ماں کا ساتھ دیا ہے، میں
آپ کا یہ احسان ساری عمر نہیں بھلاؤں گا۔“

”بس بس بہت ہو گئی۔“ خورشید بیگم نے

گنیں ہیں جو آپ.....“ عمران کھلم کھلا بحث پر اتر
آئے تھے۔

”خامساں نہیں، وجہ وہ بھی ایک اور تمہیں
میں پہلے بتا چکی ہوں۔“ خورشید بیگم ابھی تک سختی
کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

”آپ احسان بھائی سے بھی تو پوچھیں۔“

”کہہ چکی ہوں تمہیں پہلے ہی تجھے ماں کے
سلسلے میں اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

خورشید بیگم کا لہجہ اٹل تھا۔

”میری اولاد بھی آپ کی کچھ لگتی ہے،

صرف ماں ہی آپ کی پوتی نہیں ہے۔“ اپنے
ہاتھوں سے کروڑوں کا خاندانی بزنس کسی ریت کی
مانند پھسلتا محسوس ہوا تو امیوشن بلیک میلنگ کا
سہارا لیا۔

”جانتی ہوں، تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں
ہے جتنا تمہاری اولاد مجھے پیاری ہے اتنا پیارا تو تم
بھی مجھ سے نہیں لے سکے۔“

”امتیازی سلوک کر رہی ہیں آپ میری

اولاد کے مقابلے میں۔“ چہرے پر بے زار کن
تاثرات لئے عمران نے جواب دیا۔

”تمہاری سوچ ہے، میں اس کا کچھ نہیں کر

سکتی۔“ خورشید بیگم کو اپنے چھوٹے بیٹے کی لاپچی
فطرت پر دل میں اسوس ہوا۔

”احسان بھائی، خالدہ بھابھی آپ بھی تو

کچھ کہیں۔“ عمران نے اپنے بھائی بھابھی کو بھی
معاملے میں گھسیٹنا چاہا۔

”جب میں نے کہہ دیا تو پھر ان سے

پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ اس سے پہلے کہ

احسان صاحب کچھ بولتے خورشید بیگم نے چہلہ

بول کر جیسے دونوں میاں بیوی کی زبانوں پر قفل

ڈالے۔

عمران اور اس کی بیوی الزبتھ کے کمرے

کیا تھا، جتنا بھی کیا آج خیال آتا ہے نہیں کرنا چاہیے تھا، اس کی خواہش ٹھیک تھی، تم نے باپ ہونے کے ناطے اس کا ساتھ دیا تھا تمہارا فرض، لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں جو شاید تمہیں نظر نہیں آرہی، میں دیکھ رہی ہوں۔“ وہ اپنے بیٹے کی لاپٹی فطرت کی جانب اشارہ کر رہی تھیں لیکن ماں تھیں ماں ہونے کے ناطے وہ دونوں اولادوں میں جھگڑا نہیں چاہتی تھیں۔

”جانتا ہوں بہت حد تک، ایسی لئے تو آپ کو کہا تھا، کہ آج کے اس فیصلے کے لئے ساری زندگی آپ کا احسان مندر ہوں گا“ ماں تو پہلے ہی انہیں عزیز تھیں، اب عزیز ترین ہو گئیں۔ ”عمران کو تمہاری بیٹی کی خواہش ہوتی بیٹے کے لئے تو مجھے ذرا بھی اعتراض نہ ہوتا، تم اس کے خلاف بھی ہوتے تو میں ماہا کا ہاتھ دے دیتی علی کے ہاتھ میں لیکن اسے ماہا کی خواہش سے زیادہ تمہارے بزنس سے ہے، آج بھی جو کچھ میں نے کہا، کوشش کی کہ سارا الزام اپنے اوپر لے لوں، تم دونوں بھائیوں کے رشتے میں ڈرار نہ آئے لیکن تم یہ بات مانو یا نا مانو فاصلے آ گئے ہیں، میری زندگی کا کچھ یہ نہیں لیکن ماہا کی زندگی کا جو بھی فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر، جہاں رشتہ کرنا بہت چھان پھنک کر، دنیا مطلبی ہے، پیسے پر ایمان تک سچ ڈالتی ہے۔“

”خدا آپ کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے، آپ کی ہمیں زندگی میں قدم قدم پر ضرورت ہے۔“

”ماہا کو اپنی زندگی میں سکھاؤ، بزنس کے تمام گر، زندگی کی تمام چالاکیوں سے بچنے کے گر، کمائی کرنے کے طریقے، اپنا حق چھٹنے کے گر، تاکہ تمہارے بعد اسے کسی دنیا کی کسی تکلیف کا سامنا کرنے میں دشواری نہ ہو، تمہارے سکھائے

بے ساختہ ٹوک دیا۔

”اور خالدہ کب سے تمہیں کہا ہے چائے بنانے کا ابھی تک یہیں کھڑی ہو میرے سر پر۔“ انہوں نے بہو کی جانب دیکھا جو قریب کھڑی ماں بیٹے کی گفتگوں سن رہی تھیں۔

”وہ..... وہ امی جان۔“ خورشید بیگم تو اپنی جانب متوجہ پا کر وہ ایک دم بوکھلا گئیں۔

”دیکھ لو اپنی بیوی کو، جو ذرا سا کام کہہ دیا وہیں..... وہ..... وہ شروع ہو گئی۔“ ان کی بوکھلاہٹ خورشید بیگم سے چھپی نہ رہ سکی، لہجہ میں ہلکی سی شرارت تھی۔

”نہیں نہیں تو..... آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“ لہجہ میں مزید در آتی بوکھلاہٹ نے خورشید بیگم کے ساتھ احسان صاحب کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

”امی جان، سچ میں امی جان ایک لمحے کو تو مجھے لگا ماہا میری نہیں آپ کی بیٹی ہو۔“ لہجہ میں ممنونیت لئے وہ خورشید بیگم کے قریب چلی آئیں، ان کا ہاتھ پکڑ کر دل کی گہرائیوں سے بولیں۔

”ہاں تو تمہیں اعتراض ہے۔“ مصنوعی خفگی سے خورشید بیگم نے بہو کے چہرے پر نگاہ کی۔

”نہیں..... بالکل نہیں، میرے سے زیادہ آپ کا حق ہے اس پر۔“ ان کی بات پر وہ خالدہ بیگم کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی اتری تھی، جواب میں خورشید بیگم نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”احسان!“

”جی امی جان۔“ وہ ہمہ تن ماں کی بات سننے کو متوجہ ہوئے۔

”تم نے جو ایک فیصلہ کیا تھا ماہا کو بزنس میں لانے کی، اس وقت میں نے زیادہ اعتراض

گی، آپ نے بھی تو عین ٹائم پر جواب دے دیا۔“ ان کی بات کا جواب دے کر خاصے شکوہ کننا انداز میں بولی۔

”مجھے معلوم ہے کہ میری بیٹی بہت اچھے سے بچ کر لے گی کل کی مینٹگ تو میں کس بات کی مینشن لوں۔“ اس مرتبہ احسان صاحب کھل کر مسکرائے۔

”پاپا دس از ناٹ فیئر۔“ ماہا احتجاجاً بولی اور قالین سے اٹھ کر صوفے پر ان کی قرب بیٹھی۔

”جب سے میری بیٹی نے بزنس میں میرا ساتھ دینا شروع کیا ہے میری تو آدمی مینشن ختم ہو گئی ہیں۔“ نخریہ انداز میں احسان صاحب نے ماہا کو دیکھا۔

”By the way یہ وہی پاپا ہیں نا جن کو میرے بزنس سکھو پر خدشات ہی خدشات تھے۔“ ابھرو چکا کر خاصی شرارتی انداز میں ماہا نے جواب دیا۔

”ہر کسی کو ہوتے ہیں گریبا، بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے، پیسہ کمانا اور اس کو سنبھالنا وہ بھی احسن طریقے سے ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔“ سادہ لیکن صاف گو لہجے میں احسان صاحب نے جواب دیا۔

”آپ کو لگا کہ میں لڑکی ہوں تو اس لئے میری Calculation ٹھیک نہیں ہو گئیں۔“ کھوجتی شکوہ کنناں لگا ہیں ماہا نے باپ کے چہرے پر ڈالیں۔

”ہا..... ہا..... بالکل نہیں، ہاں ایک انسان ہونے کے ناطے خیال رکھنا ہوتا ہے، اس کی اولاد ہو تو جس ناز سے پالا ہے ڈر ہوتا ہے۔“ احسان صاحب کا تہقہ بے ساختہ تھا۔

”اپنی اولاد سے اس کے بچنے سے۔“ ماہا نے ٹپاں سکڑیں۔

ہوئے طریقے سے اس کی زندگی کی راہ میں آنے والی تمام مشکلات کو آسانوں میں تبدیل کر دیں، آج ایک چچا ہے جس کی نظریں اس کی جائیداد پر ہیں کل کو ساری دنیا کی نظروں کا سامنا اسے کرنا ہے، چاہے جتنی جائیدادیں اس کے نام کر دو اسے سنبھالنے کا طریقہ سکھاؤ۔“ کچھ ایسا انوکھا تھا خورشید بیگم کے لہجے میں کہ دونوں میاں بیوی بہت دیر تک حیرت زدہ ان کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں گم رہے۔

”امی جان، اتنا تو ہم ماں باپ کا باہر حق نہیں جتنا آپ کا ہے، اتنا گہرائی میں تو بھی ہم میاں بیوی نے ماں کے لئے نہ سوچا جو دادی ہو کر آپ نے اپنی پوتی کی زندگی سنوارنے کو سوچ ڈالا، خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔“ احسان صاحب کی آواز میں ممنونیت تھی، انہوں نے ماں کا ہاتھ ہاتھوں میں لئے آنکھوں سے لگایا۔

☆☆☆

”کیا کر رہی ہے میری ماہا۔“ عشاء کی نماز پڑھ کر وہ اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئے تو ماہا کو فرش قالین پر نیم دراز حالت میں فائل سامنے کھولے بیٹھے دیکھا۔

”صبح مینٹگ ہے، مینٹگ آور میں ڈسکس کرنے کی پوائنٹس ریڈ کر رہی ہوں۔“ آواز پر نظر اٹھا کر احسان صاحب کو دیکھا پھر سیدھے بیٹھے ہوئے بولی۔

”خاصی رات ہو گئی ہے۔“ قریب ہی بچھے صوفے پر بیٹھے ہوئے احسان صاحب قدرے مسکرا کر بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

”ہوں، بس تھوڑا سا پیپر ورک ہے، میں نے سوچا ابھی رات سونے سے پہلے ہی پوائنٹس فائل کر لوں، صبح ایک نظر ڈال کر آکس چلی جاؤں

”نہیں دنیا کی چالاکیوں سے، دنیا بہت تیز ہے، ایک لمحے میں کمزور انسان اور اکھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔“ کھرا، شفاف، لہجہ بنا کسی جھوٹ کی لگی لپٹی لئے ماہا کو چند لمحوں کے لئے اپنی جگہ خاموش کر گیا۔

”بیٹا بھی ہوتا تب بھی آپ ایسا ہی کرتے۔“ بہت دیر بعد وہ بولی تھی، کچھ سوچتے ہوئے ایک کھوجتی سوالیہ نگاہ اس نے باپ کے چہرے پر ڈالیں۔

”شاید اتنا نہ کرتا، کیونکہ اسے تو سنبھالنا ہی ہوتا ایک نہ ایک دن اس بزنس کو۔“ جتنا گہرا سوال بیٹی کا تھا، اس سے کہیں زیادہ سادہ لہجہ باپ کا تھا۔

”اور بیٹی اس کو تو آسمان سے من و سلوٹی ملے گا۔“ وہ تنک کر طنز پر لہجے میں بولی۔

”ہا..... ہا، میری بیٹی مجھے سے کتنے شکوہ دل میں چھپائے بیٹھی ہے۔“ احسان صاحب کا دل فریب تہقہہ کمرے کی خاموش فضا کو ایک مرتبہ پھر سے چیر گیا۔

”Is fact (یہ حقیقت ہے) سچ ہے نا؟“ بیٹی کا احساس ہوتا ہے کہ کہیں کوئی تکلیف نہ مل جائے، دل کے قریب ہوتی ہے۔“ یہ کہتے ساتھ ہی انہوں نے قریب بیٹھی ماہا کے سر پر دست شفقت رکھا۔

”جی جی اندازہ ہو گیا تھا مجھے کتنی ہوں دل کے قریب، پاپا تو یہ کریں جو دادی کی نظریں مجھے ہر وقت گھورتی رہتی تھیں، تب احساس ہوتا تھا کہ دادی تو میری دادی ہیں، اُمی کی ساس کے طور پر کس قدر سخت مزاج ہوئیں۔“ اپنے بہت سے سوالوں کا جواب جو وہ اپنے دل میں بہت عرصے سے دبائے بیٹھی تھی، آج موقع ملے ہی باپ کے سامنے بیان کئے اور نسلی آمیز جواب پا کر وہ خود کو

خاصا بالکا محسوس کر رہی تھی۔

”اُمی جان تمہاری باتیں سن لیں نا تو حیرت کے جھکے لگیں انہیں۔“ احسان صاحب اس کی بات سن کر خاصے محفوظ ہوئے۔

”وہیے حیرت کی بات ہے پاپا، وہی دادی جن کو میرا براہداشت نہیں تھا آپ کے ساتھ آفس جانا، اب تو جب بھی ان سے گپ شب کا موڈ ہو تو ان کی آدمی سے زیادہ باتوں کا ٹاپک آفس سے لے کر آفس پر ختم ہوتا ہے۔“ موقع ملا تو دل میں چھپائی اور موقع کی تلاش میں آج ابھرتی باتوں کو وہ الفاظ کا روپ دیئے رہی تھی۔

”ماہا تمہاری دادی میرے سے زیادہ اس بزنس کے معاملے میں تمہاری حمایتی ہیں، یاد ہے چند سال پہلے جب عمران آیا تھا پاکستان تو تب میں شاید اس کی باتوں میں آ جاتا لیکن تمہاری دادی نے بہت جلدی سے صرف عمران کو ہی نہیں بلکہ مجھے بھی یہ باور کرا دیا تھا کہ ماہا کو بزنس کے تمام بیج و خم سکھانے ہیں۔“ احسان صاحب اس کی بات سن کر غلطے لمحے خاموش رہے کچھ سوچتے رہے پھر وہ دھیمے الفاظ اور لہجے میں بیٹی سے مخاطب ہوئے۔

”جی معلوم ہے پاپا، آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کا انداز سرسری تھا جیسے وہ اپنے باپ کی باتوں کا پہلے سے ہی علم رکھتی ہو۔

”ہیں..... کیا مطلب..... سب خبر ہے۔“ اس کی بات سن کر احسان صاحب خاصے حیران ہوئے۔

”دادی نے بتایا تھا پاپا اور..... اور بھی کچھ بتایا تھا۔“ ان کی بات کے جواب میں ماہا نے کہا اور پھر کچھ کہتے کہتے خاموش ہوئی کہ احسان صاحب چونکے۔

”وہ کیا؟“

زندگی پر بہت ہی گہرے نقش مرتب کئے تھے، نہ صرف اس کے دل و دماغ پر بلکہ اس کی تمام شخصیت کو ایک سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا دیا تھا۔

اس رات جتنی گہری سیاہ رات احسان بنگلو کے کسی بھی کمین نے اترتے نہیں دیکھی تھی، ایک گہری رات جس کی گہرائی میں ہزاروں سمندروں کی گہرائی بھی کم لگے اور ایسا سیاہ رنگ جو اماؤس کی ہزار راتوں کی تاریکی کو بھی مات دینے جائے، ماہا نے اپنی گزری زندگی میں آج تک کسی خورشید بیگم کو اتنے جلال میں نہ دیکھا تھا۔

”میں ابھی زندہ ہوں عمران۔“ خورشید بیگم کی غصیلی گرجدار آواز کمرے میں گونجی کہ کمرے میں موجود ہر فرد اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

”خدا آپ کو زندگی دے آپ کا سایہ سلامت رکھے۔“ وہ اپنی ماں کا ریکٹن دیکھ کر عمران گڑبڑائے۔

”مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی کہ تم نے یہ بات سوچی بھی کیسے اور اگر سوچ میں بھی آگئی تو اپنی زبان سے یہ بات نکالتے وقت تمہارے ہوش کہاں گئے۔“ خورشید بیگم نے ملاستی نگاہ اپنے چھوٹے بیٹے پر ڈالی۔

”امی جان، میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا، میں نے تو ایک تجویز دی تھی۔“ معاملے کی نزاکت کو چاہتے ہوئے عمران نے اپنی ماں کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

”اپنی تجویز اپنے پاس رکھو، بہت اچھی طرح جانتی ہوں تمہارے مطلب کو۔“ یک دم ہی عمران کو اپنی ماں ایک ایسی چٹان کی مانند دکھائی دیں جسے پار کرنا ناممکن تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ خامے دھسے لہجے میں بولے، اس وقت ماحول اور

”انہوں نے کہا تھا بلکہ وہ کہتی رہتی ہیں کہ کبھی بھی کوئی روپے پیسے کا لین دین ہو تو اپنے باپ کے علاوہ اپنی سناٹا، نہ صرف دل بلکہ دماغ دونوں کو ملا کر فیصلہ کرنا، اس کے علاوہ کوئی بھی کہے کسی بھی document کو بنا پڑھے سائن نہیں کرنے، چاہے وہ عمران چچا بھی کہیں اور وہ خود بھی کہیں تب بھی نہیں، بزنس کی دنیا میں اعتبار بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔“ احسان صاحب اس کی بات سن کر رنگت ہو گئے، ماہا کی بات پر نہیں بلکہ اپنی ماں کی دور اندیشی اور حقیقت پسندی پر، وہ اپنی ماں کی اپنی بیٹی پر محبت کا قرض ساری عمر نہیں چکا سکتے تھے۔

☆☆☆

زندگی اپنی تلخ حقیقتوں سمیت بہت تیزی سے بدلی تھی، خوشیوں نے یک دم ہی تلخ سرد فضاؤں کے تلے آکر اپنے رنگ بھال لئے تھے، ایک رات احسان صاحب کو بازو میں درد اٹھا تو عین دل تک آکر دل کی دھڑکن ٹھہرا گیا، احسان بنگلو پر جیسے سانے کا گمان تھا، خالدہ بیگم نے اپنے شوہر کا سہارا کھویا تھا تو خورشید بیگم نے اپنے بڑے بیٹے کی جدائی دیکھی تھی، ماہا کے لئے تو یقین اور بے یقینی کے درمیان سفر بہت دشوار تھا، باپ ہی نہیں کھویا تھا، باپ کی صورت میں ایک دوست ایک کو لیک ایک رہنما کھویا تھا، اس دنیا کی کڑی دھوپ میں وہ تنہا کھڑی رہ گئی تھی جس کھڑی کے بارے میں اس نے بھی سوچا ہی نہیں تھا، اس کھڑی کی سختی کو اپنے وجود اپنے دل پر سہنا کتنا کھن تھا۔

ابھی تو وہ اپنے باپ کی جدائی کو ٹھیک سے بردہ بھی نہیں پائی تھی کہ زندگی نے بڑی تیزی سے رخ بدلا، ایک اور رخ جس نے اس کی آنے والی

حالت و واقعات کا تقاضا تھا کہ مصلحت سے کام لیا جائے۔

”غلط فہمی مجھے نہیں، خوش فہمی تمہیں ہوئی ہے کہ تم اپنی گھٹیا خواہش کو زبان سے ادا کرو گے اور میں خوشی خوشی قبول کر لوں گی۔“ خورشید بیگم کی چھٹی حس نے انہیں انجانے وقت کی تلخیوں کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔

”آپ ٹھیک نہیں کر رہیں۔“ ہلکا سا احتجاج عمران کے لہجے میں تھا۔

”امی جان، عمران بھی آپ کے ہی بیٹے ہیں۔“ پہلی مرتبہ الزبتھ نے مداخلت کرنا چاہی۔
”تم خاموش رہو، تمہیں ہمارے خاندانی معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ خورشید بیگم نے دو ٹوک انداز و الفاظ میں انہیں ان کی اوقات بتا دی۔

”امی جان، خالدہ بھابھی بولیں تو انہیں حق ہے کہنے کا، اور الزبتھ بولے تو اسے روک دیا جاتا ہے۔“ جواب عمران نے دیا تھا، ویسے بھی انہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا تھا کہ خالدہ بیگم کو خاندانی معاملات میں ان کی بیگم سے زیادہ بولنے کا حق ہے۔

”خالدہ کچھ نہیں بولی آج نکس، میرے کئے فیصلوں میں آج تک اس نے کبھی بھی اعتراض نہیں کیا اور مت بھولو عمران، خالدہ تمہاری بھابھی ہے، اس بھائی کی بیوی جس نے تمہیں چھوٹے بھائی سے بڑھ کر بیٹوں جیسا پیار دیا ہے۔“ اس مرتبہ خالدہ بیگم کے انداز میں قدرے بے بسی کی ریش تھی، وہ کبچہ چکی تھیں کہ پانی سر پہ سے گزر چکا ہے۔

”بھئی بزنس اور لین دین میں تو انہوں نے میری بات کو اہمیت نہیں دی، ہمیشہ مجھے بے گانوں اجنبیوں کی طرح کا سلوک کیا، میرا قصور

کیا تھا کہ میں یو کے چلا گیا اور وہاں شادی کیا کر لی آپ سب نے تو مجھے بیگانہ بنا دیا۔“ انداز جلا کٹا تھا، احسان آج جسے اگلے پچھلے تمام حساب کھاتے کھولنے پر آمادہ تھا۔

”بیگانہ ہم نے نہیں تمہاری حرکتوں نے بنایا ہے، احسان نے تو ہمیشہ تمہیں کہا کہ واپس پاکستان اور اپنا بزنس سنبھالو، تم ہی انکار کرتے رہے۔“

”اور انہوں نے بزنس اتھارٹی ماپا کے نام سوپ دی۔“ بحث جیسے طول پکڑنے کی سعی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ۔

”ظاہر ہے اس کی اولاد ہے اچھا بھلا بڑا سوچنا اس کا حق تھا، فرض تھا اس کا اپنی اولاد کا احساس کرتا۔“

”میں نے علی کا رشتہ کرنا چاہا ماپا سے تو مجھے انکار کر دیا۔“ احسان کے لہجے میں شکوہ کی ریش تھی۔

”اس نے نہیں، میں نے کیا تھا۔“ دوبدو جواب آیا۔

”ایک ہی بات ہے۔“ چند ٹاپے کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔

”ایک بات نہیں ہے۔“ قدرے دھمے انداز میں سر جھکائے لہجے میں تنگی لئے احسان صاحب نے جواب دیا۔

”اپنے دل سے پوچھو، تم دل سے ماپا کو اپنی بیٹی کا درجہ دینا چاہتے تو تمہارے فیصلے میں میں تمہارا ساتھ دیتی۔“ سیدھا دو ٹوک انداز میں خورشید بیگم نے بات کی تھی، جو عمران کے دل کو آری کی مانند کاٹتی چلی گئی۔

”امی جان آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔“ عمران نے تڑپ کر شکوہ کناں انداز میں ماں کی جانب نظر کی۔

”وہ کل کی بچی جسے بزنس کی جمع تفریق کی خبر نہیں پراٹ لاس کی کیا سمجھ ہوگی۔“ طنز یہ اور استہزاء یہ انداز میں عمران کو بایا ہوئے۔
 ”یہ تمہاری درد سہی نہیں ہے۔“ خورشید بیکم کا لہجہ بنور زخ تھا۔

”امی جان آپ زیادتی کر رہی ہیں۔“
 ”تمہارے اکاؤنٹ میں پیسہ اسی طرح ٹرانسفر ہو جایا کرے گا سال کے سال جیسا احسان کی زندگی میں ہوتا تھا، لیکن تمہیں بزنس میں انوالو ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اگر تمہیں اب بھی یہ خیال ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی ہے تو تم بزنس میں اپنا شیئر الگ کر سکتے ہو۔“

”میرے خیال میں اس سے زیادہ اس بزنس کے ٹاپک پر بحث فضول ہے اور امید کرنی ہوں عمران بیٹے کے میری بات سمجھ میں آگئی ہو گی، آئندہ اس موضوع پر بات نہ ہی ہو تو بہتر ہے کیونکہ اس کا کوئی فائدہ ہیں ہے۔“

”ہاں ایک اور بات کہ اگر تم اسے شیئر الگ کرنا چاہتے ہو تو اس کے لئے تمہیں اگلے پراٹ تک کا انتظار کرنا پڑے گا، یعنی کہ دس ماہ سے پہلے یہ ممکن نہیں ہے۔“

”میں کورٹ کے ذریعے لے سکتا ہوں۔“
 عمران دھمکی آمیز لہجے میں بولے۔

”میرا خیال ہے کہ کورٹ جانے سے پہلے تمہیں وہ لیگل ایگریمنٹ پڑھنا ضروری ہے جس میں صاف الفاظ میں درج ہے کہ تم اپنا شیئر بیکم تو کسی بھی وقت کر سکتے ہو لیکن اس کی ٹرانسفر یا ہولڈنگ کے لئے تمہیں سال کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”امی جان آپ کو لگتا ہے جو آپ کر رہی ہیں ٹھیک کر رہی ہیں؟“ خورشید بیکم کی بات پر

”تم نے جو کہنا ہے کہو، جو سمجھنا ہے سمجھو لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو میرے جیتے جی اس پراپٹی کا ہزارہ نہیں ہوگا، یہ میرا گھر ہے مجھے رہنا ہے یہاں۔“ اس مرتبہ خورشید بیکم کے لہجے میں سختی تھی لیکن حد درجہ یاسیت کھلی ہوئی تھی۔
 ”امی جان مجھے بزنس میں کافی نقصان ہوا ہے۔“ اپنی بات منوانے کے لئے ایک اور ایموشنل بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا لیکن جواب میں عمران کو یہی منہ کی کھائی پڑی۔

”اگر اس بزنس کی بات کر رہے ہو جو تمہارے اور احسان کے شیئر زپر ہے تو میرے علم میں سارا کھاتا ہے، اپنے مرنے سے پہلے ایک ماہ پہلے ہی اس نے پراٹ کا پینتیس فیصد تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کر لیا تھا، میرے پاس اس چیک کی تمام رسیدیں فوٹو کاپی موجود ہیں اور اسے مرے ہوئے ابھی دو ماہ ہوئے ہیں۔ یعنی اگلے دس ماہ تک تو تمہیں اس بزنس کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔“ خورشید بیکم کا لہجہ دو ٹوک تھا، عمران اور احسان کو جنم دیا تھا مال پوس کر بڑا کیا تھا۔

”کیوں نہیں فکر ہونی چاہیے بزنس ہے میرا انویسٹ ہے میری۔“ اس مرتبہ عمران بھی اپنی آواز کو اونچا ہونے سے روک نہیں پائے۔

”یہ فکر احسان کی زندگی میں کیوں نہیں ہوئی، انویسٹ تو پہلے بھی تھی جب احسان کہتا تھا کہ آکر بزنس میں ساتھ دو۔“ خورشید بیکم بھی بحث کے موڈ میں میدان میں اتر ہی ہوئی تھیں، وہ ہرگز بیٹے کے غلط عزائم کی تکمیل کی حمایت میں نہیں تھیں۔

”تب بھائی حیات تھے، اب نہیں ہے۔“
 صاف کورا جواب آیا۔

”اس کی بیٹی ہے بزنس سنبھالنے کو۔“
 جواب اس سے کہیں زیادہ سیدھا اور کھرا تھا۔

عمران قدرے زچ ہو کر بولے۔

حلقے میں لئے رونے کی شدت میں اضافہ کر گئی۔

”تم نے ہی ضد لگائی تھی تاہیں سیکھنے کی،

اس نے تو کہا میں نے بھی مخالفت کی تھی، یاد ہے

یا وہ بھی بھول گیا۔“ وہ چپکارتے ہوئے اس کے

بال سہلاتے ہوئے بولیں۔

”یاد ہے دادی، لیکن ایسے تو نہیں سوچا تھا

میں نے۔“ بہت دیر بعد دادی کے گلے لگ کر

رونے سے جی ہلکا ہوا تو ان سے الگ ہو کر قریب

ہی بستر پر ان کے بیٹھنے کو جگہ بتائی۔

”کوئی بھی ایسا نہیں سوچتا، کسی کا دل

نہیں کرتا کہ وہ اپنے لئے برا سوچے، لیکن ہو جاتا

ہے قسمت میں جو لکھا ہو ہو جاتا ہے، اسے ہونا ہی

ہوتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ قسمت کو دوش

دیے کر رونا بیٹھنا چاہو۔“ ماہا کے قریب بیٹھی اس

کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے سہلاتے

ہوئے بولیں، ان کے بڑے بیٹے کی نشانی ان

کے دل کے قریب تھی، ان کی جان از عزیز پوتی

جس کے بارے میں ان کے بیٹے کی فکر ہوتی

تھی۔

”آپ میں ہمت ہے مجھ میں آپ جتنی

ہمت نہیں ہے کرنی پڑتی ہے ماہم، تم نے ہی باپ

نہیں کھویا میں نے بھی بیٹا کھویا ہے، لیکن اس کا یہ

مطلب نہیں کہ ہوش بھی کھودینے ہیں۔“ جواب

میں وہ ان کی چادر کے پلو کو چہرے پر ڈالے

خاموش رہی۔

دروازہ کھولے خالدہ بیگم داخل ہوئیں اور

دادی پوتی کو روتے دیکھ کر ایک طرف پھٹی کرسی

پر بیٹھ گئیں۔

”تم نے باپ سے بڑنس سیکھنے کی ضد کی تھی

تو یہی دلائل دیئے تھے، تمہارے باپ نے

تمہاری ضد کے آگے گھٹنے ٹیکے تو بھی اسے تمہاری

دلیل نے یہ کرنے پر مجبور کیا اور تمہیں پتہ ہے کہ

”اگر ٹھیک نہیں کر رہی تو مجھے اس رب کی

ذات پر بھروسہ ہے کہ غلط بھی نہیں ہے، اپنی

دونوں اولادوں میں اس وقت احسان کی اولاد کو

میری زیادہ ضرورت ہے، خدا تمہیں اور تمہاری

بیوی بچوں کو صحت تندرستی اور خوشحالی کی زندگی عطا

کرے، تم اپنے بچوں کے سر پر سائبان ہو، ماہا کو

میری ضرورت ہے اور زندگی کے اس موڑ پر اگر

میرا بیٹا بھی میرے فیصلوں اصولوں کے خلاف ہو

جائے تو بھی اس کڑے وقت میں، میں ماہا اور

خالدہ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی، ماہا میرے بیٹے

کی آخری نشانی اور میری ذمہ داری ہے۔“

”اب مجھے آرام کرنا ہے اس لئے۔“ دو

لوک لہجے میں کہتے ساتھ ہی خورشید بیگم نے

لشت برخواست کا مژدہ سنایا۔

☆☆☆

شام میں خورشید بیگم ماہا کے کمرے میں

موجود تھیں۔

”دادی جان۔“ آنکھوں میں آنسوؤں کا

جہاں لئے ماہا نے انہیں نظر اٹھا کر دیکھا۔

”یہ کیا رونا دھونا مچایا ہے۔“

”مجھے ابو بہت یاد آ رہے ہیں۔“ کمرے کی

لائٹ آن ہونے پر لحاف میں سے سر نکال کر

دادی کا چہرہ دیکھا، متورم نگاہوں سمیت ابھی

حالت خورشید بیگم کا دل ہولا۔

”جو یاد آ رہا ہے اس کو اپنی یاد تک محدود

رکھو، جو نظر کے سامنے حقیقت بن کر کھڑا ہے

اسے تسلیم کرو، نہیں تو یہ دنیا چل دے گی۔“

قریب آ کر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے سر پر

ہاتھ پھیرا۔

”دادی، کیسے بھول جاؤں ابو کو ابھی مہینہ

ہی تو ہوا ہے۔“ وہ ان کے وجود کو بانہوں کے

سب سے زیادہ میں نے شروع میں مخالفت کی تھی لیکن تمہارے اور تمہارے باپ کے دلائل نے مجھے بھی اپنی سوچ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا، یہ سب کچھ رب کے حکم سے آج کے دن کے لئے تھا۔“
خورشید بیگم کا لہجہ اور انداز دونوں مدبرانہ تھے، یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں، بہت دیر خاموشی کے بعد خورشید بیگم نے ماہا کو اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا۔

”دادی۔“ وہ ان کا ہاتھ پکڑے پھر سے بری طرح باپ کو یاد کرتے رودی۔
”ہمت حوصلہ کرو، اس طرح روگی تو تمہارے باپ کی روح کو بھی تکلیف ہوگی۔“
”خالدہ، اٹھاؤ اس کو کچرے تبدیل کر دو، اور کچھ کھانے کے لئے لاؤ، بلکہ میرے لئے بھی ساتھ میں چائے کا کپ بنا لاؤ، ماہا کے ساتھ مل کر باتیں کرنے کو دل ہے۔“ ماہا کا ہاتھ تھکتے ہوئے وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولیں ساتھ میں خالده بیگم کو بولیں۔

”جی امی جان۔“ وہ پکاریں۔

”اور تم بھی اپنا حلیہ درست کرو، جو زندہ ہیں ان کے لئے زندہ رہنا ہے زندوں کی طرح۔“ ناصحانہ انداز میں انہوں نے اپنی بہو کو بھی حوصلہ دیا تھا، خالده بیگم کی آنکھیں بھی نم تھیں، شوہر کی جدائی کا دکھ ابھی نیا تھا۔
”خالده، سنبھالو خود کو اور بچی کو بھی۔“
حوصلہ تو شاید خورشید بیگم میں بھی اتنا نہیں تھا، جوان بیٹے کو گھویا تھا جو نہایت فرمانبردار تھا لیکن انہیں حوصلہ کرنا پڑا تھا۔

”چائے لاؤ گی میرے لئے یا احسان کے جانے کے بعد اب میرا بھی خیال نہیں۔“
”آپ کا ہی تو خیال ہے امی جان، آپ کا سایہ ہم دونوں کے سروں پر سلامت رکھے،

احسان کے بعد ہم دونوں کو آپ نے جس طرح سنبھالا ہے میری سگی ماں بھی زندہ ہوتی تو نہ کر پاتی، احسان ہے آپ کا ہم دونوں ماں بیٹی کی ذات پر۔“ خالده بیگم اپنی آنکھوں سے گالوں پر اترے آنسو ڈپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے بولیں۔

”ایک طرف سگی ماں سے بوار تہ دیتی ہو اور دوسری طرف بیگم کی باتیں کرتی ہو۔“ لہجے میں خاصی بشارت لئے وہ خالده بیگم کو دیکھتے بولیں۔

”نہیں امی جان ایسا نہیں ہے، احسان کے بعد آپ ہی کا تو سہارا ہے۔“ خالده بیگم لہجے میں سادگی لئے بولیں۔

”سہارا رب کی بابرکت ذات کو زیب دیتا ہے۔“ دھیمے انداز میں کہتے ہوئے انہوں نے ماہا کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

☆☆☆

زندگی بڑی تیزی سے آگے بڑھی تھی، چند سال کا فاصلہ بڑی تیزی سے سمٹا تھا۔

”بیٹا کیسی ہو؟“

”السلام علیکم دادی جان، کیسی ہیں آپ؟“ خوش باش انداز میں ماہا نے دادی کو جواب دیا، کندھے پر دھرا بیگم اس نے ہال میں صوفے پر رکھا، وہ آئس سے لونی تھی۔

”میں تو ٹھیک ہوں تم اپنی سناؤ بہت مصروف ہو گئی ہو کہ اب تو دادی کے لئے بھی ٹائم نہیں ملتا۔“ خورشید بیگم نے پوتی کے سارے دن کے تھکے چہرے پر نگاہ ڈالی اور ہلکے سے شکوہ کیا۔
”نہیں ایسی بات نہیں ہے آپ کے لئے تو ہر وقت ٹائم ہی ٹائم ہے۔“ وہ ان کے قریب چلی آئی اور تخت پوش پر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
”ہاں وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں اور جانتی

زندگی میں آگیا، اتنا جلدی نہیں آنا چاہیے تھا، احسان زندہ ہوتا تو کبھی بھی تمہیں یہ سب نہ کرنے دیتا۔“

”دادی Tention not اپنی بہو کے ہاتھوں کی زیر دست قسم کی مڑے کی چائے نوش فرمائیے اور دعائیں دیجئے۔“ اس مرتبہ وہ قدرے ہلکھلائی تھی۔

”دادی کی بہو تمہاری بھی رشتہ دار ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے مصنوعی انداز میں گھر کا۔

”اچھا نئی اطلاع ہے، میرا خیال تھا میرے پاپا کی وائف ہیں۔“ ایک قہقہہ گونجا تھا، ماما کا گھرے میں جواب میں خورشید بیگم اور خالدہ بیگم بھی مسکرائیں۔

☆☆☆

”آئیے تشریف لائیں فاطمہ صاحب۔“ فاطمہ کی آفس ڈور کھول کر اندر آتے دیکھا تو چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

”جی میڈم۔“ جواب میں قدرے مسکرا کر فاطمہ بولا۔

”تشریف رکھیے۔“ یہ کہتے ساتھ ہی اس نے کھڑے فاطمہ کو آفس ٹیبل پر دوسری جانب بچھی کر سیڑی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی میڈم۔“ یہ کہتے ساتھ ہی وہ کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

”کیسا لگا آپ کو آفس؟“ ماما نے بات کی شروعات کی۔

”جی بہت اچھا۔“ جواب مختصر سا جملہ بولا۔

”آئی ہو پ کہ آپ کو اکمل صاحب نے

کام اچھی طرح سمجھا دیا۔“ ماما نے اس کی بات

کے جواب میں بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جی میڈم، انہوں نے تمام فائلز ریڈ بھی

ہوں کہ کتنا ٹائم نکال پاتی ہو میرے لئے۔“ اس کے کندھے کو سہلاتے ہوئے بے ساختہ ہی وہ انہیں احسان صاحب کی یاد دلا گئی۔

”طنز کر رہی ہیں۔“ شرارتی انداز میں دادی کی جانب دیکھا۔

”نہیں یاد دل رہی ہوں کہ یاد کرو کتنے دن

ہو گئے ہیں دادی کے ساتھ چائے پیئے۔“ ان

کے بیٹے کی اولاد دھمی، اپنے نقش سمیت بہت سے

انداز میں اپنے باپ سے چرا لائی تھی۔

”کہاں اٹھ کے چل دیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی کہ خورشید بیگم بولیں۔

”ہاں، چائے بنانے جا رہی ہوں، چائے

پینے کے بعد بتاؤں گی کہ کب پی ہے چائے آپ

کے ساتھ۔“ مسکراتے ہوئے وہ بولی۔

”شری، واپس آؤ، تمہاری ماں بنا رہی ہے

چائے لے آئی ہے، تم بیٹھو میرے پاس۔“ انہوں

نے ہنستے ہوئے اسے دوبارہ واپس بلایا تو وہ

واپس چلی آئی۔

”یہ بالوں کا کیا حال کیا ہوا ہے، کتنے دن

ہو گئے ہیں تیل لگائے۔“ اپنے قریب بیٹھی ماما

کے بالوں کو ہاتھوں سے چھوتے ہوئے بولیں،

بال خاصے کمر درے ہو رہے تھے۔

”دادی پچھلے ماہ لگایا تھا، ٹائم ہی نہیں ملتا

آفس سے آنے کے بعد تنگی ہوتی ہوں تو سونے

کی جلدی کرتی ہوں۔“ جواب میں وہ دادی کو

تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔

”ہاں چھوٹی عمر میں بہت بڑی ذمہ داری

کندھوں پر آ گئی ہے۔“ خورشید بیگم ٹھنڈی سانس

سننے سے خارج کیے بولیں۔

”دادی ایک نہ ایک دن تو کرنا ہی تھا مجھے

یہ سب کام۔“ وہ مسکرائی۔

”لیکن وہ دن بہت جلدی میری بیٹی کی

”میڈم!“

”جی فاطر صاحب کیسے اس وقت خیریت سے فون کیا۔“ سر دیوں کی راتوں میں آدمی رات کو موہاں کی بیل رنگ اسے ڈراگئی، وہ اپنی جگہ سے اٹھلی۔

”میڈم مجھے آپ سے Urgent ملنا ہے۔“ دوسری جانب فاطر تھا۔

”صبح آفس میں ملاقات ہو جائے گی۔“ اس نے سامنے دیوار پر ہنگی گھڑی کی سوئیوں کو ساڑھے بارہ بجاتے دیکھا پھر بولی۔

”نہیں میڈم، صبح کا ویت نہیں کیا جاسکتا۔“ فاطر کا لہجہ خاصا پر اسرار تھا۔

”جی بتائیے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ وہ اچنبھے سے بولی۔

”اس وقت ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”کچھ بتائیں گے کہ کیا بات ہوئی ہے جو اسی وقت۔“ اس کی پر اسرار سی باتوں نے ماہا کو خاصا الجھا دیا تھا۔

”ملنے پر ہٹاؤں گا۔“ هنوز مطالبہ تھا۔

”میں آپ کے گھر آ جاؤں۔“ جواب میں فاطر نے اجازت طلب کی۔

”ہوں ٹھیک ہے۔“ کچھ دیر بعد ماہا نے جواب دیا۔

”میں پندرہ منٹ میں آرہا ہوں۔“ یہ کہتے ساتھ ہی فاطر نے کال منقطع کر دی، ماہا عجیب سے شش و پنج میں گرفتار تھی۔

”خیریت تو ہے نا فاطر صاحب۔“ ٹھیک پندرہ منٹ میں وہ احسان بنگلو موجود تھا، ہال میں بیٹھے اس نے ایک فائل ماہا کی نظروں کے سامنے کی، ماہا نے فائل کھولی تو کافی کاغذات تھے جن پر ایک چیک بھی لگا ہوا تھا۔

”کروادیں تھیں یو کے جانے سے پہلے۔“ فاطر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اگر کوئی مسئلہ ہو تو آپ احسن صاحب سے پوچھ سکتے ہیں، وہ ہماری کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں اور آفس کا تمام Clerikal ورک بھی وہی بہتر جانتے ہیں۔“ کچھ سوچتے ہوئے ماہا نے اگلی بات کی تھی۔

”جی میڈم۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ماہا دوبارہ بولنا شروع ہوئی۔

”اگل صاحب تو فی الحال دو ماہ کے لئے گئے ہیں ہمارے یو کے آفس، کچھ پرائیویٹس کے ایگریمنٹ تھے، میں کچھ پرسنل اسٹور کی وجہ سے جانی نہیں سکی تو انہیں بھیج دیا، دو ماہ کے لئے ہم ان کی جگہ کوئی اور Employee ہاڑ کرنا چاہ رہے تھے کہ انہوں نے آپ کا ذکر کیا تو میں نے ہی انہیں آفر کی کہ آپ کو وہی دو ماہ کے لئے اپنی جگہ پر Replace کر لیں۔“ اتنا کہہ کر وہ رکی اور فاطر کے چہرے کی جانب جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

”جی انشاء اللہ کوشش کروں گا کہ تمام آفس ورک احسن طریقے سے پورا کر سکوں اور آپکو ابو جی کی کمی کا احساس نہ ہو۔“ دھیمے انداز میں فاطر نے تلے الفاظ میں بولا۔

”انشاء اللہ ٹھیک ہے پھر ملاقات ہوتی ہے۔“ یہ کہتے ساتھ ہی ماہا نے گفتگو کا اختتام کیا۔

”جی۔“ فاطر کرسی کھسکا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور آفس سے باہر چلا گیا۔

بہت دیر تک وہ اس سحر سے نکل نہیں پائی تھی، کچھ تو تھا اس نے انداز میں جس نے اس کے دل کی بیٹ کو مس کیا تھا، کچھ ایسا انجانا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے بھی آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

”اتنی بڑی بات، وہ بھی چچا جان، مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔“ ماہا نے اپنے دل کی آواز کو الفاظ کا روپ دیا۔

”اس کی ماں ہوں، فطرت سے واقف ہوں، یہ سب ہونا تھا، لیکن اس طرح۔۔۔ میں نے سوچا نہ تھا، بہر حال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے صبح اٹھتے ہی اس چیک کی منت رکھاؤ۔“

”وہ فاطمہ نے پہلے ہی روک دی ہے، بتا کے جو گیا ہے آپ کے سامنے۔“

”فاطمہ کو رب نے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“ بے ساختہ ہی خورشید بیگم نے کہا تو ان کی بات سن کر وہ بھی تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”ہوں مختی ہے دادی ابھی ڈیڑھ ماہ ہوئے ہیں آفس جوائن کئے۔“ اس کی تعریف میں ماہا سرسری انداز میں بولیں۔

”اکمل خان کا بیٹا ہے نا؟“ خورشید بیگم نے پوچھا۔

”جی دادی جان۔“ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو گئی جس کا احساس ماہا کو ہوا نہ نہیں ہوا البتہ وہ مسکراہٹ خورشید بیگم کی جہان دیدہ نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

☆☆☆

اکمل صاحب واپس پاکستان آ چکے تھے، خورشید بیگم کے بلاؤے پر احسان بنگلو آئے۔
”مجھے علم ہوا تھا تمام واقعہ کا۔“ خورشید بیگم نے ان کی بات سننے کے بعد فقط اتنا کہا۔
”میں نے احسان صاحب کے ساتھ پچیس

”یہ چیک۔“

”آپ نے سائن کیا؟“

”نہیں تو مجھے یاد نہیں پڑتا، 25 لاکھ کا

چیک، آپ کو کہاں سے ملا۔“

”یو کے سے عمران صاحب نے بھجوایا، آج صبح بینک سے کال بھی کنفریشن کے لئے۔“

”تو آپ نے اسی وقت مجھے بتایا کیوں نہیں۔“

”میں نے خود کنفرم کرنا چاہا تھا، کیونکہ آج تک کمپنی کے نام پر جو بھی چیک سائن ہوتے ہیں ابو جان نے بتایا ہوا کہ وہ آپ کمپنی کے علم میں لائے بنا نہیں کریں اور پچھلے ڈیڑھ ماہ سے میں بھی یہیں کام کر رہا ہوں یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ آپ کا سائن کیا چیک ڈائریکٹ بینک گیا، منیجر صاحب کنفر کرنا چاہ رہے تھے۔“

”دادی جان!“ ماہا نے کمرے میں داخل ہوتی خورشید بیگم کو دیکھا، وہ فاطمہ کی باتیں سن چکی تھیں۔

”سن لیا ہے میں نے سب۔“ فاطمہ کے جانے کے بعد ماہا خورشید بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ ماہا پریشان ہوئی اور پریشان ہونا بھی فطری عمل تھا۔

”پریشان نہیں ہو، جاؤ آرام کرو، بہت رات ہو گئی ہے۔“ انہوں نے تسلی آمیز لہجے میں ماہا سے بولیں۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ ماہا سوالیہ انداز میں انہیں دیکھ کر بولی۔

”جو بھی کرنا ہے، اس وقت آدمی رات کو تو کرنے سے رہے، سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے، ایسے فیصلے کرنے کے لئے جلد بازی نہیں کرتے۔“ اپنی چادر کا پلوٹھیک کرتے ہوئے وہ

اندازہ لگا کر دیکھ لیجئے۔“ ہونٹوں پر مشفقانہ سی مسکراہٹ سجائے انہوں نے قریب بیٹھی ماما کے ہاتھ میں پکڑی فائل میں سے کینسل چیک نکالا اور ان کی نظروں کے سامنے بیل پر رکھ دیا۔

”پچیس لاکھ کا چیک تھا، اگر یہ کیش ہو جاتا تو نقصان احسان کی کمپنی کا تھا، آپ اور آپ کے بیٹے کی دیانت داری کی وجہ سے وہ لاس نہیں ہوا، اس سے بہتر انداز میں پیسہ لوٹانے کا کوئی بھی طریقہ اس دنیا میں میں نے نہیں دیکھا۔“ ہنوز مسکراہٹ خورشید بیگم کے ہونٹوں پر قصاں تھی۔

”یو میرا فرض تھا۔“ اکمل صاحب عاجزی سے بولے۔

”آئندہ آپ اس پیسے کو دوبارہ لوٹانے کی بات نہیں کریں گے وہ آپ نے لوٹا دیا ہے۔“ اس مرتبہ خورشید بیگم کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

”لیکن.....“ انہوں نے کہنا چاہا لیکن خورشید بیگم نے انہیں کہنے سے روک دیا۔

”کہہ جو دیا، اس سلسلے میں دوبارہ بات نہیں ہوگی، اس کے علاوہ ایک اور بات ضروری تھی جس کی خاطر میں نے آج آپ کو زحمت دی۔“

”جی کہیے میں سن رہا ہوں۔“ وہ فرمانبرداری سے بولے۔

”یہاں پاکستان میں احسان کے آفس میں آپ کی جگہ اور اہمیت وہی ہے جو پہلے تھی، ہاں لیکن آپ کے بیٹے کے لئے بھی ہمارے آفس کے در کھلے ہیں، آپ کی جگہ پر جو چند ماہ کے لئے آپ کے بیٹے نے کام کا ذمہ لیا تھا، وہ اب بھی اسی طرح ہے اپنی جاب جاری رکھ سکتا ہے، ماما کل ہی آفس جا کر آپ کے بیٹے کا Oppointment letter اشوکروادے گی۔“ یہ کہتے ساتھ ہی انہوں نے ماما کی جانب دیکھا تو ماما نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

سال گزارے ہیں، تمام بزنس ڈیل فائل کرتے وقت خاص مجھ سے پوچھتے تھے، ابھی سوچا بھی نہیں کہ ان کے ساتھ دغا کروں گا۔“ وہ بچے تلے انداز میں بولے، لہجے میں انکساری تھی۔

”آپ کی احسان مندی ہے اکمل صاحب۔“ خورشید بیگم نرم لہجے میں بولیں۔

اس واقعہ کے بعد وہ دل سے اکمل صاحب کی دنیا داری کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔

”نہیں احسان تو میرے کندھوں پر تھا، جس کا بوجھ میں اتنے سالوں سے لئے پھر رہا تھا، میرے بیٹے کی انیورکیشن کا ذمہ انہوں نے لیا تھا، میرے حالات تب ٹھیک نہیں تھے، انہوں نے میری پریشانی بھانپ لی تھی، تب انہوں نے میری سیکری بڑھانی جانی، اسی دوران یو کے کی براچ میں ایک کامیاب ڈیل کے کریڈٹ میں بولس کے طور پر انہوں نے مجھے دس لاکھ کا چیک دیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ وہ اسی بہانے میری مدد کرنا چاہ رہے ہیں، میں نے انہیں صاف الفاظ میں کہا تھا کہ یہ پیسے انہیں واپس لوٹاؤں گا اس تمام رقم سمیت جو کہ اتنے سالوں سے Devaluate ہو گئی ہوگی، ایک مرتبہ لوٹانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کہا ابھی وقت نہیں آیا، جب وقت آئے گا تو تب خود سے ہی وہ پیسے واپس کرنے کو کہیں گے، وہ مٹی تلے جادے اور میں انتظار کرتا ہی رہ گیا۔“ وہ بات کرنا شروع ہوئے تو کرتے ہی چلے گئے، بہت سے رازوں سے پردہ اٹھاتے چلے گئے جو ان کے اور احسان صاحب کے درمیان تھے۔

”نہیں اکمل صاحب آپ نے تو وہ پیسہ بمعہ سود کے لوٹایا ہے۔“ ان کی نفسیلا گفتگو کے جواب میں خورشید بیگم نرم انداز میں مسکرائیں۔

”ماں ہوں احسان کی، سچ بول رہی ہوں،

سنو جو میں کہہ رہی ہوں۔“
 ”سننا کانوں سے ہے۔“ ہنوز انداز میں
 ماہا نے جواب دیا۔

”دماغ میں بھی تو سنی بات کو گھسانا ہے۔“
 ”آپ بولیں۔“ دانتوں تلے ہال پین
 دبائے بولی۔

”تمہاری دادی کو بھی خواہش ہے کہ اب تم
 اپنے گھر کی ہو جاؤ۔“ ہلکا گلابی کیوں والا سوٹ
 نکال کر وارڈروب کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ
 بولیں۔

”پھر وہی مرخے کی ایک ٹانگ، ان کی تو
 عادت ہے کبھی میرے لئے ایک خواہش دل میں
 پال لیتی ہیں اور پھر اگلی.....“ لچھ کر اس نے فائل
 بند کر کے بیڈ پر پٹی اور سیدھا ہو کر اٹھ بیٹھی۔

”شرم کرو دادی ہیں تمہاری۔“ خالدہ بیگم
 نے گھر کا۔

”اسی لئے تو لحاظ ہے نا۔“
 ”تمہارا باپ کم تھا جواب دادی نے اتنی
 ڈھیل دے دی ہے، میری بات تو مانو گی نہیں وہی
 تم سے بات کریں گیں۔“

”خدا کا نام لیں، اب دادی سے نہ ذکر
 کیجئے گا، جو بھی معاملہ ہے اسے بس اسی جگہ پر،
 میرے سامنے دن کر کے کمرے سے نکلیں۔“

”تمہاری دادی نے ہی ذکر کیا ہے، تمہاری
 اطلاع کے لئے عرض ہے اور انہوں نے ہی مجھے
 سمجھایا ہے تم سے بات کرنے کو، تمہاری دادی
 کے جاننے والوں میں ہیں ان کے بیٹے کا رشتہ
 ہے، لڑکا باہر سے بڑھ کر آیا ہے، بزنس
 ایڈمنسٹریشن میں اچھی فیلٹی ہے، تمہاری دادی اور
 میں چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی اب ہو جائے،
 آفس بزنس شادی کے بعد سنبھالتی رہنا۔“

”پلیز امی نہیں کرنی شادی مجھے۔“ ناگواری

”بہت شکریہ آپ کا، میں یہ احسان ساری
 عمر یاد رکھوں گا۔“ اکمل صاحب ممنونیت سے
 بولے۔

”شکریہ کی بات نہیں ہے آپ کا اپنا ہی
 آفس ہے، اب آپ مجھے اجازت دیجئے، ماہا کے
 ساتھ چائے پی کر جائیے گا، میرے آرام کا وقت
 ہو گیا ہے۔“ یہ کہتے ساتھ ہی وہ اپنی چادر سینٹی
 اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آپ مجھے بھی اجازت دیں چائے پھر
 کبھی سہی، میں گھر جا کر بیٹے کو خوشخبری سناؤں
 جاب کی، آج کل وہ خاصا پریشان تھا کہ اب میں
 واپس سیٹ پر آ گیا تھا تو اسے بھی جاب کی
 ضرورت تھی۔“ اکمل صاحب بھی یہ کہتے ساتھ ہی
 خورشید بیگم سے اجازت طلب کرتے احسان بنگلو
 سے رخصت ہوئے۔

☆☆☆

”امی جان آپ نے یہ بات سوچی بھی
 کیسے؟“ خالدہ بیگم کی بات سنتے ہی ماہا کو گرنت
 لگا۔

”ماں ہوں، بیٹی ہو میری سوچنا تو ہے نا۔“
 خالفتا مامتا بھرے لہجے میں خالدہ بیگم گویا
 ہوئیں۔

”آپ یہ سوچیں کہ آپ کی بیٹی کوچ آفس
 جانے کے لئے کون سا ڈریس پہننا چاہیے۔“
 خالدہ بیگم ماہا کی وارڈروب کھولے کھڑی تھیں۔

”کون سا نکالوں؟“ انہوں نے مڑ کر ماہا
 سے پوچھا، جو فائل پر جھکی ہوئی تھی۔

”کوئی سا بھی اپنی مرضی کا نکال دیں۔“
 ان کی بات کا جواب دیے کہ وہ بیڈ پر نیم دراز
 انداز میں لیٹ گئی، سرکش پر رکھ لیا نظروں کے
 سامنے فائل تھی۔

”اب چھوڑو بھی یہ فائل درک، میری بات

اس کے انگ انگ سے چھلک رہی تھی۔
 ”کوئی ہے تو مجھے بتا دو۔“ خالدہ بیگم نے
 سیدھے الفاظ میں پوچھا۔
 ”ہیں یہ کیا بات کہی۔“ وہ ان کی بات سن
 کر ٹٹکی۔

”باہر نکلتی ہو، لوگوں سے ملنا ملنا ہے، تو پسند
 آجانا ہے کوئی۔“ ان کا لہجہ سرسری تھا، اپنی بات
 کی مفصل تفصیل بیان کرتے ہوئے بولیں۔
 ”آپ کو لگتا ہے کہ میں باہر رشتہ تلاش
 کرنے جاتی ہوں۔“ قدرے درشت لہجے میں
 وہ بولی تھی۔

”اب تم بات گھما پھرا رہی ہو۔“
 ”کرتی ہوں دادی سے شکایت آپ کی۔“
 دھمکی آمیز لہجے میں وہ بولی۔

”جو کرنا ہے کرتی پھر، یہ لڑکے کی تصویر
 ہے، دیکھ لو پسند آجائے تو بتانا، ویسے سچ کہوں
 مجھے لڑکا پسند ہے، تمہاری دادی کہہ رہی تھیں کہ ملنا
 چاہو یا نوں پر بات کرنا چاہو تو بھی بتا دینا، وہ خود
 لڑکے کے والد سے بات کر لیں گئیں۔“ خالدہ
 بیگم اپنی بات مکمل کر کے کمرے سے نکل گئیں اور
 وہ فائل پر جھکی غائب دماغی کی حالت میں بیٹھی رہ
 گئی۔

بہت دیر کے بعد کمرہ دکھنے کا احساس ہوا تو
 سیدی ہوئی، نظر سامنے ٹیبل کے کونے پر دھر کے
 سفید لفافے پر پڑیں، کچھ دل میں عجیب سے
 احساسات نے جنم لیا، جنہیں وہ کوئی بھی نام
 دینے سے قاصر تھی، البتہ وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ
 ان احساسات نے اس کے دل کو اجنبی سی اداسی
 میں ڈال دیا تھا۔

کیوں تھی یہ اداسی جو اس کے دل سے ہو کر
 اس کے ذہن پر چھائی اس کے وجود کو اپنے
 احاطے میں لے گئی تھی، اپنی جگہ سے اٹھی اور

دھیرے قدم اٹھاتی ٹیبل تک آئی، کتنی ہی دیر وہ
 اس سفید لفافے پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی، پھر
 ہاتھ بڑھا کر لفافہ پکڑا، ایک ہاتھ سے کھولنے لگی
 کہ نامحسوس انداز میں دوبارہ لفافہ بند کئے وہیں
 میز پر دھر اور واپس، بستر پر چلی آئی، بستر پر لیٹ
 کر لفافے سر کر لئے ہاتھ بڑھا کر لیپ کا سوچ
 آف کیا، آنکھیں موندیں تھیں کہ بند آنکھوں کے
 پردوں پر ایک شبیہ اتری، تڑپ کر آنکھیں کھولیں
 اور اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی، دل نامحسوس انداز میں
 تیزی سے دھڑکنے شروع ہو گیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے میرے دل کو۔“ دل میں
 ابھرتے احساسات سے پریشان ہو کر ایک سوچ
 نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔

کچھ دیر وہ ایسے ہی بیٹھی رہی پھر لیٹی اور
 ایک مرتبہ پھر سے ہاتھ بڑھا کر سائڈ لیپ کا
 سوچ آف کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ دادی کے سامنے اسی سفید
 لفافے سمیت موجودگی۔

”کیا کہتی ہے ماہا بیٹی۔“ جواب میں ہلکے
 سے مسکراتی تھی اور لفافہ ان کے ہاتھ کے نیچے
 سرکایا۔

”پلیز دادی ابھی اتنی جلدی آپ کو میری
 شادی کی کیا سوچی۔“ وہ سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔
 ”پر بیٹی کی شادی ایک نہ ایک دن تو کرنی
 ہوتی ہے۔“ لہجہ سرسری تھا۔

”آپ کے پاس ٹھیک تھی نا۔“ وہ منہ
 بدھتے ہوئے بولی۔

”جہیں، بیٹیاں تو پرایا دھن ہیں تمہارا باپ
 ہوتا تو اور چند سال پہلے کر دیتا، تمہارے ہاتھ
 پیلے، وہ تو اس کی موت نے جہیں ذمہ دار یوں
 کے سپرد کر دیا۔“ خورشید بیگم ہنوز انداز میں کہتی

ہوئی پوتی کے چہرے کو جہان دیدہ نگاہوں سے
جانچتے ہوئے بویں۔

”دادی اگر انہیں میرے کام پر اعتراض
ہوا۔“ دل میں ابھرتے سوال کو ماہا نے الفاظ کا
روپ دیا۔

”نہیں ہوگا، کر لی ہے میں نے بات، اس
کی فکر نہ کرو، بہت اچھا بچہ ہے، میں نے احتیاطاً
تصویر بھیجی تھی خالدہ کے ہاتھ کہ دیکھ لو۔“ یہ کہتے
ساتھ ہی انہوں نے اپنے نیلے کو ذرا سر سر کا کر
سفید لفافہ نکالا اور اس کی جانب بڑھایا۔
”مجھے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ جو
بھی فیصلہ کریں۔“ ماہا نے ان کے ہاتھ سے لفافہ
پکڑے بغیر ہی کہا۔

”ہیں..... ماہا..... دیکھی نہیں تصویر۔“

حیرت سے خورشید بیگم کو باہوئیں۔

”نہیں۔“ اس نے جواب میں سادگی اور
سچائی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا، ابھی دیکھ لو۔“ انہوں نے ماہا کو
پکارا۔

”نہیں دیکھی، اس کی ضرورت نہیں، آپ کو
جہاں کرنی ہے شادی کر دیں۔“ خورشید بیگم کو
حیران چھوڑتے یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل کر باہر
گیراج میں چلی آئی۔

آفس جانے کی غرض سے گاڑی اشارت
کئے آفس روٹ پر گاڑی ڈال دی، دل عجیب
سے سوچوں میں غلطال تھا، ایک ہی رات میں
اس کے وجود پر شجیدگی کے بادل گر آئے تھے۔
آفس اپنے بیمن میں داخل ہوئی تھی کہ اس
کی اسٹنٹ شازیہ روم میں انٹر ہوئی۔

”مے آئی کم ان میڈم۔“

”جی آئیے، آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی،
آج کے شیڈول کا بتائے کوئی میٹنگ تو نہیں

ہے۔“

”جی اسلم ایسوسیٹس کے ساتھ بزنس ڈیل
فائل میٹنگ تین بجے کی از میچ ہے آپ اور فاطمہ
سر نے میٹنگ اینڈ کرنی ہے۔“ شازیہ نوٹ بک
سے پڑھ کر کفرم کرتے ہوئے بولی۔

”فاطمہ صاحب آئے ہیں آج آفس۔“ ماہا
نے پوچھا۔

”نہیں ابھی کھنڈ پہلے کال آئی تھی کہ صبح
آفس آتے وقت ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا
ہے تو وہ آج لیٹ آئیں گے۔“ کچھ یاد آنے پر
شازیہ نے نوٹ بک سے سر اٹھا کر ایک نظر ماہا
کے چہرے پر ڈالی۔

”گاڑی کا ایکسیڈنٹ۔“ ماہا حیران ہوئی۔

”لیس میڈم۔“ شازیہ اثبات میں سر ہلاتے

ہوئے بولی۔

”خود ٹھیک ہیں۔“ اس مرتبہ تشویش تھی۔

”کچھ بتایا نہیں میڈم۔“ اس نے نفی میں

سر ہلایا۔

”اوکے آپ جائیں اور فاطمہ صاحب کا
نمبر ملائیں آفس نمبر سے، یا ایسا کریں رہنے دیں
آپ جا کر اپنا کام کریں۔“ خاصے فکر مند لہجے
میں کہتے اس نے شازیہ کو کمرے سے جانے کا
کہا۔

”اوکے میڈم۔“ شازیہ کے روم سے نکلتے
ہی اس نے اپنے سیل سے فاطمہ کا نمبر ڈائل کیا،
انہی کی ٹون کانوں میں سنائی دی، تین مرتبہ کال
کی کہ شاید میٹ درک کا البتو ہو لیکن وہی انہی کی
آواز تھی، صبح معنوں میں وہ پریشان ہو گئی تھی۔

بہت ہی خاموشی سے فاطمہ کی ذات نے
اس کے دل میں اپنی جگہ بنا لی تھی، اس کی سادگی
سچائی نے انجانے میں اس کے دل میں گھر کر لیا
کہ اسے بھی خبر نہ ہوئی، خبر تب ہوئی جب خالدہ

چہرے سے پریشانی صاف دیکھائی دے رہی تھی جس کو بھانپتے ہوئے فاطمہ بولا۔

”آئی ایم ہنڈرڈ پرسنٹ آل رائٹ۔“ وہ ہنوز خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی، اب اس نے فاطمہ کو اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے دیکھا۔

”میں ذرا دوپہر میٹنگ کی فائل سٹڈی کر لوں۔“ وہ خاموش تھی، نظروں کا زاویہ ہنوز تھا، فاطمہ نے آفس کا دروازہ کھولا باہر نکلتے نکلتے رکا، مزا، ایک نظر ماہا پر ڈالی۔

”مجھے اچھا لگا آپ کا میرے لئے یوں فکر مند ہونا۔“ فاطمہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا، ماہا کی سماعت پر شبہ ہوا تھا، اس کی نگاہوں کا زاویہ بدل چکا تھا۔

اس کی چوری پکڑی جا چکی تھی، فاطمہ کمرے میں موجود نہیں تھا لیکن بہت دیر تک ماہا اپنی جگہ ٹکا ہوا تھا نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

اس کی منگنی کی تاریخ اگلے ماہ فکس ہو چکی تھی، خالدہ بیگم جمعہ خورشید بیگم اکیٹو ہو چکی تھیں، بازاروں کے چکر لگ رہے تھے، اس دوران میں دوسرے اس کے سسرال والے آئے لیکن وہ آفس میں بڑی تھی، دادی سے بہانہ کرنے کو کہہ دیا، اس کا دل اداسی کے گہرے بادلوں کی زد میں تھا، کسی سے ملنے کو دل ہی نہیں تھا۔

ایک مرتبہ جو خالدہ بیگم سے لڑکے سے ملاقات کے بارے میں پوچھا تو دوبارہ نہیں پوچھا، ہاں یہ ضرور ہوا کہ خورشید بیگم نے بلا کر کہا تھا کہ فون کرنا چاہے تو بات کر سکتی ہے بیٹھو۔

پہلی مرتبہ انہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ لڑکے کا نام بیٹھو ہے، ایک کاغذ پر لکھا فون نمبر دیا لیکن وہ بھی اس نے تصویر کے لفافے کی طرح دیکھے بنا ہی بند کر دیا، جوں جوں منگنی کے دن

بیگم اسے سفید لفافے میں رکھی تصویر دے کر نکلیں، تب وہ اسے کھولنے کی ہمت نہیں کر پائی۔ اس کی نظریں کیمین کی مشرقی دیوار سے لگی کھڑی پر پڑیں، صبح کے گیارہ بج رہے تھے، ایک مرتبہ اس نے اپنے سیل فون سے دوبارہ فاطمہ کا نمبر ڈائل کیا، تیل جا رہی تھی، تیسری تیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

”فاطمہ!“ لہجے میں بے تابی تھی۔
”جی میڈم، میں بس آ رہا ہوں آفس۔“
”شاز یہ نے بتایا ایکسیڈنٹ کا، آپ ٹھیک ہیں؟“ بے قراری آواز میں رچی ہوئی تھی۔
”جی بالکل اللہ کا شکر ہے میں بس دس منٹ میں آفس پہنچ رہا ہوں راستے میں ہی ہوں۔“
”ہوں۔“ یہ کہتے ساتھ ہی ماہا نے کال منقطع کر دی۔

کچھ دیر بعد ماہا نے اسے کیمین کا دروازہ کھولے اندر داخل ہوتے دیکھا، اسے دیکھتے ہی بے ساختہ وہ پریشانی کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ ہاتھ پر کیا ہوا؟“ دائیں ہاتھ پر سفید بیڈنچ پر نظر پڑتے ہی بولی۔
”وہ ہلکی سی خراش آئی تھی۔“
”لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ ٹھیک ہوں۔“
ماہا کے لہجے میں تشویش تھی۔

”جی اتنا تو میڈم ہو ہی جاتا ہے۔“
”آپ کا آفس سے چھٹی کر لینی چاہیے تھی۔“ درحقیقت میں ماہا پریشان ہو گئی۔
”آج دوپہر میں میٹنگ تھی تو اس لئے۔“
”میٹنگ کینسل بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”نہیں میڈم، اس کی ضرورت نہیں، ویسے بھی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ جواب میں وہ خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی لیکن

In coming سے اس کا ہاتھ میں پکڑا موبائل
call سے بچ اٹھا۔

”کیسی ہیں میڈم!“ خوشگوار انداز میں اڑ
پیس سے آواز ابھری۔

”جی..... وہ۔“
”آپ نے خیریت سے کال کی۔“
”وہ..... ہاں..... بس خیریت تھی، اکمل
صاحب نے آفس میں ذکر کیا کہ آپ کی امی بیمار
ہیں۔“

”میری امی۔“ دوسری جانب سے لہجہ
میں خاصی حیرت لئے انیر پیس سے آواز ابھری۔
”یو کے آفس کی کلوزنگ کے سلسلے میں اکمل
صاحب نے جانے سے انکار کیا تھا میں نے آپ
کا نام لیا تو انہوں نے بتایا کہ آپ کی امی بیمار ہیں
تو انہیں ٹائم دینا ہوتا ہے۔“
”اور ہاں جی بالکل۔“

”کیا ہوا آپ کی امی کو؟“ سوالیہ انداز میں
ماہانے پوچھا۔

”امی کو..... ہاں وہ نزلہ فلو..... موسم جو
بدل رہا ہے۔“

”آپ آج آفس نہیں آئے۔“ اس نے
اگلا سوال کیا۔

”کیوں آپ نے میرا نہ آنا مس کیا؟“
جواب توقع کے مطابق نہیں تھا۔

”نہیں، وہ تو اصل میں آپ چھٹی نہیں
کرتے تو اس لئے۔“ ماہا فاطمہ کی بات کے
جواب میں قدرے گڑبڑاتی پھر پھرتی سے بات
بدلتے ہوئے بولی۔

”یعنی کہ مس کیا آپ نے؟“ فاطمہ کا لہجہ
ہنوز تھا، لیکن اس مرتبہ ایسا کچھ تھا اس لہجہ میں کہ
بے ساختہ ہی ماہا کے دل کی بیٹ مس ہوئی، وہ
خاموش رہی۔

قریب آ رہے تھے اسی انداز میں اس کے وجود پر
خاموشی کی تہہ دبیز ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

عمران نے اپنا بزنس Separate
کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس سلسلے میں یو کے
برانچ کا Clerical work تھا جس کے لئے
اس نے اکمل صاحب کو بھیجا چاہا، لیکن اکمل
صاحب نے جانے سے انکار کر دیا تھا، یہ پہلی
مرتبہ تھا کہ انہوں نے آفس کے کسی کام سے انکار
کیا تھا۔

”ٹھیک ہے آپ کی جگہ فاطمہ صاحب کو بھیج
دیتے ہیں۔“

”اس مرتبہ وہ بھی نہیں جاسکے گا۔“
”اس مرتبہ کیا مطلب۔“ ماہانے ان کی
بات کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب کہ اس کی ماں بیمار ہے اور آپ کو
پتہ میری بیٹی تو کوئی نہیں ہے، تو وہی اپنی ماں کے
ساتھ ہوتا ہے جب میں نہیں ہوتا۔“

”ادوہ، آپ نے پہلے نہیں ذکر کیا۔“ وہ ان
کی بات کے جواب میں خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔
”ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“

”ٹھیک ہے میں کوئی اور بندوبست کرتی
ہوں۔“ وہ کسی نتیجے پر پہنچتی ہوئی بولی، جواب
میں اکمل صاحب اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔

وہ رات سونے کے لئے لیٹی کہ بے ساختہ
اسے صبح آفس میں ہونے والی گفتگو یاد آگئی۔
موبائل ہاتھ میں پکڑا اور ایڈریس بک میں
نے مطلوبہ نمبر نکال کر ڈائل کا بٹن پیش کیا۔

دوبیل کے بعد ہی فون پر ابھرنے والی آواز
کو سنتے ہی بے ساختہ اس نے کال کاٹ دی،
ابھی غائب دماغی کی حالت میں سوچ رہی تھی کہ
اس نے کیا حرکت کی کہ چند ہی سیکنڈ کے وقفے

”کیا مطلب میڈم آپ خوش نہیں ہیں۔“
حیرت سے ابھرا چکائے۔
”نہیں میرا یہ مطلب نہیں، لیکن اس طرح
اچھا نہیں لگتا۔“ اپنے غصے پر کنٹرول کرتے
ہوئے ماہا بولی۔

”میڈم آپ کی بات سنی ہوئے پر ہم سب
اتنے خوش ہیں کہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آپ کو خوش
کریں، وہ تو فاطمہ صاحب نے کہا کہ کلک کاٹ
کر آپ کو خوش کرتے ہیں۔“ شازیہ نے مسکراتے
ہوئے آفس فرنیچر سے کیگ نکال کر سامنے ٹیبل پر
رکھا۔

”اب یہ کون لایا؟“ حیرت کا ایک اور جھٹکا
ماہا کو لگا۔

”ہم سب مل کر لانا چاہ رہے تھے لیکن فاطمہ
صاحب نے کہا کہ کلک وہ خود لائیں گے بس ہم
سب کی موجودگی ضروری ہے۔“
”بہترین انسان۔“ بے ساختہ ہی دل میں
خیال ابھرا کہ ٹیبل پر دھرا دو پونڈ کا چاکلیٹ کیگ
اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارے۔

ایک پہلے ہی دل تڑپا ہوا تھا اور دوسرا وہ ہر
طریقے اور انداز میں اس کے تڑپے زخمی دل پر
ہمک چھڑکنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے
نہیں دے رہا تھا، احساس کسی کی کو کہہ کر نہیں
کروایا جاسکتا، ایک گہری سانس لئے اس کے
ذہن میں سوچ ابھری تھی۔

☆☆☆

وہ ہال میں صوفے پر نیم دراز انداز میں
رسالہ پڑھ رہی تھی کہ بیرونی دروازہ کھولے خالدہ
بیگم ہاتھوں میں شاپنک کے شاپرز لئے داخل
ہوئیں۔

”تم یہاں آرام سے بیٹھی ہو، منگنی تمہاری
ہے اور بازاروں میں خوار میں ہو رہی ہوں۔“

”اچھا آپ ریٹ کریں، صبح آفس میں
ملاقات ہوگی۔“ بہت دیر بعد فاطمہ گویا ہوا جیسے کہ
اسے ٹائم دیا ہو کہ وہ اس کی بات کا جواب دیے
لیکن جواب نہ ادر۔
اگلی صبح وہ آفس پہنچی تھی کہ سبھی آفس ورکرز
اس کے کیبن میں موجود تھے۔

”بہت مبارک ہو میڈم آپ کو بات سنی
ہوئے کی۔“ شازیہ اسٹنٹ نے مسکراتے
ہوئے دہی کیا تو وہ حیرت سے باری باری
سارے آفس ورکرز کے چہرے دیکھتی رہ گئی۔
”آپ سب کو کس نے بتایا؟“ وہ حیران
ہوئی۔

”فاطمہ صاحب نے۔“ جواب آیا۔
”اور فاطمہ صاحب کو کہاں سے علم ہوا؟“
اگلا سوال تیزی سے اس کے ذہن میں آیا اور اسی
تیزی کے ساتھ اس نے الفاظ کا روپ دیا۔
”اکمل صاحب سے۔“ اس مرتبہ جواب
آیا۔

”اور اکمل سر کو؟“ حیرت میں مزید اضافے
سمیت ماہا نے اگلا سوال کیا۔

”ابو جان کو آپ کی دادی جان نے انعام
کیا۔“ فاطمہ کمرے میں داخل ہوا۔

”دادی جان نے انہیں بتایا اور انہوں نے
سارے آفس میں بات پھیلا دی۔“ ماہا حیرت کی
اتھاہ گہرائیوں میں تھی۔

”نہیں انہوں نے مجھے بتایا اور جہاں تک
بات پھیلائے کا حلق ہے تو میڈم خوشی کی خبر ہے،
آپ خوش ہیں تو ہم سب خوش ہیں۔“ فاطمہ نے
دانت کھوسے۔

”کس نے کہا میں خوش ہوں۔“ ماہا کا دل
چاہا اس کے سفید دانتوں پر کس کے مکا دے
مارا۔

”بہت زیادہ رش تھا۔“

”شباباش ہے، میری بات کا یہ جواب، لڑکی
تمہاری عمر میں لڑکیوں کو سب سے سنورنے کا شوق
ہوتا ہے، ممکن ہے نام سے ہی ان کے وجود میں
رنگ اترنے لگتے ہیں اور ایک تم ہو۔“
”کیا کروں امی جان۔“

”لو بھلا یہ بات ہے کرنے والی۔“

”اچھا ناراض نہیں ہوں، اگلی مرتبہ بازار کا
چکر لگا تو ڈاکٹر کی دکان سے دو چار رنگوں کی پڑیاں
لے آئیے گا۔“

”اے میرے مولا میں کیا کروں اس لڑکی
کا۔“

”یہ تو تمہارا سوٹ لے کر آئی ہوں۔“

”تو کیا لڑکے والے نہیں لائے۔“

”وہ تو انہی کی طرف سے آتا ہے، تمہاری

ہونے والی ساس کہہ رہی تھیں کہ کل بھجوا دیں گی،
انہوں نے رنگ میں تمہاری پسند پوچھی تھی تم نے
بتایا تو کہہ رہی تھیں کہ بیٹو نے ہلکا پنک رنگ پسند
کیا ہے۔“

”بیٹو! دل کو کسی نے مٹھی میں پکڑ کر مسلا
تھا، کیا تھا اگر قسمت اس کے دل کا ساتھ دیتی تو
آج بیٹو کی بجائے فاطمہ ہوتا، دل میں ابھرتی اس
سوچ پر اگلے ہی لمحے ملامت کی تھی۔

☆☆☆

منگنی کا دن احسان بنگلو پر بہت سی خوشیاں
لے کر آیا تھا، ہر کمین کا دل خوشی سے مست تھا،
سوائے ماہا کے۔

بیوی پارلر نے ماہا کے صحن پر چار چاند لگا
دیئے تھے، پنک رنگ کے ٹشو اور کرڈی برکولڈن
دبکی اور سلے کے کام نے اس کے حسن کو نکھار دیا
تھا، میک اپ پروڈکشن نے بھی اپنے ہاتھوں کا
کمال دکھایا تھا، ان تمام باتوں کے باوجود اس

شافت شہتہ روائے



ابن انشا کے سفر نامے



لاہور اکیڈمی

پکلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرگرمیہ اور وہ بازار لاہور
فون: 042-37310797, 042-37321800

سے بجائے اور بیٹھو میرے پاس۔“ قریب کھڑی
ماہا کے چہرے پر مسکرائی نگاہ ڈال کر خورشید بیگم
نے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا۔
”جی۔“

”اب بولو، کیا بات ہے، جویوں اداس
بلبل بنی پھر رہی ہو، خود تو اپنی جان سے ہلکان ہو
اپنی ماں کی جان کو بھی سولی پر لٹکایا ہوا ہے۔“
”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے
ہوئے بولی۔

”جو کچھ دل میں ہے بتاؤ، منگنی سے خوش ہو
تو بھی بتاؤ، کوئی اور پسند ہے تو بولو، ہمیں تمہاری
خوشی عزیز ہے۔“
”نہیں تو۔“ اس کی آنکھیں پھر سے بھینکنے
لگیں جو اس نے سر جھکا کر چھپانے کی کوشش
کی۔

”نیپو نہیں پسند آیا۔“ صاف الفاظ میں
پوچھا گیا۔
”میں نے دیکھا نہیں۔“ ہلکی آواز میں وہ

جھکے سر کئے بولی۔
”تو کس کو دیکھتی ہو۔“ اگلا سوال پہلے سوال
سے کہیں زیادہ سیدھا صاف تھا۔

”جی؟ کیا مطلب۔“ یکدم ہی ماہا نے سر
اٹھا کر حیران نگاہوں سے دادی کو دیکھا۔
”پوچھ رہی ہوں کون ہے جسے دل میں چھپا
رکھا ہے اور زبان پر نہیں نہیں کی رٹ لگائے رہی
ہے۔“

”کوئی بھی نہیں آپ سے کس نے کہا
ہے۔“ وہ قدرے ہٹکائی۔

”تمہیں نیپو کی تصویر دیکھائی تم نے نہیں
دیکھی، فون پر بات کرنے کو کہا تم نے انکار کر دیا،
دوسرے تم سے ملنے گھر آئے تم نے آفس کا بہانہ کر
کے گھر سے فرار لی، آخر یہ ماجرا کیا ہے۔“

کے چہرے کی سوگواریت خالدہ بیگم کی نگاہوں
سے چھپی نہیں رہ پائی تھی، آخر کو ان کی بیٹی تھی، پالا
تھا بچپن سے اس کے ایک ایک انداز کی گواہ
تھیں، راز دان تھیں، نہایت ہی خاموشی سے
انہوں نے خورشید بیگم کو اس بات سے آگاہ کر
دیا۔

دیکھ تو وہ بھی رہیں تھیں ماہا کا مہجایا چہرہ
ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔
”بلاؤ ماہا کو۔“

”جی امی جان، آپ اس مسئلے کا حل کریں
مجھ سے اس کی رونی صورت نہیں دیکھی جارہی،
اتنے دن سے آپ کے کہنے پر صبر کر رہی ہوں،
لیکن آج نہیں، آج تو اس کی منگنی ہے۔“

”بس زیادہ تقریر کی ضرورت نہیں ہے، کہا
جو ہے بلاؤ بات کرنی ہوں دو ٹوک۔“ کچھ دیر
بعد ماہا، خورشید بیگم کے کمرے میں موجود تھی۔
”جی دادی جان آپ نے بلایا مجھے۔“
آنکھیں میس میس کی تھیں۔

”ہاں ادھر آؤ لڑکی مجھے تم سے بات کرنی
ہے۔“ ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے ماہا کو
اپنے قریب بلایا۔

”امی جان آرام سے۔“ خالدہ بیگم نے
ہلکے سے خورشید بیگم کو ٹوکا۔

”تم چپ کر کے بیٹھو یہاں، اگر نہیں بیٹھا جا
رہا تو جاؤ اور باہر اٹکل صاحب آئے ہیں فاطمہ
کے ساتھ ان سے باتیں کرو۔“ خورشید بیگم نے
ان کی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

”نہیں امی جان، میں یہیں ٹھیک ہوں،
چپ ہوں، خاموش۔“ خالدہ بیگم ان کی ڈانٹ پر
خاموشی سے پیشے رہنے پر آمادگی ظاہر کی۔

”ہاں تو لڑکی، چلی بات یہ کہ تم ان پکڑوں
میں بہت پیاری لگ رہی ہو، خدا تمہیں نظر بد

”دادی مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی، امی جان آپ کو تو میں بعد میں پوچھوں گی۔“ ماہانے ایک ہی سانس ایک ہی جملے میں دونوں خواتین سے ناراضگی کا اظہار کیا۔

”آپ دونوں گر لیں فل خواتین سے اجازت ہے مجھے میری میڈم سے بات کرنے کے لئے۔“

”خبیث انسان۔“ دل ہی دل میں ماہانے اسے گالی سے نوازا تھا، کس طرح دادی اور امی سے فری ہوا جا رہا تھا جیسے نجانے کتنی پرانی یاری ہے۔

”تم دونوں باتیں کرو اور فاطر بیٹا، یہ تصویر ابھی تک ماہانے نہیں دیکھی، فون نمبر بھی نجانے کہاں رکھ دیا تھا میں نے کاغذ پر لکھوا کر تمہارے ابو سے۔“

”اکمل صاحب سے۔“ ظاہر ہے، تمہارا ابا تو آج ہم میں ہے نہیں تو اس سوچ پر مجھے اکمل صاحب ہی ایسے مخلص انسان لگے جو تمہارے لئے اچھا سوچ سکتے ہیں۔“

”آپ فکر نہیں کریں، میں سب سمیٹ لوں گا۔“ معنی مونچھوں تلے اس کے بھرے بھرے ہونٹوں کی مسکراہٹ نے ماہا کو بے ساختہ ہی تپا دیا۔

”جی تو میڈم یہ بات ہے۔“ خالدہ بیگم اور خورشید بیگم کے کمرے سے نکلتے ہی فاطر پھیلا۔

”کون سی بات؟“ کن اکیوں سے ماہانے اسے دیکھا۔

”آپ کو شیو پسند نہیں۔“ دشمن جان کی زبان سے رقیب کا ذکر ماہا کا دل جلا گیا۔

”میں نے کب کہا۔“ وہ گڑبڑائی۔

”تو تصویر نہیں دیکھی۔“ فاطر نے ٹولا۔

”کہانا دادی، کوئی بات نہیں، کوئی پسند نہیں کوئی ماجرا نہیں۔“ اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی جھینگنے لگا۔

”میں اندر آ سکتا ہوں۔“ ملنے سے ناک کے ساتھ کمرے میں دروازہ کھول کر فاطر داخل ہوا۔

”ہاں آؤ۔“ دشمن جان کو سامنے دیکھ کر دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔

”سلام دادی جان، آپ نے بلوایا، دیکھ لیں میں آپ کے ایک حکم پر آ گیا۔“ ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ لئے دادی سے جھک کر کندھے پر ہاتھ پھیرے پیار لیا۔

”سمجھاؤ اپنی میڈم کو کہ آخر کیا بات ہے اس کے دل میں، آج مگنی ہے تو کیوں اداسی کا بت بنے پورے گھر میں بولائے پھر رہی ہے۔“ دادی کی بات سن کر ماہانے بے ساختہ ان کے چہرے پر نگاہ ڈالی بظاہر ان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی لیکن ان کی مسکراتی نگاہیں ماہا کو حیرت میں مبتلا کر گئیں۔

”آپ نے فاطر کو اس لئے بلایا کہ یہ مجھ سے آپ کی نظر آتی میرے وجود پر چھائی اداسی کی وجہ پوچھے۔“ قدرے اچنبھے سے ماہانے دادی سے سوال کیا۔

”ظاہر ہے اور اس وقت تمہارے میرے اور تمہاری ماں کے بعد یہ تیسرا انسان ہے جو تمہارے قریب ہے، ہم دونوں کو تو تم بتانے سے انکاری تھیں میں نے سوچا کہ فاطر بیٹے کو بلاؤں وہی تم سے تمہاری اداسی کا راز جانے۔“ ان کی بات کے جواب میں ماہانے قریب بیٹھی خالدہ بیگم کی جانب نظر کی ان کے ہونٹوں پر دہی سی مسکراہٹ تھی۔

”مجھے نہیں دیکھنی اور پھر۔“ زیر لب وہ بولی۔

رہا، ”گھنیر لہجے میں جواب آیا۔
”کیا مطلب؟“ انداز و الفاظ دونوں نے ہی ماہا کو چونکا دیا۔

”اب یہ نہ کہیے گا کہ آپ کے دل کی دیوار پر کسی اور کی تصویر پہلے ہی چسپاں ہے تو کسی کی تصویر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔“ یہ کہتے ساتھ ہی اس نے ٹیبل پر پڑے لفافے کو اٹھا کر اس میں سے تصویر باہر نکالی۔

”جی سے دل ہی بات کہوں ابھی ڈرامہ مزید جاری رکھنے کا پروگرام تھا لیکن آپ کی رونی صورت دیکھ کر پروگرام کینسل کرنا پڑ رہا ہے۔“
”ڈرامہ؟“ وہ ابھی۔

”ہوں، ناٹ بیڈ، کو انٹ ہینڈسم۔“
”فاطر صاحب، آفس کے کاموں کی الگ بات ہے، کم از کم آپ ہمارے پرسنل گھریلو معاملات میں مداخلت نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔“
”صرف گھریلو، پرسنل ہی نہیں، بلکہ دل کے معاملات۔“

”پینھیں ادھر میری بات آرام سے سنیں، لیکن ایک وعدہ ہے کہ آپ اور ری ایکٹ نہیں کریں گیں۔“

”آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔“

”جو کہتا ہے جلدی کہو۔“
”کہنا کچھ نہیں ہے بس بتانا ہے۔“ درباری مسکراہٹ لئے فاطر بولا۔

”ابھی تک تو اپنی حد میں ہی ہوں، دیکھ لیں وہیں بیٹھا ہوں جہاں دادی اور انٹی کے نکلنے پر بیٹھا تھا، دیکھ لیں، ناپ لیں، جو ذرا انج بھی اپنی جگہ سے ہلا ہوں۔“ وہ دل آویزی سے مسکرایا۔

”ہاں، وہی کہنا بتانا، ایک ہی بات ہے۔“
ماہا کے لہجے میں بے تالی تھی، اس کے دل میں ابھرتی تشویش، اس کی چھٹی حس اسے انہونی کا احساس دلارہی تھی۔
”میں فاطر۔“

”پلیز فاطر صاحب۔“ وہ لا جواب سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں جانتی ہوں۔“
”مابہ دولت کو پیار سے ٹپو بلایا جاتا ہے۔“
”ہاں آگے کہو۔“ جلدی سے بنا سوچے بنا سننے وہ بولی۔

”تھکم میڈم جی، میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو ٹپو پسند نہیں ہے، جو کہ میں اس تصویر میں دیکھ رہا ہوں خاصا شریف اور گڈ لکنگ ہے تو آپ easy ہو کر کہہ سکتی ہیں۔“
دونوں بازو اپنے سینے پر باندھے اس کے قریب صوفے پر بیٹھا، لمبوں پر وہی ازلی مسکراہٹ تھی جو بہت ہی کم اس کے ہونٹوں سے جدا ہوئی تھی۔

”کہہ تو دیا ہے۔“
”کیا؟“ اس مرتبہ ماہا نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

”نہ تو مجھے ٹپو سے کچھ لینا دینا ہے نہ ہی آپ سے، اگر رحمت نہ ہو تو آپ اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ سکتے ہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔
”اکیلا چھوڑنے کے لئے تو یہ سب نہیں کر

جواب میں وہ گھنیری مونچھوں تلے کل کر مسکرایا تھا، مسکراتے ساتھ ہی اس نے لفافے میں سے تصویر نکال کر سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔

بے یقینی کی کیفیت میں ماہا ابھی رہ گئی تھی، کبھی پاس میں بیٹھے فاطر کا چہرہ دیکھتی اور کبھی نگاہوں کا زاویہ ٹیبل پر دھری تصویر پر نکا دیتیں، ماہا کی ساعت پر ہم بھونٹا تھا، کچھ لمحوں کے لئے وہ

مگ ہو گئی۔

”ماہا، میں ہی ٹیپو ہوں۔“

”تم سب نے میرے ساتھ مل کر ڈرامہ کیا ہے۔“ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتی تھی لیکن اٹھ نہیں پائی تھی، نامحسوس انداز میں اس کے ہاتھ فاطمہ کے مردانہ ہاتھوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

”جھوڑو میرے ہاتھ۔“ ماہا کو کرنٹ لگا۔

”نہ ممکن، تمہارے کار ارادہ کیا ہے تو تازہ زندگی

تھامے رہوں گا۔“ گیمبر لہجے میں فاطمہ بولا۔

”یہ کیسا مذاق ہے؟“ وہ براہ راست گئی۔

”مذاق نہیں حقیقت ہے میڈم۔“ اپنی بات

پر زور دے کر اس نے سچائی بیان کی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ ابھی۔

”آپ کو چھان نہیں لگا۔“ فاطمہ کے لہجے میں

سوالیہ انداز تھا۔

”مجھ سے سب نے چھپایا۔“

”نہیں چھپایا نہیں، آپ نے ہی نظر نہیں

کی، اگر شروع دن ہی آپ میری تصویر دیکھ لیتیں

تو ہمیں موقع نہ ملتا آپ کو ستانے کا۔“

”میں دادی جان سے پوچھتی ہوں۔“

”کیا کہیں گی ان سے، کہ بہت شکر یہ دادی

یہی ہے وہ بندہ جس کی تصویر دل میں چھپائے

ہوئے تھی، ابھی تو اس لٹافے میں موجود تصویر کی

اہمیت ہی نہیں تھی۔“ ذفریب سی مسکراہٹ اس کی

آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے، وہ بہت دیر

تک اس کی روشن جھوڑی آنکھوں میں دیکھ نہ سکی،

بے ساختہ ہی پلکیں جھکا گئی۔

”یہ کس نے کہا۔“ جھکی پلکوں سمیت وہ

بولی۔

”اچھا، مجھے تو ایسا لگا لیکن اگر ایسا نہیں ہے

تو میں ابھی دادی جان کو انکار کر دیتا ہوں۔“ یہ

کہہ کر اس نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا لیکن وہ اٹھنے میں ناکام رہا، کچھ دیر پہلے ماہا کے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت اب انداز بدل گئی تھی۔

”نہیں نہیں۔“ ماہا نے اپنے ہاتھوں نے

اس کے ہاتھوں پر گرفت مضبوط کی۔

”کیا نہیں۔“ وہ شرارتی لہجے میں بولا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ محبوب ہو کر اسے ٹوکے بنا

ندرہ سکی۔

”اچھا اجازت دیں، چلتا ہوں۔“ آنکھوں

میں شرارت کا جہاں آباد کئے وہ اسے صاف

صاف چھڑ رہا تھا، ماہا نے ہلکے سے اس کے

ہاتھوں کو چھوڑ دیا۔

”کچھ دیر بعد پھر آنا ہے، ابھی دادی جان

نے بلوایا تھا، ابو کے ساتھ آیا ہوں، پہلے میرا

خیال تھا کہ شام کو ہی ڈرامہ کا ڈرامہ سین ہو لیکن

آپ کی امی سے آپ کی حالت دیکھی نہیں جا رہی

تھی۔“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی

تھی۔

کمرے سے نکل گیا تھا، ماہا کے دل میں

جیسے جل ترنگ سے بچا اٹھے تھے، دل ہی دل میں

اس نے دادی اور امی سے مصنوعی ناراضگی کے

بہت سے انداز سوچ لئے تھے۔

”خوش تو ہیں نا۔“ دروازہ پھر سے کھلا،

فاطمہ نے پھر سے اندر جھانکا۔

”ابھی باہر سب پوچھیں گے تو انہیں کچھ تو

بتانا ہے نا، کیا کہوں، کہہ دوں خوش ہیں۔“ وہ

مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا، محبت کے جواب

میں محبت کا تمنا تھا، جواب میں اس نے مسکرا کر

شرماتے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

نور الحسنیہ

ریحانہ آفتاب

سے جس نے بھی سنا دانتوں تلے انگلی دہائی۔
کہاں افریثم حیات جیسی کسی کو بند نا لگانے
والی لڑکی اور کہاں قدرتی ریان مرزا، سب کو حیرانگی
بھی آخر کیوں نا ہوئی، شاید اسی شہرت کے باعث
سب شوق میں شادی میں آ گئے تھے اور جنہیں
کارڈ نہیں ملا تھا، وہ مدعو ہونے والے سے فون
کر کے تفصیلات لے رہے تھے، سب کے
چہروں پہ پہلے جہاں حیرانگی کے تاثرات تھے

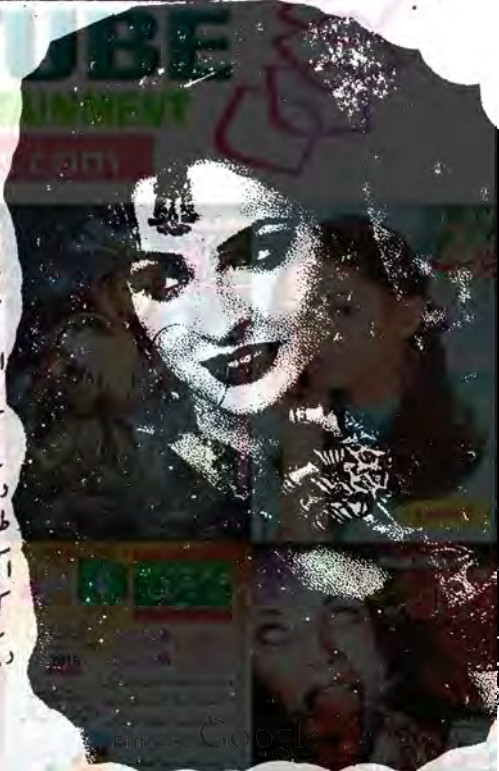
افریثم حیات ریڈ اور فان کلر کا بے حد
حسین عروسی لہنگ پہنے دلہنا پے کی ساری تیاری
کیے اسٹیج پہ براجمان تھی، تھوڑی دیر پہلے تک گزرتا
اور دوستیں اس کے ساتھ اسٹیج پہ بیٹھ کر، فونو اور
سیکٹی بنوائی رہی تھیں۔

ہال مہمانوں سے بھر سا گیا تھا، توقع سے
کہیں زیادہ مہمان آئے تھے، حیات صاحب کی
نکاحی میٹی افریثم حیات کی شادی ریان مرزا

ناولٹ

وہیں اب استہزائیہ رنگ جھلکنے لگا تھا۔
اسٹیج پر بیٹھی افریثم حیات کی نظریں اپنے
والدین پہ آئی تھیں، والدہ سیما جی سنوری لیکن
متغیر چہرہ لئے حیات صاحب سے کچھ کہہ رہی
تھیں، ساتھ ہی ساتھ مہمانوں سے بھرے ہال
میں ارد گرد پہ نظر بھی ڈال رہی تھیں، صاف ظاہر
تھا، وہ مہمانوں سے اپنی پریشان چھپانا چاہ رہی
تھیں، حیات صاحب کان سے سیل فون لگائے
ان کی بات سنتے بے دھیانی میں سر ہلا رہے
تھے۔

افریثم حیات والدین کے فکر مند چہرے
دیکھ رہی تھی، تب ہی چچا کا بیٹا حیات صاحب کی
طرف آیا تھا اور ان کے کان میں کچھ کہنا دوسرے
اسٹیج کی طرف اشارہ کرنے لگا تھا، اس کے اشارہ
کرنے پر افریثم حیات نے بھی اسٹیج کی طرف
دیکھا تھا، جہاں قاضی صاحب بے زاری سے منہ





تو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی، آج کل تو نکاح مایوں، مہندی سے بھی پہلے ہو جاتے ہیں لیکن تم لوگوں نے بھی نکاح عین بارات والے دن ہی رکھا، کوئی خاص بات تھی؟“ اس نے سیما کی دور پرے کی ممانی آگئی تھیں اور اب اظہار خیال فرما کر استفسار کر رہی تھیں۔

”ہاں ہاں وہ.....“ سیما گڑبڑا کر بات کرنے لگی تھیں اور افریثم حیات کو اپنی اور ریان مرزا کی فون پہ ہونے والی لڑائی یاد آگئی تھی، وہ مایوں سے پہلے نکاح پہ اصرار کر رہی تھی اور ریان بغند تھا کہ وہ بارات والے روز ہی نکاح کرے گا۔

”مجھے بالکل پسند نہیں کہ میں سیدھے سادے طریقے سے آ کر قبول ہے کر کے خاموشی سے چلا جاؤں، نا ہی مجھ میں صبر ہے کہ نکاح کے بعد بھی تم سے دور رہوں، اس لئے جب زور و شور سے بارات لے کر آؤں گا تب ہی نکاح بھی کروں گا۔“

اور وہ اس کی دلیل کے آگے چپ رہ گئی تھی، بعد میں سیما اور حیات نے بھی یسری اور یاسر، ریان مرزا کے والدین سے بات کی تو انہوں نے بھی ریان مرزا کا نام لے کر ساری بات اس پہ ڈال دی، لیکن اب افریثم حیات کا دماغ جیسے سن ہونے لگا تھا، اسے سب کچھ پلان لگنے لگا تھا۔

”سیما! میری مانو تو اب تم لوگ بھی انتظار چھوڑ دو، جو بات تمام مہمانوں کو سمجھ آگئی وہ تم لوگوں کو سمجھ نہیں آ رہی کہ کوئی بارات وارت نہیں آنے والی، ریان مرزا جو فلرٹی مشہور ہے جسے صرف لڑکیوں کو آلو بنانے کا چسکا پڑا ہو، وہ بارات لائے گا؟“

”مجھے تو شدید حیرت ہوئی تھی یہ جان کر کہ

بنائے بار بار کلائی میں بندھی اپنی سستی سی کٹری میں ٹانگ دیکھتے دائیں جانب بیٹھے شخص کی بات سن رہے تھے جو ان کے کان میں تقریباً گھسائی بیٹھا تھا۔

نشان دہی پہ فون کان سے لگائے حیات صاحب تیزی سے قاضی صاحب کی طرف بڑھے تھے، دور بے اسٹیج میں ہوتے مکالمے تو سنا کی نہیں دے رہے تھے، مگر قاضی صاحب کے مگڑے تھور اور بار بار رست و اچ دکھانے پہ افریثم حیات بھی سمجھ گئی تھی کہ قاضی صاحب دیر کا رونا رور ہے ہیں۔

”آف! مجھے تو چکر آ رہے ہیں، تمہاری کوئی بات ہوئی ریان سن؟ بارات لانے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے، اب تو پونے ایک بجتے لگا ہے، مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔“ سیما بے دم سی اس کے پہلو میں آ بیٹھی تھیں، اس کی طرف منہ کر کے اپنی تشریش کا اظہار کر رہی تھیں، میک اپ کی دینر تہہ کے باوجود بھی ان کے چہرے سے اک ماں کی فکر مند عیاں تھی۔

”حیات مسلسل ریان اور یاسر بھائی کو کال کر رہے ہیں، لیکن کوئی کال پک نہیں کر رہا فری! مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ سیما کا بہت پر حال تھا، یوں لگ رہا تھا وہ کسی بھی لمحے رو پڑیں گی۔

”تم ریان کو کال کر کے دیکھو۔“

”میری کئی بار کال کر چکی ہوں، وہ میرا فون بھی نہیں اٹھا رہا۔“ افریثم حیات نے دھیمے سے کہا تو سیما نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

”یا اللہ خیر یہ کون سا امتحان ہے ہمارا۔“

سیما بے حد پریشان لگ رہی تھیں۔

”بھئی سیما! کھانا لگوا دو تا کہ مہمان تو کھانا کھا کر رخصت ہوں اور کتنا انتظار کرواؤ گی، ادھر قاضی صاحب الگ پھڑ پھڑا رہے ہیں، بھئی مجھے

افریثم حیات کی شادی ریان سے ہو رہی ہے،
لیکن بھی کیا کہوں، پیسہ آنکھوں پہ پٹی باندھ دیتا
ہے، ورنہ ریان مرزا کی شہرت کسی سے ڈھکی چھپی
ہے، مجھے تو افریثم کے انتخاب پہ شدید حیرت
ہے، کہاں تو پروں پہ پانی پڑنے نہیں دیتی تھی اور
کہاں..... ممانی کچھ زیادہ جلی ہوئی تھیں کیونکہ
افریثم نے ان کے بیٹے کا رشتہ بھی ٹھکرا دیا تھا۔
”اچھے اچھے رشتے ٹھکرا کر تم لوگوں کو آج یہ
دن دیکھنا ہی نصیب میں تھا شاید۔“

سیما اور افریثم ان کی باتیں سننے پہ مجبور
تھیں۔

”اماں! میں دیکھ کر آیا ہوں، ریان کے
بچکے پہ شادی کے کوئی آثار نہیں، بچکے میں تالا پڑا
ہے، پڑوس سے معلوم کیا تو پتا چلا وہ لوگ صبح سے
ہی ملازموں کو چھٹی دے کر غائب ہیں۔“ موقع
سے فائدہ اٹھا کر جھوٹ کھڑتے مانی کا بیٹا عماد
اسی لمحے اسٹیج پہ آ کر اطلاع دے رہا تھا، سیما کا
رنگ یہ سب سن کر مزید اڑ گیا۔

”لو اور سن لو، عماد تو شادی میں آ ہی نہیں رہا
تھا، لیکن جب میں نے اسے یہاں کی صورت حال بتا
کر ریان کے گھر کی خبر لیتے آنے کا کہا تو دیکھو آ
گیا۔“ ممانی کہہ رہی تھیں، عماد دہن بنی افریثم
حیات کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

”سیما! تم کہو تو میں ابھی بھی اپنے عماد کا
نکاح افریثم سے پڑھانے کو تیار ہوں تا کہ تم
لوگوں کی جگہ ہسانی نا ہو۔“ ممانی احیان کرنے
والے لہجے میں دلی خواہش بیان کر رہی تھیں، عماد
کے چہرے پہ بھی جیسے جیت کی چمک آنے لگی
تھی، سیما کو کموں کی کیفیت میں پڑ گئیں۔

”معذرت ممانی جان! میرا کل بھی انکار تھا
اور آج بھی انکار ہے۔“ افریثم حیات نے دو
ٹوک لہجے میں کہا تو ممانی کے چہرے پہ غصہ جھلکنے

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

☆ اردو کی آخری کتاب.....

☆ غمار گندم.....

☆ دنیا گول ہے.....

☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....

☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....

☆ چلتے ہو تو چین کو چلئے.....

☆ ٹکری ٹکری پھر مسافر.....

☆ خط انشاجی کے.....

☆ بستی کے اک کوپے میں.....

☆ چاند بگر.....

☆ دل وحش.....

☆ آپ نے کیا پردہ.....

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

☆ قواعد اردو.....

☆ انتخاب کلام میر.....

ڈاکٹر سید عبداللہ

☆ طیف نثر.....

☆ طیف غزل.....

☆ طیف اقبال.....

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبرز 7321690-7310797

لگا، عماد کا بھی برا سامنہ بن گیا۔

رکھ کر خود بھی آبدیدہ ہو گئے۔

”اب سے آپ کوئی رابطہ نہیں کریں گے کسی سے اور اگر وہاں سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش ہو تو بھی آپ لوگ جواب نہیں دیں گے، میں اس قصے کو اسی کمرے میں ختم کر کے جانا چاہتی ہوں۔“ سیما بھی آگئی تھیں وہ بھی آبدیدہ تھیں۔

اک ماں باپ کے لئے مرنے سے بڑا مقام تھا کہ بیٹی دلہن بنی بیٹی تھی اور بارات نہیں آئی تھی، حیات صاحب پولیس میں رپورٹ کرنے کی سوچ رہے تھے، لیکن بیٹی کی تنبیہ پہ سر ہلاتے واپس چلے گئے کہ جلد سے جلد مہمانوں کو رخصت کر کے وہ بھی لئے بچے گھر کی راہ لیں، باہر کی چھ گیونیاں افریثم حیات کے کردار پہ اٹھی اٹکیوں پہ ان کا مبر کمال کا تھا۔

”ساری دنیا جانتی ہے، میں فلرٹی ہوں تم پھر بھی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو، تمہیں ڈر نہیں لگتا، اگر جو میں عین بارات والے دن منظر سے غائب ہو جاؤں تب..... تب تم کیا کرو گی۔“ ریان مرزا اپنی آنکھوں میں شریسی چمک لئے دیوار پہ کہنی نکائے شرارت سے استفسار کر رہا تھا۔

”بھلے ماضی میں فلرٹی تھے مگر اب مجھ سے محبت کرتے ہو، ان معاملوں میں عورت کا دل جھوٹ نہیں بولتا، اگر تمہاری زندگی میں ان لڑکیوں کی ذرا بھی اہمیت ہوتی جن سے تم نے فلرٹ کیا ہے تو میرے ساتھ بھی سنجیدہ نہ ہوتے، اپنی فیملی کو انوالو کر کے اتنی جلدی رشتہ طے نہیں کرتے اور اتنا کچھ کر کے کون بھاگ سکتا ہے۔“ افریثم حیات نے جیسے اسے جھٹلایا تھا اور اس جھٹلانے میں بہت حد تک ریان مرزا کی محبت تھی، جس نے بری طرح سے اپنے حصار میں

”ہونہہ، نخرے ختم نہیں ہو رہے، دس جگہ منہ مارنے والے کے ساتھ منہ کالا کیا ہو گا تب ہی تو اس کے لئے مری جا رہی ہے جس نے تم کو کتنا بھی پسند نہیں کیا، مگر بند کر کے بھاگ گیا۔“ ممانی کے لہجے سے شرارے نکل رہے تھے، افریثم حیات کا وجود سلنے لگا تھا، ممانی، عماد کا ہاتھ پکڑ کر اس سے اترتی اونچی آواز میں برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

”پاپا سے کہیں، مہمانوں کو کھانا کھلا کر رخصت کریں اور اب سے ریان یا اس کی فیملی کو کوئی کاٹیکٹ نا کریں۔“ افریثم حیات دو نوک لہجے میں کہہ کر خود ہی اٹھ کر ڈرینگ روم کی طرف بڑھ گئی تھی، اس میں اب لوگوں کی ہلکی اڑائی نظریں برداشت کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

چند ہی ثانیے میں غڈ حال سے حیات صاحب ڈرینگ روم میں آئے تھے، باہر شور سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کھانا لگ چکا ہے۔

”مرزا بھائی کا فون آیا ہے، وہ بہت شرمندہ ہیں، مگر مہمانوں سے بھرا ہے ان کا، مگر ریان کا کہیں کچھ پتا نہیں۔“

وہ اپنے دو بیٹے سے ہیرو پن، سیفٹی پن نکال کر گھنٹوں میں سجایا گیا عروسی روپ بگاڑنے میں لگی تھی، حیات صاحب کے دل کو دھکا لگا تھا، جس نازوں پٹی بیٹی کو وہ آج یہاں سے رخصت کرنے کے ارادے سے آئے تھے، وہ گھڑی آ کے ہی نہیں دے رہی تھی۔

”مجھے معاف کر دیجئے گا پاپا، ریان مرزا میری پسند تھا اور آپ میری وجہ سے دھمی ہیں، سب کو جواب دہ ہیں۔“ اس کا ضبط جواب دے گیا تھا، ایسی دھکار کا تو اس نے کبھی سنے میں بھی نہیں سوچا تھا، حیات صاحب اس کے سر پہ ہاتھ

لے لیا۔

”اتنا بھروسہ اک فکرٹی پہ، جو تمہارے سارے یقین کو توڑ کر بھاگ جاؤں؟“ وہ جیسے اسے زچ کرنے کے موڈ میں تھا، افریشم حیات کے لہجے کا یقین جہاں اسے حیران کر رہا تھا، وہی وہ نہال بھی ہو رہا تھا، اپنی ذات یہ شاید اسے خود پہ اتنا یقین نہیں تھا جتنا افریشم حیات کر رہی تھی۔

”پھر بھی مجھے غلط ثابت کرنے کو تم بھاگ سکتے ہو تو بھاگ کے دکھاؤ۔“ اس نے اپنا پرس کھینچ مارا تھا اور اس کا ہتھکڑیاں بھر گیا تھا اس نے اپنا کپڑا بچ کر دکھایا تھا، افریشم حیات کے اندر موت ہو گئی تھی، اسے وہ رہ کر ریان مرزا کی اک اک باتیں یاد آ رہی تھیں، اسے اپنا یقین خود ہی مذاق اڑاتا محسوس ہو رہا تھا، اس کی آنکھیں لال کرتا جا رہا تھا۔

سہاگ کی چوڑیاں اتارتے اس کا دل دکھ سے بھٹے جا رہا تھا، یہ تمام چیزیں ریان مرزا نے اسے خود ساتھ لے جا کر دلائی تھیں، اسے لگتا تھا وہ ہی غریبی اور کرپزی ہے، لیکن عروسی جوڑے اور میچنگ چیزوں کے لئے جتنا ریان مرزا کرپزی نظر آ رہا تھا اس پہ افریشم حیات کو بھی حیرت ہو رہی تھی، لیکن یہ حیرت اس وقت رفع ہوئی جب اس نے اک اک چیز بہترین پسند کی۔

”تو بہ..... میں تو تھک گئی۔“ جوس پیتے ہوئے وہ دہائی دیتے شکر ادا کر رہی تھی کہ بارات کی ساری شاپنگ تو مکمل ہوئی۔

”اتنی جلدی ہمت ہار گئیں، ابھی تو تمہاری ہمت آزمانے کے دن شروع ہوئے بھی نہیں۔“

اسٹرامنہ میں ڈالے وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ وہ بلا کا وجہ تھا، خوبصورت، دلنشین لہجہ، دلکش انداز کا حامل تھا، رکے تو ستارے ٹھہر کر دیکھتے ہیں غالباً اس پہ فٹ تھا۔

افریشم حیات کو اس کا اک اک قابل گرفت جملہ یاد آ رہا تھا جو وہ محبت میں دیکھ نہیں پائی تھی، حقیقت کے آئینے میں پرکھ نہیں سکی تھی۔

”تم نے پلاننگ سے چال چلی اور میں محبت کو بچ مان کر بے وقوف بنی چلی گئی۔“ اس کے لفظ ٹوٹ گئے تھے، آنسو تیزی سے کا جل بہا لے جا رہے تھے، اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کھیل گیا ہے۔

☆☆☆

”سوری یار! دیری سوری، مجھے آنے میں دیر ہو گئی، بس ٹریفک میں پھنس گئی تھی۔“ افریشم حیات ریسٹورنٹ میں تیزی سے داخل ہو کر ہال پہ نظر دوڑانے لگی تھی، اکلوتی سہیلی فضا اپنے کزن یادو کے ساتھ اسے جلد ہی نظر آ گئی تھی جس کے پاس آ کر اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، دوران ڈرائیونگ بھی فضا کی کئی کال آ چکی تھی، وہ اسے جلدی پہنچنے کو کہہ رہی تھی، فضا اور یادو اک دوسرے سے محبت کرتے تھے، فرسٹ کزن تھے، مگر دونوں کی ماؤں کے درمیان کی کشیدگی سے ان کے رشتے کو کسی بھی گھر میں قبولیت کا درجہ نہیں دیا جا رہا تھا، ایسے میں فضا اور یادو بہت پریشان تھے، دونوں ہی کو کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح محبت سے دونوں گھرانے بخوشی شادی کے لئے مان جائیں اسی سلسلے میں فضا نے اپنی عزیز سہیلی کو زحمت دی تھی کہ سب سر جھوڑ کر بیٹھتے تو شاید کسی کو کوئی حل مل ہی جائے۔

افریشم حیات، یادو سے فضا کے گھر کئی بار مل چکی تھی، اچھی ہیلو ہائے تھی۔

”یہاں میں پریشان بیٹھی ہوں اور تم ٹریفک میں پھنسی ہوئی تھی۔“ فضا نے دیکھتے ہی منہ بسورا۔

”یادو! پتا کرو، بھابھی کی قانونی مشیر کہیں

افریثم حیات بھی چپ کر کے بیٹھ گئی کہ پہلے مسئلہ تو حل ہو جس کے لئے وہ آئی تھی، مقابل کو پھر بھی دیکھ لے گی۔

”بھئی خالی پیٹ تو میں کچھ بھی نہیں دے سکتا حتیٰ کہ مشورہ بھی نہیں، پہلے کچھ آرڈر کرو تا کہ کھانوں کا نام سن کر ہی دماغ جلنے لگے۔“ ریان مرزا آرام سے ناگلیں پھیلا بیٹھ گیا تھا کچھ اس طرح کہ اس کا جو گرز والا پیر افریثم حیات کی ہائی ہیل سے جا گرایا۔

”سوری۔“ افریثم حیات کے لبوں کو کھلتے دیکھ کر ریان مرزا نے غیر ارادی حرکت پہ معذرت کی تو افریثم لب سمجھ کر رہ گئی۔

”اتنی بڑی موبائل کمپنی کے آئرن ہٹا اور اتنا فضول۔“ افریثم حیات سوچ کر رہ گئی، وہ اسے کوئی لوفری سمجھ رہی تھی جیسے اپنی وجاہت کا راج کے احساس تھا لیکن یاد کے تعارف کروانے پہ اسے حیرت ہوئی تھی۔

”تو بھی نا۔“

یاد کی ٹینشن سے جان نکل رہی تھی کیوں کہ فضا کا ایک اچھا رشتہ نکھال سے آیا ہوا تھا اور فضا کی والدہ نے تقریباً رضامندی بھی ظاہر کر دی تھی تب ہی تو آنا فانا یہ میٹنگ بلائی گئی تھی، لیکن ریان مرزا کی غیر سنجیدگی ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

”پہلے تو ہر دو منٹ پہ آپ کا سیل فون بج رہا تھا اور آپ ایکسیکوزی کہتے بار بار بھاگ رہے تھے اور اب آپ کو بھوک لگ رہی ہے..... اور..... او بھائی..... تو یہ سب کرنے آیا ہے یہاں؟ پہلے میرے مسئلے کا حل بتا۔“ ویٹر کو لمبا چوڑا مینو لکھوا کر جب ریان مرزا فری ہوا تو یاد بلبلایا گیا، پہلے یاد آرڈر لکھوا رہا تھا لیکن جب ریان مرزا رانچ سے ملے قہر دینے لگا تو یاد نے ہاتھ اٹھائے۔

ایکسٹنٹ میں چل تو نہیں بسیں؟“ وہ فضا کو جواباً کچھ کہنے ہی لگی تھی جب اک شخص سیل فون پہ نظریں جمائے ٹیکسٹ ٹائپ کرنا ان تک آتے بول پڑا۔

”ایکسیکوزی!“ افریثم حیات، یاد کے سامنے براجمان ہوئے شخص کو بے ساختہ ٹوک گئی، اتنا تو وہ جان گئی تھی مقابل نے اسی کے متعلق گوہر افشانی کی تھی، تب ہی اس کی تیوری چڑھ گئی تھی۔

”لیں!“ خشک ٹیکھی آواز پہ اس نے اپنے سیل فون سے نظر اٹھا کر سامنے موجود ہستی پہ اک سرسری نظر ڈالی تھی۔

افریثم حیات بلو جینز وہاٹ شارٹ شارٹ پہ کون اسکارف اونچی گردن کے پیچھے باندھے ہائی پونی ٹیل کیسے بایل شولڈر پہ ہینڈ بیگ لٹکائے اس کے اسٹریپ پکڑے تیوری چڑھائے اسے گھور رہی تھی، جو بلو جینز، وہاٹ لی شارٹ میں رف اینڈ ٹف لگ رہا تھا، ریان مرزا کا خیال تھا اس کی سرسری نگاہ فوراً ملیٹ آئے گی لیکن جب اس کے ہاتھ نے فریزر کا گھنٹل دیا تو اس کے شعور نے سمجھوڑ کر احساس دلایا کہ مقابل عام ہستی نہیں جو نگاہ فوراً پلٹ آئے۔

”اب تم دونوں لڑنا شروع نا کر دینا، افریثم یہ میرا بیسٹ فرینڈ ریان مرزا ہے سیلور موبائل کمپنی کے آئرن ہٹا بیٹا ہے اور ریان یہ افریثم حیات ہیں فضا کی بیسٹ فرینڈ، تم دونوں کو آج اسی لئے مدعو کیا ہے ہم دونوں کو مشورہ دو، ہم کیا کریں۔“ دونوں کے تپور دیکھ کر یاد فوراً میدان میں کودا تھا تب تک فضا بھی افریثم حیات کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا چکی تھی، وہ چاروں کچھ اس طرح بیٹھے تھے کہ افریثم حیات کے مقابل ریان مرزا یاد اور کے مقابل فضا۔

”وہ کیسے؟“ ریان مرزا اپنے پلان کی ریجنلشن پہ ابرو اچکا گیا۔

”یہ اتنی لائگ پلاننگ کون کرے گا؟ پہلے لڑکا اور فیملی ڈھونڈو اور جو لڑکا پیچھے ہٹنے کی بجائے شادی پہ بعد ہو گیا پھر؟“ افریقہم حیات سخت تیوروں سے اسے گھور رہی تھی۔

”وہ ہماری سینگ ہو گا، کیسے بعد ہو گا۔“ ریان مرزا نے جرح کیا۔

”چلیں یہ بھی مان لیا، لیکن اس تمام اسٹوری کو بہاتے ہوئے آپ اک چیز فراموش کر رہے ہیں اور وہ ہے فضا کا کردار۔“

”یہ سب اک پلان ہو گا یہ سب صرف ہم چاروں لوگ جانتے ہیں یا وہ لڑکا اور اس کی فیملی جو کردار ادا کریں گے، باقی دوست احباب جو ہزاروں کی تعداد میں شادی میں شرکت کریں گے، بارات وقت پہ نا پہنچے پہ وہ فضا کے متعلق کیا کیا باتیں کریں گے، کیسے کیسے الزام لگائیں گے یہ سوچا ہے آپ نے؟ فضا کے والدین کی کیا عزت رہ جائے گی سوسائٹی میں؟ بھلے اس وقت یاور بھائی ہیرو بن جائیں گے مگر آپ فضا اور اس کی بے عزتی کو فراموش نہیں کر سکتے۔“

ہائی فائی ماڈرن لک اور چلیے والی لڑکی کیا کہہ رہی تھی، ریان مرزا آنکھیں پھاڑے اس کے اندر کی ”بہن جی“ کو ڈھونڈ رہا تھا۔

”اک لڑکی اور اس کی فیملی کے لئے مرنے جتنا مقام ہو گا یہ، بھلے پری پلان ہو سب، بھلے یاور اور فضا کی شادی وقت کی نزاکت کا فائدہ اٹھا کر ہو جائے مگر لوگ نہیں بھولتے، شادی اک بے حد خوبصورت دن کا نام ہے، یہ کن حوالوں سے یہ دن یاد رکھیں گے، لوگ طعنے دے دے کر چیخے نہیں دیں گے، ساری زندگی ہستے رہیں گے، پارٹی اور ڈنر میں ان کی شادی کو بیٹھ کر یاد کرتے

”لے بھائی تو یہی آرڈر کر لے۔“

”یہ کس نان سپر لیس بندے کو اٹھا لائے ہیں یاور بھائی؟“ افریقہم حیات، فضا کے کان میں منمنائی تھی، فضا ٹینشن میں تھی مگر پھر بھی مسکرا دی، وہ ریان مرزا کو جانتی تھی، یاور کا بیسٹ فرینڈ ہونے کے ناطے وہ بھی اس کی خوبیوں، خامیوں سے آگاہ تھی۔

”چلو جی آ جاؤ اب مددے کی طرف، جس کے لئے یہ بزم تھی ہے۔“ ریان مرزا سیدھا ہوا تو سب ہی سستی کو چھوڑ کر سیدھے ہو بیٹھے جو اعلان تھا کہ اب محفل جگمگاتی ہے، چاروں کے سر گول دائرے کی صورت میں آگئے تھے۔

”کورٹ میرج تم لوگ کرنا نہیں چاہتے، فیملی کی سپورٹ میں شادی کرنا چاہتے ہو تو اس کا اک بیسٹ فارمولا ہے میرے پاس۔“

”سب سے پہلے فضا بھانجی کے لئے اک اچھا سا لڑکا ڈھونڈو جو ہر لحاظ سے ان کی فیملی کو پسند آ جائے، شادی طے ہو جائے اور شادی کے دن عین ٹائم پہ لڑکا بارات لے کر نا آئے، خاندان کی عزت بچانے کو یاور آ کر کہے کہ اسی وقت شادی کرے گا فیملی کے پاس عزت بچانے کے لئے اس وقت کوئی اور حل نہیں ہو گا اور یوں شادی ہو جائے گی۔“

ریان مرزا کولڈ ڈرنک کے سیپ لیتا پلان سنارہا تھا، یاور اور فضا کو بھی شاید ریان مرزا کے پلان میں دم لگا تھا تب ہی وہ دونوں چپ سے ہو کر اک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے تھے، اس نے داد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا جو بے حد حیرانگی سے اسے دیکھ رہی تھی، شاید اسے پلان بہت فضول لگا تھا اور وہی ہوا۔

”سچ آ اسٹوڈ اسٹوری؟“ افریقہم حیات نے بے حد برا سامنہ بنایا تھا۔

کی کسی کے ساتھ جتنی شہرت مل گئی، وہ بھی دودل کو اک کرنے کے لئے، میں نے اسی پلان پہ عمل کیا تھا اور عین وقت پہ نکاح کیا تھا، وہ دونوں تو مل گئے اور میں فلٹری مشہور ہو گیا۔“ اس نے منہ بسور کر اپنا تجربہ بتانے کے ساتھ وجہ شہرت بھی بتا دی۔

”اور آپ پھر بھی حوالے کی اہمیت کو فراموش کر رہے ہیں؟“ افریشم حیات نے احساس دلایا۔

”خیر اب بندہ اتنا بھی معصوم نا ہے۔“ یادور نے ٹکڑا لگایا، وہ یادور کو گھور کے رہ گیا۔

”عقل آپ کی دلیل مان رہا ہے آنسو افریشم حیات صلب، آپ کی نظر میں اسے مسئلے کا حل کیا ہے، دونوں ریلوے ٹریک پہ آ جائیں یا نئی جیٹی پل سے چلا گنگ لگا کر امر ہو جائیں، یا پھر یادور فضا بھا بھی کو شوٹ کر کے خود کو بھی جہنم واصل کر لئے؟“ ریان مرزا معصوم بن کر اتنی معصومیت سے دریافت کر رہا تھا کہ یادور اسے کچا چبانے کا سوچنے لگا۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ افریشم حیات کا جی چاہا اس کا سر پیٹ ڈالے۔

”محبت کی منزل جائز و ناجائز طریقے سے شادی ہی نہیں ہوتی، ہماری بنیاد اسلام ہے جس میں والدین کے ساتھ زور زبردستی کا بھی حکم نہیں، تا ہی اولاد یہ فرض ہے کہ والدین جہاں چاہیں وہاں شادی کر دی اور اولاد بے دلی سے حکم بجا لائے، کیونکہ روز آخرت میاں بیوی سے متعلق سوال ماں باپ سے نہیں ہوگا، ہم سے پوچھا جائے گا ہم نے اپنے ہم سفر کے حقوق پورے کیے یا منکر رہے، تب ہم کیا جواب دیں گے کہ نہیں والدین نے زور زبردستی سے شادی کروا دی اور جب اس زبردستی کے رشتہ کو دیکھنے کو دل

رہیں گے۔“ افریشم حیات کے مدلل انداز پہ سب چپ رہ گئے تھے، جی کہ ریان مرزا بھی، فضا اور یادور جو ریان مرزا کی بات سن کر تھوڑے ریلیکس نظر آ رہے تھے کہ شاید مسئلہ حل ہو گیا افریشم کے نقطہ نظر سے مکمل اتفاق کرتے اب وہ دونوں اک دوسرے کو دیکھتے مشکوک نظر آنے لگے تھے۔

”سوسائٹی کو گوسپ چاہیے، اچھا ہو تب بھی، برا ہو تب بھی اب کیا لوگوں کے ڈر سے ہم ان کے مطابق چلیں؟“ ریان مرزا نے منجمل کر اختلاف کیا۔

”بے شک ہمیں کسی کے مطابق نہیں چلنا چاہیے، سوسائٹی کو گوسپ کی عادت ہے، یہ بھی بجا ہے، لیکن اپنے والدین کی پگڑی اچھالنا بھی ہمیں زیب نہیں دیتا، جیسے تیسے شادی ہو جاتی ہے لیکن اچھا برا احوال مدتوں یادورہ جاتا ہے، انسان اپنے بچوں کو اپنی سنہری یادوں میں شامل کرتا ہے، برے خوابوں میں نہیں جس طرح انسان مر جاتا ہے لیکن اس کا کردار زندہ رہتا ہے، کبھی اچھے حوالے سے بھی برے۔“ فضا اور یادور، افریشم حیات کی سمجھ داری سے کی گفتگو پہ سر ہلا رہے تھے۔

”آپ حلیے سے تو اتنی قدیم نہیں لگتیں جتنی آپ کی سوچ ہے۔“ ریان مرزا ہاتھ کی مٹھی بنا کر لبوں کے کنارے پہ نکاح گرجرت کا اظہار کر گیا، افریشم حیات کے لب پہنچ گئے۔

”اوے یہ تیرے ٹائپ کی نہیں ہے، فلرٹ کی کوشش نا کر۔“ یادور نے اسے پٹری سے اترتے دیکھ کر آواز لگائی، ریان مرزا کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورنے لگا، غالباً اپنی تعریف اسے گراں گزری تھی اور افریشم کی جتنی مسکراہٹ مزید سلگا گئی کہ حوالہ یادورہ جاتا ہے۔

”تاریخ گواہ ہے میں نے اتنی فلرٹ نہیں

افریثم حیات کی طرف متوجہ ہوا جو فضا کے آنسو پونچھنے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

”بے شک محبت امتحان لیتی ہے، ریان صاحب کی پلاننگ سے تم یاد رہائی کو پالو گی مگر اپنا کردار ہمیشہ کے لئے خود کو، ساری زندگی کے لئے اک براحوالدین کر رہ جاؤ گی، بارات نا آنے کی جو بھی وجہ ہو، قصور لڑکے کا ہی ہو مگر دوش لڑکی کو نہیں لیا جاتا ہے، اس کا کردار تماشا بن جاتا ہے، تم کس کس کو بتاتی پھر دو گی کہ یہ سب پری پلان تھا، جن لڑکیوں کے ساتھ یہ سب سچ میں ہوتا ہے ان سے پوچھو جا کے۔“

شاید فضا کمزور پڑ رہی تھی، وہ ریان کے پلان کو فالو کرنا چاہ رہی تھی، جب ہی افریثم اس کی برین واشنگ کر رہی تھی۔

”فرض کریں، آپ کے ساتھ سیم پویشن ہو کہ کبھی آپ کی بارات نا آئے اور وہ آپ کا من چاہا بھی ہو، تب آپ کیا کریں گی، بھول جائیں گی اسے؟ لعنت بھیج دیں گی اس پر؟ کہیں اور شادی کر لیں گی؟ اس دن نا سہمی پچھ عرصہ بعد سہمی؟“ فضا اور یاد کو تنہائی فراہم کرنے کے وہ دونوں بالنگنی کی طرف آگئے تھے، تاکہ وہ دونوں ملے کر لیں کہ کیا کرتا ہے۔

وہ خاموشی سے ہوٹل کے لان میں پرندوں کو دیکھ رہی تھی، جب ریان مرزا نے اس سے بے ساختہ سوال کیا۔

”محبت کا راگ الاپنے والا جان بوجھ کر ایسی حرکت کرتا ہے تو وہ اپنی محبت سمیت ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے گا اور ایسے شخص کے حوالے سے مزید کیا بات کرنا۔“ اس کے سوال پر پہلے تو افریثم حیات نے جواب دینا ضروری نا سمجھا لیکن پھر اس کے چہرے کی سنجیدگی پر لامحالہ جواب دینا پڑا۔

”نہیں ہوتا تھا تو خوش کیسے رکھتے، کیسے بھاتے؟“ افریثم حیات کے سوال کڑے تھے، حقیقت یہی تھی تھے، ریان مرزا کو اک بار پھر ہزار دولت کا جھٹکا لگا تھا، اکیسویں صدی کا ماڈل اور سترہویں صدی کا ورژن۔

”پھر کیا کریں؟ یہ ہی تو ابھرن ہے جب ہم دونوں کسی اور کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔“ یاد جھنجھلا رہا تھا، فضا بھی کچھ پریشان نظر آنے لگی تھی۔

”آپ دونوں اپنے اپنے والدین سے صاف لفظوں میں کہہ دیں، کہ شادی کریں گے تو اک دوسرے سے ورنہ نہیں، وہ لوگ جیتیں گے بلیک میل کریں گے آپ لوگوں کو جب پتا ہے کہ کسی اور کو قبول نہیں کر سکیں گے تو تیسرے چوتھے کی زندگی برباد کرنے سے بہتر ہے، مہر سے محبت کو دل میں بسائے بیٹھے رہیں، کبھی تو آپ دونوں کی سچی محبت اللہ رب العزت کی نظر میں معتبر ٹھہرے گی اور آپ کے والدین کو بھی سمجھ آ جائے گی، ماں باپ کب تک بچوں کی ضد کے آگے ڈٹے رہتے ہیں، وہ من پسند کھلونا لا کر دے ہی دیتے ہیں بس آپ رو کر مانگنے کا فن سیکھیں، جس سے اللہ بھی راضی ہو جائے گا اور وہ آپ دونوں کے والدین کے دل بھی پھیر دے گا۔“

”سہر افریثم!“ یاد اسے سراہ کے رہ گیا، فضا کی آنکھیں پھر آئیں تھیں، جہاں یاد سے محبت تھی، وہیں وہ اپنے والدین کو بھی کھونا نہیں چاہتی تھی، افریثم حیات کی بات اس کے دل کو بھی لگی تھی۔

”یہ اولڈ ورژن آخری بار اپ ڈیٹ کب ہوئی تھی۔“ ریان مرزا یاد کے کان میں گھسا ہوا تھا، یاد نے اسے دھکا دیا، وہ مسکراتے ہوئے

”کریزی!“ ریان مرزا نے ہونٹ سکڑے۔

”نہیں آئی ایم۔“ اس نے شانے اچکا کر اعتراف کر لیا۔

”چلو بھی ڈن ہم افریٹیم حیات کے پلان کے ساتھ جائیں گے، باقی سب اللہ کے حوالے۔“ اس کھڑی یاد اور فضا بھی آگئی تھی، دونوں کے آسودہ چہرے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ دونوں اپنے فیصلوں سے مطمئن ہیں۔

وہ سب اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے تھے اور جب گھر جا کر دونوں نے اپنے اپنے والدین کو اپنا ختمی فیصلہ سنا دیا تو ان کے تاثرات نے احساس دلادیا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔

”نفا جب میں نے ماما سے کہا کہ تم سے شادی نا ہوئی تو کسی سے نہیں کروں گا، لیکن آپ کے خلاف جا کر کوئی غلط قدم بھی نہیں اٹھاؤں گا تو ماما کی شکل دیکھنے والی تھی، جیسے چھوٹے بچے کی ضد سے ماں پریشان ہو جاتی ہے۔“

”افریٹیم نے بالکل سہی مشورہ دیا، اک دوسرے کی فیملی کے خلاف جا کر اپنے کردار کو داغ دار کر کے بھی ہم اک دوسرے کو پالیں تو ساری زندگی کے لئے لوگوں کے ذہنوں میں اک برا حوالہ چھوڑ جائیں گے، مبرا کا پھل انشاء اللہ ہمیں اچھا ہی ملے گا۔“ نفا بھی مطمئن تھی۔

☆☆☆

ریان مرزا دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے فرصت سے افریٹیم حیات کو سوچ رہا تھا، جب کہ دوسری طرف افریٹیم حیات کے ذہن میں ریان مرزا کا خیال آیا بھی تو اس نے استغفر اللہ کہہ کر ذہن ہی جھٹک دیا۔

”مجھے افریٹیم حیات سے محبت ہوگئی ہے۔“

اگلے چند روز بعد وہ یاد کے روبرو تھا۔

”اوبھائی، تو کیوں بیٹے والے کام سوچ رہا ہے، وہ سنے گی تو سر بھاڑ دے گی تو اس بار غلط جگہ ٹرائی کرنے کا سوچ رہا ہے میرے بھائی، وہ تیری فلرٹی طبیعت کی ایسی کی ٹیسی کر دینے والی لڑکی ہے، جانے اس دن بھی تیری اوگٹی بوگٹی باتوں کو اس نے کیسے برداشت کیا۔“ یاد رستے ہی بھڑک اٹھا۔

”میری باتیں اوگٹی بوگٹی ہوتی ہیں تو کیوں مشیر بنا کر بلوایا تھا تو نے، اور تجھ جیسے دوست ہی ہوتے ہیں جو دوست کا بھلا نہیں کرتے، جی کہہ رہی تھی وہ افریٹیم حیات برا حوالہ ساتھ رہتا ہے، مانا فلرٹی تھا، لیکن جب فلرٹ چھوڑ کر جی محبت کرنے لگا ہوں تو تم فلرٹی فلرٹی کہہ کر میری محبت کو پتھر مارو گے؟“ ریان مرزا دودھو مقابلے پہ آ گیا تھا، یاد آ نکھیں بھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

”وہی محبت جو تمہیں ہر دوسرے دن ہر تیسری لڑکی سے ہو جاتی ہے؟ میں کسی انہوئی یہ اعتبار نہیں کر سکتا۔“ یاد سخت بدگمان تھا، ریان مرزا بھنا گیا۔

”اب کیا اپنی رگ کاٹ کر تمہیں دھماؤں یا خون سے خط لکھ کر دوں تب تمہیں یقین آئے گا کہ مجھے واقعی اس اولڈ ورژن سے محبت ہوگئی ہے۔“ اس کے سنجیدہ لب و لہجے نے یاد کو، اسے بغور دیکھنے پہ مجبور کر دیا، اپنی بے پناہ دجاہت کے ساتھ وہ حسب معمول ویل ڈریسٹ تھا اور بہت پیئڈ کم لگ رہا تھا۔

”کھا اپنی قسم کہ تو واقعی سیر لیس ہے؟“ یاد ابھی تک شک میں جلتا تھا تب ہی قسم بھی خود کی ہی کھا نے کو کہا، اس چالاکی پہ ریان مرزا اسے گھور کر رہ گیا۔

”تیری قسم میں بے حد سیر لیس ہوں۔“

ریان مرزا بھی اک کانیاں تھا، یاد رہو پہلو بدل کے رہ گیا۔

”مان لیا، تجھے محبت ہو گئی تو جا کر افریقہ حیات کو بول نا مجھ سے کہنے کا مقصد؟ اب کیا میں کبوتر بن کر تیرا پیغام پہنچاؤں؟“

”نہیں تو بس منہ بند کر لے جو کرنا ہے میں خود کروں گا، غلطی کی جو تجھ سے اپنی فیلنگو شیر کی، اس سے تو بہتر ہوتا میں فضا بھانجی سے شیر کر لیتا، کر لوں گا خود ہی کچھ نا کچھ، ضرورت نہیں تیری۔“ یاد رکھو دل بھر کر باتیں سنا کر وہ جھٹکے سے جیکٹ اپنے شانے پہ ڈالتا زن سے گاڑی نکال کر لے گیا، پیچھے یاورا سے آوازیں دیتا رہ گیا۔

☆☆☆

”افریقہ حیات مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔“ شوخی سمیت کہ ریان مرزا کو اگلے ہی روز افریقہ حیات فضا کے ساتھ مال میں مل گئی تھی۔

فضا جو تیاں پہن پہن کر خرائی کر رہی تھی، اس سے ذرا پرے افریقہ، ہینڈ بیگز کو دھپسی سے دیکھ رہی تھی، جب ریان مرزا نے ہنا کسی لفاظی یا لمبے چوڑے ڈائلاگ کے دو ٹوک انداز میں کہہ دیا تھا۔

افریقہ حیات اچانک سے آئی آواز اور دھونس سے کہے گئے جھلے پہ اک ٹاپے کو ٹھیک مٹی تھی، اس نے جھٹکے سے گردن بائیں طرف گھمائی تھی اور ریان مرزا کو اپنی مکمل وجاہت کے ساتھ سرو قد پا کر وہ جیسے کچھ بچھے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔“ اب کے اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”تو.....؟“ افریقہ حیات نے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھ لئے، انداز ایسا تھا جیسے وہ اسے سنجیدہ لینے کو تیار نہ ہو۔

”تو..... وہاں..... یعنی آپ کے لئے یہ اک معمول کا ڈائلاگ ہے کہ ریان مرزا آپ سے محبت کا اظہار کر رہا ہے۔“

افریقہ حیات کی اہمیت نا دینے والی ادا ریان مرزا جیسے لیڈی کلر کو نا گوار گزر رہی تھی۔

”محبت آپ کو ہوئی ہے، آپ اظہار کر رہے ہیں، آپ کا مسئلہ ہے، اس میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔“

”کچھ نا کریں، چلو بھر پانی لا کر دیں تاکہ میں اس میں ڈوب مروں۔“ وہ ٹھیک ٹھاک جل کے بھسم ہو گیا، یعنی حد ہو گئی تھی، وہ جسے کئی دن لگے تھے خود کو باور کروانے میں کہ وہ پہلی بار گرفتار

محبت ہوا ہے اور دوسری طرف افریقہ حیات اسے سنجیدہ لینے کو تیار ہی نا تھی، خود ریان مرزا کے لئے اپنی فیلنگ بہت حیران کن تھی کہ کسی کی ایک جھٹک اس کی محبت میں گرفتار کر سکتی ہے، لیکن وہ اک جھٹک سے آگے کی بات تھی۔

افریقہ حیات کی صورت سے زیادہ اس کے لفظوں نے سمسراؤں کیا تھا، جس خوبصورتی سے وہ دو دلوں کے احساسات کو مد نظر رکھتے عزت کے حوالوں کو اہمیت دے رہی تھی اس نے

اسے اسیر کر لیا تھا، حقیقتاً ان لمحوں میں اسے اپنا پلے بوائے والا حوالہ بد نما داغ لگ رہا تھا اور اب وہ اس داغ کو ہی مٹانا چاہ رہا تھا، لیکن افریقہ اسے سنجیدہ لینے کو تیار ہی نا تھی۔

”بہتر ہو گا آپ چلو بھر بانی بھی خود لے آئیں۔“ افریقہ حیات نے سر جھٹکا۔

”افریقہ حیات! میں بے حد سنجیدہ ہوں، تم بھی اپنی لاپرواہی کو سائیڈ پر کر دو، اپنے پیرش کو لے کر جلد ہی تمہارے گھر آؤں گا، ہاں کر دیتا۔“

اب کے ریان مرزا نے لفظ چپا چپا کے ادا کیے تھے، اس کے دھونس بھرے انداز پہ افریقہ حیات

اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی۔

☆☆☆

اور اس نے اپنا کھانچ کر دکھایا، جلد ہی ریان مرزا اپنے والدین کے ساتھ آدھکا، گوکہ حیات صاحب بھی بزنس میں تھے مگر ریان مرزا کی حیثیت ان سے کہیں زیادہ تھی اور ان کا تقاضا بھی انہیں خاصا حیران کر گیا تھا، سیما تو بری طرح متاثر ہو گئی تھیں، ریان مرزا کے والدین جس نرمی اور محبت سے ان کی بیٹی کا رشتہ مانگ رہے تھے یہ دیکھ کر انہیں خوشی ہو رہی تھی کہ حیثیت میں ان سے بلند ہونے کے باوجود تاہی انہوں نے کوئی اوجھا پن دکھایا تھا تاہی ان کے انداز میں ضرور تھا۔

سیما نے جب اسے ریان مرزا اور اس کے والدین کی آمد سے آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گئی، وہ شخص اپنے کہے کا پاس رکھے گا اس نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا، تب ہی تو وہ ساکت رہ گئی۔
”جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ، شکل دیکھو اپنی، بارلر گئے بھی جیسے تمہیں مہینوں ہو گئے۔“
سیما متھکر ماں بنی، تنقیدی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں، ایسی ماں جو بیٹی کے لئے آئے مہمانوں کو دیکھ کر بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتی ہیں۔
”کیا ہے مام ٹھیک تو ہوں۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا، سیما اسے جلدی تیار ہونے کا کہہ کر چلی گئی تھیں اور وہ سیما کا نکالا ہوا سوٹ چیچ کر کے جب تک آئینے کے آگے کھڑی ہوئی تو کچھ عجیب سے احساسات میں گھری رہی۔
پھر وہ بے دلی سے ان کے سامنے آئی تھی لیکن ریان مرزا کے والدین جس والہانہ انداز سے اٹھ کر ملے اس نے اس کا موڈ بھی خوشگوار کر دیا۔

ریان مرزا کی والدہ نے جھٹ اپنے کفن

اتار کر افریقہ حیات کو ”اب ہماری بہو ہے“ کہا، اس پہ سیما رے ارے کرتی رہ گئیں، ان کی جلد بازی حیات صاحب کو بھی پریشان کر رہی تھی۔

”ہمارا بیٹا آپ کے سامنے ہے بھائی صاحب، آپ کو جیسی تسلی کرنی ہے کر لیں، ہمیں تو ہماری بہو بہت پسند آئی ہے۔“ مرزا صاحب نے بھی کہا تو حیات صاحب بھی چپ سے رہ گئے، بلاشبہ لاکھوں میں اک رشتہ خود چل کر آیا تھا اور ان کی اکلوتی بیٹی کا طلب گار تھا۔

”آپ سوچ کر ہمیں جواب دے دیجئے گا، ہم جلد ہی منگنی کرنا چاہ رہے ہیں۔“ ریان مرزا مسکراتے ہوئے افریقہ کے ستیر چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

رات جب ریان مرزا نے اسے پہلی بار کال کر کے اس کے پیئرس کی رائے جاننا چاہی تو اس نے بھی بے ساختہ پوچھ لیا۔
”پیئرس تو اصلی تھے نا؟“
”ویری ٹی۔“ وہ چڑ گیا تھا۔

اور جانے کیوں افریقہ حیات کو ہنسی آگئی، جس والہانہ انداز میں وہ لوگ ملے تھے اس نے اسے چھڑنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

آنے والے دنوں میں ریان مرزا کی فیملی کا مزید والہانہ انداز دیکھ کر اسے سمجھ آگئی تھی کہ وہ ریان سے بہت محبت کرتے تھے اور پھر اکلوتے بیٹے کی پسند انہیں بھی بے حد پسند آتی تھی۔

”یوں تو سب کچھ ٹھیک ہے بس لڑکے کے متعلق عام رائے ہے کہ فلرٹی ہے۔“ حیات صاحب رشتہ قبول کرنے تذبذب کا شکار تھے اور جب اس نے ریان مرزا کو آگاہ کیا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”اپنے پیار سے کہو، ریان مرزا نے ساری سرگرمی چھوڑ دی ہے، اب میری کیا میری سطوں

کی تو یہ جو پھر کبھی فلرٹ کرنے کے بارے میں سوچوں بھی۔“ افریثم حیات کو بہت لمبی آئی تھی، نیما نے بھی سمجھایا تھا کہ شادی سے پہلے تقریباً تمام لڑکے فلرٹ کرتے ہیں، حیات صاحب کی حد تک راضی ہو گئے تھے۔

اس کی نظر میں بھی ریان مرزا کی کوئی خاص ایج نہیں تھی لیکن جب اس نے اپنے والدین کو بھیجا تو جانے کیوں اسے اس کے لفظوں پر اعتبار آنے لگا، فلرٹ کرنے والا رشتہ کب بناتا ہے اور اس میں بہت حد تک ہاتھ ریان مرزا کی محبت کا بھی تھا، بلاشبہ وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا، اسے دلوں کو کھر میں جکڑ لینے کا فن آتا تھا، کچھ اس کی شدتیں تھیں جنہوں نے افریثم حیات کو بھی اس کی طرف راغب ہونے پر مجبور کر دیا اور پتا ہی نا چلا کیسے ممکن ہوئے ہوتے وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوتی چلی گئی، فضا اور یادر بھی بے حد خوش تھے۔

فضا اپنی انخیال کے پاس آسٹریلیا چلی گئی تھی، یادر نے مزید اسٹڈی کے لئے انگلینڈ کا رخ کر لیا تھا، ایسے میں دونوں کی شادی طے ہو گئی تھی اور وہ دونوں فضا اور یادر کو بے حد مس کر رہے تھے، فضا کی انخیال میں کوئی ڈنچہ ہو گئی تھی جس کے باعث وہ شادی میں نہیں آسکی تھی اور یادر کے انگیزام چل رہے تھے۔

لیکن شادی کے نام پر جو کچھ ہوا وہ ناقابل فراموش تھا، افریثم حیات دہن بنی منتظر بیٹھی رہ گئی تھی اور ریان مرزا ابارات لے کر نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

وقت کا ستم تو دیکھیے صاحب خود گمزر گیا ہمیں وہیں چھوڑ کر وہ سب لئے پئے کھر لوٹ آئے تھے اک خاموشی تھی جس نے ان سب کا احاطہ کر رکھا تھا، حیات اور سیما سارا راستہ فکر مندی سے دہن بنی

بیٹی کو دیکھتے آئے تھے، خود ان کی حالت غیر ہو رہی تھی، لیکن کسی بھی والدین کے لئے یہ سب سے دل شکن لمحہ ہوتا ہو گا شاید..... لیکن وہ خود کو مضبوط ظاہر کیے بیٹھی تھی، لیکن اپنے کمرے میں تنہائی ملنے ہی اس کے صبر کا دامن تار تار ہو گیا تھا، وہ سسک سسک کے روز بیٹھی تھی، اس کے احساسات و جذبات پر گہرا گھاؤ لگا تھا، ریان مرزا اس کے ساتھ ایسا کرے گا؟ اس کے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا، لیکن ایک فلرٹی اور کربھی کیا سکتا تھا۔

اس نے تو شاید اک اور فلرٹ کیا تھا مگر افریثم حیات اس سے محبت کر بیٹھی تھی، کسی پہر محسوس نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کھیل رہا تھا، بس طریقہ واردات مختلف تھا اور اسی پر افریثم حیات دھوکا کھا گئی تھی۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ سب چپ تھے لیکن ان کے چپ رہنے سے دنیا والوں کی زبانیں کب بند ہوتی ہیں، ملنے جلنے عزیز رشتے داروں کی کال اور آمد کا تانتا لگ گیا، ہر کوئی اظہار ہمدردی کے بہانے ان کے ذمہ کرید نے میں لگا ہوا تھا، افریثم حیات تو کمرے میں بند ہو گئی تھی، اس میں لوگوں کے چھیٹے جگر کو پھٹنی کر دینے والے سوالوں کے جواب دینے کی ہمت نہیں تھی، حیات اور سیما بھی تھک سے گئے تھے، تب ہی حیات صاحب نے نیویارک کی ٹکٹ کروالی، اس معاملے کی گرد بیٹھنے تک وہ منظر سے ہٹ جاتے تو لوگوں کی دل شکن باتوں سے تو نجات مل جاتی، افریثم حیات نے کوئی حیل حجت نہیں کی تھی، وہ خود فرار چاہ رہی تھی، اپنے احساس سے اپنی سوچوں سے۔

یادر اور فضا بھی شکاڈر رہ گئے تھے، دونوں نے باری باری کال کی تھی اور افریثم حیات نے

انہیں سختی سے ریان مرزا سے متعلق کوئی بھی بات کرنے سے منع کر دیا تھا، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ چپ رہ گئے تھے، انہیں بھی ریان مرزا کی حرکت پہ بے پناہ غصہ تھا۔

☆☆☆

نیویارک آئے اسے کئی ماہ ہو گئے تھے جب کبھی درد کا احساس گہرا ہوتا تو اس کا جی چاہتا ریان مرزا کو کالر سے پکڑ کر جھنجھوڑ کر پوچھے اس نے اس کے ساتھ اتنا گھسیا کھیل کیوں کھیل۔

ریان مرزا اسچا ہوتا تو اس سے پلٹ کر رابطہ تو کرتا مگر نہیں شاید اس کا کھیل مکمل ہو گیا تھا تب ہی تو اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، اس کے لئے یہ کون سی نئی بات تھی، کئی ماہ نیویارک میں رہنے کے بعد بھی اس کے اندر کی خاموشی ناٹوئی تو وہ لوٹ آئی۔

خود کو مصروف رکھنے کے ہزار جتن کر کے اسٹڈی کی طرف دھیان لگانے لگی، سیمانے چند رشتوں کا تذکرہ کیا تھا جسے سنتے ہی اس نے انکار کر دیا تھا کہ اب اس کے سامنے شادی کی بات نا کی جائے، دلہن بننے کی اذیت اسے بھولی نہیں تھی، سیمانے بھی چپ سادھ لی کہ شاید ابھی اسے مزید وقت کی ضرورت تھی، سیمیا اور یاد بھی لوٹ آئے تھے اور انہیں بڑا دلہنوں میں دونوں نے اسے نیوز دی کہ دونوں کے گھر والے مان گئے ہیں۔

فضا اسے گھربلا رہی تھی اس کے اصرار پہ اس نے آنے کی ہامی بھری۔

☆☆☆

منسوب اس کے قصے اوروں سے بھی تھے لیکن وہ بات بہت پھیلی جو بات چلی ہم سے فضا کے اصرار پہ وہ آتو گئی تھی لیکن فضا اور یاد کے ساتھ جو ہستی موجود تھی اس نے اسے

دروازے سے ہی پلٹنے پہ مجبور کر دیا، اس سے پہلے کہ وہ نکل جاتی فضا نے اسے پکڑ لیا۔

”پلیز فز، تھوڑی دیر تو رکھو۔“

”اگر مجھے خبر ہوئی کہ یہ سب تمہارا پلان ہے تو میں کبھی نہیں آتی۔“ وہ بے حد غصے سے ہنسی فضا سے اپنا آپ چھڑا رہی تھی۔

”آپ زحمت نا کریں افریثم حیات، میں ہی آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہوں۔“ ریان مرزا بھی اسے دیکھ کر بے طرح چونکا تھا، تقریباً اک سال بعد دونوں ایک دوسرے کے رو پر دتھے، اسے دیکھ کر افریثم حیات کے چہرے پہ جتنی نفرت پھیل گئی تھی، اس نے ریان مرزا کے دل کو نہیں پہنچائی تھی، اس کے لبوں سے اپنا نام سن کر افریثم حیات کے لب بھیج گئے تھے، اس کے چہرے پہ موجود بے زاری اور نفرت دیکھ کر ریان مرزا نے اپنی جگہ سے اٹھنے میں ایک پل کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ اٹھا تھا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا، یاد تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا فضا، جس انسان کی صورت مر کے بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی، تم نے اس سے ملوانے کا پلان بنایا، اب سے تم سے بھی بہتر، کھانا انہیں اس پہ بھی غور کروں گی۔“ فضا کو قطرہ قطرہ سنبھالتے رکھتے والی افریثم حیات جیسے اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔

ریان مرزا کو سامنے پا کر جہاں محبت اڑیاں رگڑنے لگی تھی وہیں اپنی عزت نفس کی موت اس کے اندر ٹین کرنے لگی تھی۔

”فز، تمہیں جو کرنا ہے کر لینا، لیکن پلیز پہلے میری بات سن لو، تمہیں رب کا واسطہ۔“ فضا نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ وہ بات سنے نہ جاتا سکے۔

کی گاڑی پر رالر چڑھ دوڑا۔ ”فضا کہہ رہی تھی اور
افریثم حیات جو اٹھا کر جانے کی کر رہی تھی بے
یقینی سے فضا کو دیکھنے لگی، اتنی بڑی بات وہ فرضی
نہیں کہہ سکتی تھی۔

”جائے حادثہ سے ان کے سیل فونز پیسے کسی
نے چرا لئے، ریان بھائی کو دوسرے دن ہوش
آیا، ان کا پیر بری طرح متاثر ہوا تھا کہ کئی سرجری
کے بعد بھی ان میں لڑکھاہٹ رہ گئی ہے۔“

ابھی جب ریان مرزا اٹھ کر گیا تو اسے کچھ
عجیب لگا تھا لیکن وہ غصے میں دھیان نہیں دے سکی
تھی۔

”جب ہمیں سچائی کا علم ہوا تو اندازہ ہوا، وہ
کس تکلیف سے گزر رہے ہیں، تم تو صرف
بارائت نہ آنے کی اذیت سے گزری ہو، تم انہیں
مجرم سمجھتی رہیں ایک بار سوچیں تو کہ وہ با وفا بھی تو
ہو سکتے ہیں۔“ فضا کہہ رہی تھی اور افریثم حیات کا
دماغ سن ہونے لگا تھا، اس کچ پہ تو اس نے سوچا
ہی نہیں تھا۔

”ہمیں لوگوں کو جج کرنے کی بڑی بری
بیاری ہوتی ہے ہم اپنی محدود سوچ سے ہی کسی کو
معتبر اور کسی کو نامعتبر ٹھہرا دیتے ہیں، پرکھنے سے
پہلے ہی اس پر فتویٰ لگا دیتے ہیں۔“ فضا نے اٹھ
کر دروازہ کھول دیا تھا کہ وہ جانا چاہے تو چلی
جائے، لیکن وہ ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔

”جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو اس پہ
کھل بھروسہ کرتے ہیں لیکن تم نے اس کی محبت
سے زیادہ اس کے برے خوالوں کو یاد رکھا، اللہ
رب العزت انسانوں کی خطا کو درگزر کر دیتا ہے،
پردہ رکھتا ہے لیکن بندے اتنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہر
نہیں کر پاتے۔“

”جس طرح تم اکیلی محبت کا ماتم کرتی رہی
ہو اسی طرح وہ شخص خود کو ادھورا سمجھنے لگا ہے، اسے

”کیا سنوں میں، کیا تاویل دوگی تم؟ ایک
دہن بنی لڑکی یہ زمانے والے کیسے بنتے رہے،
ایک بے بس ماں باپ کیسے تڑپتے رہے، اس
بات کا اندازہ نا تم کر سکتی ہو نا وہ مشر فلرٹی، اب
نہی تم کہہ رہی ہو بات سنوں؟“ افریثم حیات
چراغ پا ہو گئی، خاموشی چٹختے لگی تھی، وجود کے اندر
جو سناٹا چھا گیا تھا اب اس میں شور کو بجنے لگا تھا،
بے حسی کی دیوار ترخ گئی تھی۔

”مانا ریان بھائی کی شہرت ہمیں کبھی ان
کے متعلق مثبت سوچنے نہیں دیتی، تمہاری طرح
جب میں نے بھی سنا تو یہ ہی خیال کیا، میں اور
یاور کھوج میں لگ گئے لیکن انہوں نے بھی تمہاری
طرح خود کو کم کر لیا تھا، وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا
چاہ رہے تھے، مہینوں بعد جب یاور کو سچائی بتائی،
تب سے ہم دونوں چاہ رہے ہیں تم دونوں کا سامنا
ہو، لیکن ریان بھائی بھی نہیں مان رہے تھے، وہ
تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے، آج ہم نے
انہیں بھی اصرار کر کر کے بلوایا تھا، تمہاری طرح وہ
بھی بے خبر تھے کہ تم یہاں آؤ گی۔“ فضا جلدی
جلدی کہہ رہی تھی۔

”تمہیں اتنی محنت کرنے کی ضرورت نہیں
تھی، دروازہ کھولو، مجھے گھر جانا ہے۔“
اسے ماضی کی کسی بات میں دلچسپی نہیں تھی،
وہ جلد سے جلد یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی، دل
جیسے بکھر سا گیا تھا۔

”فری پلزز اک بار ٹھنڈے دماغ سے
میری بات سن لو۔“ فضا اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ
بیٹھ گئی تھی، افریثم بھی بے دل سے ذرا سا ٹک گئی
کہ فوراً ہی اٹھ کر چلتی بنے گی۔

”شادی سے ایک دن پہلے ریان بھائی
تمہیں منہ دکھائی میں بنگلہ دینا چاہتے تھے، ان کا
ارادہ تمہیں وہیں رخصت کروا کر لانے کا تھا ان

سے بولی تھی۔

”اب کیوں بات کر رہی ہو، جواب طلب کر رہی ہو، اب کس نے میرے کیکڑے شوقیت دکھا دیا تمہیں جو میں تمہاری نظر میں معتبر ہو گیا؟“ وہ برس بڑا تھا، لہجے میں غصے کے ساتھ دھک کی واضح آمیزش تھی۔

”جسے شدت سے چاہو، اس کی نظر میں نامعتبر ہونے کا دکھ تم کیا جانو افریثم حیات۔“ اس کی بے اعتباری میں وہ سال بھر جلا تھا اور یہ جلن یہ کھولن اس کے لہجے میں آسایا تھا، وہ سننے پر مجبور تھی کہ غلطی اس سے ہوئی تھی۔

”آج پوچھ رہی ہو بتایا کیوں نہیں، کسے بتاتا؟ اس نے جس نے یہ ہی گمان کیا کہ اک فکری بارات نہیں لایا، دھوکا دیا۔“ افریثم حیات ساکت و جامد اس کے دکھ سے پر اثرات دیکھ رہی تھی، یقیناً اس کی بے اعتباری نے ریان مرزا کے محبت سے بھرے دل کو ہمیں پہچانی تھی۔

”ہوش آنے کے بعد سب سے پہلے تمہیں کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی لیکن تم نے رابطے کے تمام ذریعے بند کر دیے تھے اور پھر نیویارک چلی گئیں، جس لمحے مجھے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت تھی تم نے ان لمحوں میں مجھے بے اعتبار ٹھہرا کر تنہا چھوڑ دیا، تم میری اذیت کا اندازہ کر سکتی ہو؟“ وہ دل شکن لہجے میں کہہ رہا تھا اور افریثم کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

”میرے یوں غائب ہونے کا دکھ میری ماں برداشت نہ کر پائی اور ہارٹ ایک کے باعث چل بسی، پیاپہ تو غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، جوان بیٹے کا کچھ پتا نہیں تھا اور وفادار شریک حیات بھی ساتھ چھوڑ گئی، اسی پریشانی میں تم لوگوں سے بروقت رابطہ نہ کر سکے اور جب تک تم

تمہاری محبت، تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے افریثم، وہ تمہارے لئے ہی محل سجانے گیا تھا اور خود اس کی ذات کھنڈر بن گئی، جاؤ جا کے سیٹ لو اسے۔“ یاد رہے اس لمحے اندر آیا تھا، اس کے لفظ لفظ افریثم حیات کے دل پہ آنسو گرا رہے تھے، وہ شخص تنہا اذیتیں سہتا رہا اور وہ اسے مجرم سمجھ کر تنہا چھوڑ گئی، پلٹ کر پوچھا تک نہیں، یاد رہا تو صرف براحوالہ۔

”ہم انسان بڑی عجیب ذہنیت رکھتے ہیں اگر ایک شخص برائی چھوڑ کر اچھائی اپنا بھی لے تو ہم اس کے برے حوالوں کو فراموش نہیں کر پاتے، خواہ اچھا بننے کے لئے اس نے لاکھ جتن کئے ہوں اور یہ ہی فاش غلطی افریثم حیات سے ہوئی تھی، ایک برے حوالے یہ ریان مرزا کی ساری اچھائی اس کی ذات مانس ہو گئی تھی۔“ یاد رہے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس کے قدم بے ساختہ بالکنی کی اور اٹھ گئے۔

دونوں ہاتھ گرل پہ رکھ کر وہ آگے کوچکا ہوا تھا، اس کی چوڑی پشت اس کی طرف تھی، شاید یاد رہے اسے بھی زبردستی روکا ہوا تھا تب ہی وہ کہیں سکون سے بیٹھنے کی بجائے کھڑا تھا۔

آہٹ یا کر ریان مرزا نے گردن موڑ کر دیکھا تھا، افریثم حیات کو دیکھ کر وہ چند قدم آگے بڑھ گیا تھا، گویا واضح اشارہ تھا وہ بھی بات کرنے کو تیار تھا اور وہ اس میں حق بجانب بھی تھا، اس کی چال کی لو کھڑا ہٹ گو کہ معمولی تھی لیکن اس نے بغور ملاحظہ کیا۔

”بتا نہیں سکتے تھے، اتنا بڑا حادثہ ہو گیا؟“ وہ چند قدم چل کر اس کے ساتھ بالکنی میں آکھڑی ہوئی تھی، اس کے سوال پہ ایک لمبے کو سناٹا چھا گیا تھا، ریان مرزا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”جواب دو۔“ اس کی خاموشی پہ وہ دھونس

وہ حلیم لہجے میں کہہ رہا تھا، افریشم حیات نے اسے بغور دیکھا، اس کے اندر کے کلنڈرے پن کی جگہ بربادی آگئی تھی، وہ آج بھی وجہ تھا لیکن چہرے پہ اک سوز کی کیفیت درج ہو گئی تھی۔
 ”بہت بدل گئے ہو۔“ اس نے کہہ دیا۔
 ”وقت بھی تو بدل گیا ہے۔“ وہ پھیکے سے مسکرایا تھا۔

”پھر فلٹ نہیں کی کسی سے؟“ وہ کچھ جاننا چاہتی تھی۔
 ”تو یہ کر لی تھی اس کام سے، جب کسی سے جی محبت ہوئی تھی۔“

وہ دور آسمان پہ اڑتے پرندوں پہ نظریں جمائے جواب دے رہا تھا، دونوں کے بیچ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

”جب میرے نام تک سے نفرت ہو گئی تھی تو تم نے کیوں شادی نہیں کی؟“ وہ پلٹ کر اس کے استفسار کر رہا تھا، نظریں اس کی پھٹکی پلکوں پہ جمی ہوئی تھیں۔

”کیونکہ آج بھی اسی فلٹنی سے محبت کرتی ہوں، اس کی جگہ کسی اور کو نہیں دے پاؤں گی کبھی، بھلے اس سے نفرت ہی کیوں نہ کروں۔“
 اس کی آواز بھرا گئی تھی، لب کیکپانے لگے تھے، آنکھوں کے گوشے پھر سے بھینکنے لگے تھے، وہ پلٹ کر دور جانا چاہ رہی تھی، قدم اٹھتے تھے لیکن کلائی ریان مرزا کی گرفت میں آگئی تھی، رک گئی لیکن مڑی نہیں، ریان مرزا چلتا ہوا سامنے آیا تھا، اشک سے گیلے مڑگان کو اس نے بہت محبت سے دیکھا تھا۔

دلوں کی الجھنیں بوختی رہیں گی اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے اس نے ہولے سے شعر پڑھا تھا۔
 ”ہمارے بیچ بھی تو یہ ہی ہوا تھا نا، نا کسی

لوگ پاکستان چھوڑ چکے تھے ادھر تم لہن بنی انتظار کرتی رہیں اور میں نہیں آیا، مانا تمہارا مجرم قسمت نے بنا دیا لیکن سچائی جانے بنا مجھے مجرم قرار کر علیحدگی کا فیصلہ کرتے اک پل کو بھی تمہارا دل نہیں کانپا کہ دھڑکن کے بنا دل کس کام کا؟“ اس کی تاریسائی نقصان کی داستان سن کر اس کی سسکی نکل گئی تھی۔

”یاد رہے بتایا تم میرا نام بھی سنا گوارا نہیں کرتیں تو کس آس پہ رابطہ کرتا، اک پل کو بھی تمہیں خیال نہیں گزرا کہ میرے ساتھ کوئی سانحہ ہوگا۔“

”ساری زندگی فلٹ کیا تب لڑکیوں کو یقین دلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جس سے پہلی بار محبت ہوئی اسے ہی اعتبار نہیں ہوا میری محبت کا، تو ایسے بے اعتبار رشتے تو کیسے آواز دیتا؟“ بولتے بولتے اس کی آواز تیز ہو گئی تھی۔

افریشم حیات کو اپنی غلطی نظر آگئی تھی، اس نے اک پل کو بھی اس کے لئے مثبت انداز سے نہیں سوچا تھا۔

”مجھے میری غلطی نظر آگئی ہے، معاف کر دو۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”غلطی تمہاری نہیں میرے برے حوالوں کی ہے، جس نے تمہیں میرے لئے مثبت انداز میں سوچنے نا دیا۔“ اس نے حقیقت پسندی سے اعتراف کر لیا۔

”میں نے خصوصاً بڑی غلط حرکت کی، تم سے رابطہ منقطع کر کے۔“ اس کے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔

”لیکن تم بتاؤ اس ساری صورت حال میں، میں اور کیا کرتی کیا سوچتی؟“
 ”یہ سب یوں ہی درج تھا نصیب میں۔“

تھی، وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

”میری غلط شہرت کے باعث میرا بہت بڑا نقصان ہوا جن لمحوں میں، مجھے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت تھی تم ساتھ نہیں تھیں، پھر کبھی بے اعتبار تو نہیں کرو گی؟“ اس کے اندر کا ڈر زبان تک آ گیا تھا۔

”نہیں، کیونکہ مجھے سمجھ آ گئی ہے کسی بھی انسان کا ایک حوالہ ساری زندگی کے لئے معتبر نہیں ہوتا، برے حوالوں کو بھول کر ہمیں ہر کسی کو اچھا حوالہ بنانے کا موقع ضرور دینا چاہیے، ورنہ کوئی چیز نہیں، نا ہم نا ہمارے حوالے۔“

سچائی سے کیے تجزیے پہ ریان مرزا کے چہرے پہ سکون جھلکنے لگا تھا، اسے اپنے ماضی کے ریان سے نفرت سی ہونے لگی تھی، جس میں ذرا سی دل لگی نے اس کی ذات کو داغ دار کر دیا تھا اور دنیا اسے اسی حوالے سے یاد رکھے ہوئے تھی، بد نما داغوں کو مٹانے کے لئے وقت چاہیے ہوتا ہے اور ریان مرزا کو قوی امید تھی کہ وہ اپنے طرز عمل سے اپنے برے حوالے کا نقش بھی مٹا دے گا۔

”اور جو نا کروں پھر۔“ اس کے سنجیدہ چہرے پہ ماضی کا عکس دیکھ کر اس نے چھیڑنے کی سعی کی، بلاشبہ منفی حوالہ بہت برا اثر رکھتا ہے جو محبت جیسی چیز پہ بھی حاوی ہو جاتا ہے۔

”نا کرو، اب کے زبردستی اعتبار کرواؤں گا، جیسے محبت کرنے پہ مجبور کیا۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

☆☆☆

نے بولنے کی ضرورت محسوس کی ناکسی نے سننے کی، ایک نے برا حوالہ یاد رکھا تو دوسرے نے بے اعتباری پہ خاموشی کی چادر اوڑھ لی، لیکن اس ایک سال نے ہم دونوں کو باور کروا دیا کہ ہم ایک دوسرے کی جگہ کسی نہیں دے سکتے، کسی اور کو اس دل کا مین نہیں بنا سکتے، کیونکہ تو دھڑکن ہے، میں دل۔“ اس ساحر کا سحر ایک بار پھر چل پڑا تھا، افریشم حیات کی زبان تالو سے لگ گئی تھی۔

”ایک بار پھر میری دلہن بنو گی؟“ دھیمے سے سوال ہوا تھا، اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی تھی۔

”سوچ لو اچھی طرح، اب چال میں وہ روانی نہیں۔“

”تمہارے چال چلن پہلے کون سا ٹھیک تھے۔“ وہ روتے روتے بے ساختہ بولی تھی، وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”لیکن اللہ گواہ ہے، صرف باتوں کی حد تک ہی فکر نہ کیا تھا اور یہ میں تمہیں پہلے ہی کیئر کر چکا تھا۔“ وہ یاد دل رہا تھا، اس کی محبت کی شدتیں ہی تھیں جس نے اسے بھی محبت کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

”مجھ سے پہلے کتنی آئی گئیں، پروا نہیں، لیکن میرے بعد کوئی آئی تو جان سے مار دوں گی۔“ وہ ٹوک دھمکی آمیز لہجہ تھا۔

”مار دینا، کہو تو ایک سال کا ریکارڈ دوں؟“ وہ مسکرا دیا۔

”گھر بھجوا دینا۔“ انداز شاہانہ تھا۔

”اور کوئی حکم؟“ وہ ہنسا۔

”ابھی مجھے گھر لے چلو، انکل آئی شاید مجھے دیکھ کر خوش ہو جائیں، اس کے بعد ممّا، پپا سے ملواؤں گی۔“ وہ پروگرام بتا رہی تھی۔

”افریشم!“ ریان مرزا کی پکار غیر معمولی

قادر سیّد جمالی
مطابقتی



طرف عجیب سا سکوت طاری تھا، لاؤنج میں ہر شے قریب سے رکھی تھی مگر مشال کو نا جانے کیوں بے ترتیبی کا احساس مضطرب کرنے لگا تھا، شاید یہ کیفیت اس کے اندر کی بھی جو باہر کے ماحول میں خواہ مخواہ ہی محسوس ہو رہی تھی، مگر حال ہوتے وجود کو صوفی پر گرا دیا اور بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں، نا جانے کتنے ہی پل یوں ہی چپ چاپ سے گزر گئے اور اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اس کا شوہر اسفر علی جو ملک کا نامور وکیل تھا کب اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔

”آج شام کی چائے نہیں ملے گی۔“ اس محبت بھری دستک پر اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو احساس ہوا کہ وہ کتنی غافل بیٹھی تھی۔
 ”ارے آپ کب آئے؟“ ملازمہ کو چائے کا کہتے ہوئے وہ تھکے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی، چہرے پر حتی المقدور مسکراہٹ سجانے کی سعی کی تھی۔

”بس کچھ دیر پہلے، شاید آپ حالت مراقبہ میں تھیں یا پھر حالت استغراق میں جو میرے آنے کی خبر نہ ہوئی۔“ لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔
 ”کوئی محسوس کرے تو ٹھیک اور نہ کرے تو بھی ٹھیک۔“ اسفر علی مشال کی اس حالت سے اب بیزار رہنے لگا تھا، کبھی کبھار لطیف سا طنز زبان سے پھسل ہی جاتا تھا، مشال بھی تو دل پہ لیتی اور کبھی اسے دل تک پہنچنے ہی نہ دیتی، اس بار بھی اسفر کی بات پر وہ مدہم سا مسکرائی تھی، ملازمہ چائے کی ٹرالی لے کر آ چکی تھی۔

”زبیدہ! گڑیا کو دوادے دی تھی؟“ ملازمہ چائے کے لئے پلٹی تو مشال نے ا یکدم ہلکا کر دیا بتاؤ لے تا بعد اری سے سر ہلا کر جواب دیا تو مشال کے چہرے پر اطمینان کی کرنیں پھیل گئیں۔

ہاسپٹل میں تھکاوٹ سے بھرپور دن گزارنے کے بعد وہ گھر لوٹی تو جان لیوا خاموشی نے سیاہ چادر اوڑھے اسے جھک کر فرشی سلام پیش کیا تو اس کے اعصاب گیلی ریت کی طرح پوچھل ہو گئے، وہ ہاسپٹل میں شعوری طور پر پوچھل سوچوں کو خود سے دور رکھنے کی سعی کرتی تھی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہتی تھی، بیماروں کو حکم خداوندی سے اپنی سیمائی سے شفا بخشنے والی ڈاکٹر مشال گھر آتے ہی اس کنبیر سوگواریت اور سنائے کے نرنے میں آ جاتی تو دن میں اس خاص محرومی کا احساس دل جلانے لگتا تھا۔
 شام ہونے کو تھی اور لان میں آگئی، کھلی فضا میں خود کو تازہ دم کرنے کے لئے گہری سانس لی تو دھند کی ہلکی سی ہاسپٹل کے ذریعے اندر داخل ہو کر دل و دماغ کو وقتی طور پر سکون دے گئی۔

دسمبر کا آغاز، یہ اداس شامیں اور یہ تنہائی اس کارور کا معمول تھی، وہ لان میں سنگ مرمر کی شفاف چمکتی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی، خالی الذہن نظروں کو ایک سمت سے دوسری سمت گھمائے جا رہی تھی، بے مقصد اور بے وجہ، کہ نظر بے اختیار سورج کی طرف جا پھنچی، پھیکے تاریکی رنگ کا سورج ٹھنڈی وجہ سے تھکا ہوا انتہائی خفیف و نزار بوڑھے کی مانند لگ رہا تھا، جس کی آنکھوں میں نہ زندگی کی رت تھی اور نہ ہی بدن میں توانائی اس کی بے جان آنکھوں میں زندہ رہنے کی ناکام خواہش بجھتے ہوئے دیے کے آخری چنگاری کی طرح نظر آ رہی تھی، مشال کو اپنا آپ بھی اس تھکے ماندہ سورج کی مانند محسوس ہو رہا تھا، بہت سی حسرتیں نا تمام اور آخری سانس لیتی امیدیں، اس کے دل میں پھل پھل چانے لگی تھیں۔

جب اندھیرا پوری طاقت کے ساتھ پھیلنے لگا تو وہ دروازہ دھکیلتی اندر لاؤنج میں آ گئی، ہر

اگلوتے بیٹے کا اپنی پسند سے شادی کرنے کا فیصلہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا) سو اس موقع پہ انتقامی کاروائی کرتے ہوئے جلے دل کے پھپھوڑے پھوڑے۔

”ساری دنیا میں اپنی میحانی سے شفا باہنے والی خود اپنے لئے کچھ نہ کر سکی اور ایک منگول بچی ہمارے سر پر مار کر بڑا احسان کیا ہے کہ دیکھو جی، میں بے اولاد یا یا ناخچہ نہیں ہوں۔“ ساس صاحبہ آتے جاتے طفر کے تیر برساتیں۔

مشعال نے ایک حد تک صبر کیا اور سب سہتی رہی، مگر ضبطی لگا میں ڈھیلی پڑنے لگیں، وہ کوئی جاہل ان پڑھ عورت نہیں تھی جو یوں اس کو ہر وقت ذلیل کیا جاتا، وہ ذرا سا کچھ بول دیتی تو گھر کا ماحول تناؤ کا شکار ہو جاتا۔

”پھپھو! یہ تو اللہ کے کام ہیں، اس میں ماں کا کیا قصور کہ بچہ بیمار پیدا ہو یا تندرست۔“ ساس صاحبہ کو یہ بات بھی سنا کر دیتی، پہلے تو بہو سے دودو ہاتھ کیے جاتے پھر بھی پیٹ نہ بھرتا تو بیٹے کے سامنے بھڑاس نکال کر خود کو مظلوم اور اور بہو کو ظالم ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کرتیں، ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ منگول بچی کو پیدا کرنے کے جرم میں مشعال پر کیس کروادیں، وہ تو وکیل بیٹا کانوں کا کچا اور عقل کا اندھا نہیں تھا، اس لئے ماں کی باتوں کو صرف سنتا مگر دماغ میں جگہ نہ دیتا اور نہ ہی دل میں پناہ۔

وہ مشعال سے بے حد محبت کرتا تھا، جانتا تھا کہ یہ سب اوپر والے کی مصیبتیں ہیں، انسان اس کے فیصلوں میں داخل اندازی نہیں کر سکتا۔

”کتنے ارمان تھے کہ اگلوتے بیٹے کی اولاد کو گودوں میں کھلاؤں گی، مگر وہ منگول بچی جس کے منہ سے صرف رال ہی نکلتی ہے، نہ بولتی ہے اور نہ ہی سنتی ہے۔“ یہ ساس صاحبہ کے دل کا غبار

چائے کا کپ اسفر علی کی جانب بڑھایا جو اپنی فائل کی ورق گردانی میں الجھا ہوا تھا، اسفر علی نے ایک رسی مسکراہٹ اس کی جانب اچھائی تو وہ بھی دھیمسا مسکرائی، زندگی کتنی عجیب سی ہو گئی تھی، ہر چیز حساب سے تھی اور باتیں بھی نیچر تلی، مسکراہٹیں بھی پھیل جی جن میں محبت کی چاشنی نہ تھی، ان دونوں کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے، دنیا والوں کی نظر وہ ایک کامیاب اور آئیڈل کپل تھا، اسفر علی ملک کا نامور اور ذہین وکیل، مشعال علی قابل اور باصلاحیت ڈاکٹر، جس کی میحانی کے چرچے تو بیرون ملک بھی تھے، ان دونوں کی لو میرج تھی، دونوں کزن تھے، شادی کے ابتدائی ایام میں تو جذبات میں روانی کسی بہتی ہوئی شفاف جھیل جیسی تھی، جس میں سورج کی کرنیں اپنا کس جھوٹی تو جھیل کا حسن دوپالا ہو جاتا۔

پھر دھیرے دھیرے وقت گزرنے لگا اور جذبات کی روانی مدھم پڑنے لگی، جھیل کا حسن بھی ماند پڑنے لگا، کیونکہ اب سورج کی کرنوں میں وہ تمازت اور حرارت نہ تھی، یہ تبدیلی بے وجہ نہیں تھی، اللہ نے اس کامیاب جوڑے کو اولاد کی نعمت سے بھی نوازا مگر یہ نعمت ایسی تھی جس پہ شکر نہیں صرف صبر کیا جاسکتا تھا اور صبر وہ بھی جان لیوا تھا، گڑیا پیدا کی طور پر ذہنی معذوری کا شکار تھی اور نہ ہی قوت گوہاری اس کے پاس تھی کہ وہ اپنی توہمتی زبان سے انہیں ماما بابا کہہ کر پکارتی اور نہ ہی قوت سماعت کہ وہ ان کی محبت بھری پکار سن سکتی، اس آزمائش کو اسفر علی اور مشعال نے تو سہہ لیا مگر اس کا سہرا ل یہ سب ہضم نہ کر پایا۔

”لو بھلا، یہ کہاں کی ڈاکٹری ہے کہ ایک صحت مند بچی بھی پیدا نہ کر سکی۔“ پھپھو جواب ساس کے عہدے پر فائز تھیں جو بہو سے روز اول سے چڑی بیٹھی تھیں، (وجہ کوئی معمولی نہ تھی

مشعال پوچھتی بھی تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیا کرتا۔

”امی اور بہنوں سے ملنے گیا تھا۔“ اسفر نہایت سنجیدگی سے مختصر آبول۔

مشعال نوٹس کرنے لگی تھی کہ اب وہ اکثر اپنے گھر جانے لگا تھا اور مشعال اس سے بالکل بے خبر تھی، مگر اب اس نے خود بتایا تو مشعال کو اس کی خاموشی اور لہجے کی شگفتگی صاف محسوس ہونے لگی تھی، وہ جب بھی اپنی ماں سے مل کر آتا ہوں ہی طبیعت بیزاری دکھائی دیتی، بجھا بجھا چہرہ کسی گہری سوچ کا غماز ہوتا، ہر بات کا غائب دماغی سے جواب دیتا، انداز میں لافعلی کا غلبہ ہوتا، ورنہ اس کا معمول تھا وہ دن بھر کی روٹین مشعال سے ڈکس کرتا، اپنی بچی کو بالکل انور نہ کرتا، جیسی بھی تھی وہ ان کی اولاد تھی، اپنی معذوری میں وہ بے مقصد تھی، بلکہ زیادہ توجہ کی مستحق تھی، مگر اب رفتہ رفتہ اسفر کے معمولات میں تبدیلی آتی جا رہی تھی، وہ آفس سے آکر اپنی فائلز میں گن رہتا، گڑیا کے بارے میں بھی سرسری سا پوچھتا، مشعال کو دیکھ کر تو رسی سے مسکراہٹ چہرے پر بکھر جاتی۔

مشعال کو کسی حد تک اندازہ تو تھا کہ ساس اور نندیں اسفر سے کیا باتیں کرتی ہوں گی اندیشے دل کو سہانے لگے، خوف اور دوسو سے ستانے لگے۔

”کہیں، اسفر دوسری شادی کے لئے تیار تو نہیں ہو گئے۔“ وہم نے ڈنک مارا تو وہ بڑپ اٹھی۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ صاحب اولاد ہوتے ہوئے بھی بے اولادوں جیسے تھے وہ ایسی بچی کے والدین تھے جس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا، جو نہ مسکرائی تھی۔

تھا جو دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا تھا اور جب غبار حد سے بڑھنے لگے تو پھر آندھی اور طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، ان کے اندر بھی طوفان بپھر نے لگا تھا، وہ یہ کہ بیٹے کی دوسری شادی کر دیں کیونکہ ڈاکٹرز کے مطابق مختلف پیچیدگیوں کی وجہ سے مشعال دوبارہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔

”ہائے بیٹا کیا میں ایسے ہی دنیا سے چلی جاؤں گی پوتے پوتیوں کو کھلائے بغیر اور تو کیا یونہی بے نام و نشان رہے گا زندگی میں۔“ بیٹے کو دوسری شادی کے لئے ہر طرح سے راعب کرتی مگر لاکھ کوششوں کے بعد بھی وہ تانا تبا تو مشعال کو اپنی محبت کی مضبوطی عجیب سا احساس مسرور کرنے لگا، اسفر نے اس کشیدگی کا ایک ہی حل نکالا، مشعال کو لے کر الگ ہو گیا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے بہت خاموش ہیں؟“ وہ ایکدم سے خیالات کے سمندر سے باہر نکلی تو احساس ہوا کہ اس کی چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے اور اسفر چائے ختم کر چکا تھا، خاموشی کاٹ کھانے لگی تو اس نے خود ہی اسے مخاطب کر دیا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسفر یونہی فائلز میں غرق رہے گا اور پھر اٹھ کر سونے چلا جائے گا۔

”کوئی خاص بات نہیں، بس ایک پیچیدہ کیس نے پریشان کر رکھا ہے۔“ اسفر نے وجہ بتائی مگر لہجہ کچا سا تھا۔

دس سالہ رفاقت میں اتنا تو وہ جان چکی تھی اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ، لفظوں کی کچی اور درستی اب پرکھنے میں طاق ہو چکی تھی۔

”شام کو آپ شاید بہت بڑی تھے، میں نے کئی بار فون کیا، کہاں تھے آپ۔“ سوال بے مقصد سا تھا مگر اکثر افعال بے مقصد نہیں ہوتے، اسفر کا فون اب شام کو اکثر آف رہنے لگا تھا،

کے مشعل نے وہ بات کر دی جو کافی دیر سے روک رہی تھی، اصل میں وہ پرکھنا چاہتی تھی اسفر کو بھی اور خود کو بھی، وہ دیکھنا چاہتی تھی واقعی اس میں خیر زمین سے وابستہ رہنے کا حوصلہ ختم ہو گیا ہے، دل کو ابھی بھی یقین تھا کہ اسفر ہمیشہ کی طرح اس کی محبت کا مان رکھے گا اور جتنی سے ان باتوں کی نفی کرے گا ان کو بے حیثیت کر دے گا اور کہے گا مشعل میں تمہارے اور گزرا کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا، میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں، اللہ نے مجھے اگر وارث دینا ہوگا تو تم سے ہی دے گا۔

مگر یہ کیا، مشعل کا یقین تو کالج سے بھی زیادہ نازک اور کمزور نکلا، تنگ مرمر کے فرش پر گرا اور دور تک کرچیاں بکھرتی گئیں، جنہوں نے تا صرف مشعل کے پاؤں زخمی کیے بلکہ وجود میں بھی آچسپی۔

”کیا..... مشعل کیا تم ایسا سوچتی ہو؟“ وہ شخص جو پچھلے دو گھنٹے سے فائنل میں کھسا ہوا اسے انور کر رہا تھا، جس کے پاس مشعل کے لئے ایک نظر بھی نہ تھی، چند رسمی ہیلے اور پھکی مسکراہٹ کے بعد لہوں پہ قفل لگائے بیٹھا تھا، وہ یوں خاموش تھا جیسے لاؤنج میں تنہا ہو، ٹھنڈا ایکدم ہی بہت بڑھ گئی تھی کہ جس میں سرایت کرنے لگی، مشعل نے اٹھ کر آتش دان روشن کر دیا، تا جانے یہ کیسی ٹھنڈک تھی جو کرے میں تھی یا پھر اس کے وجود میں، جو اس کے جذبات و احساسات کو جہاتی چلی جا رہی تھی۔

اپنے اتنے اہم کام سے لائق ہو کر اب وہ مکمل طور پر مشعل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا، اس کی آنکھوں میں بے چینیوں کا جہاں آباد تھا، اس کی حالت اس بچے جیسی تھی جس کے سامنے چائیس کی پلیٹ بھری پڑی ہو اور وہ صرف اس وجہ سے روکا ہو کہ کوئی اسے روک رہا ہو، بس

نہ گھر میں رونق اور تقاریاں بکھیرتی تھی، نہ ہی اس کے شور و غل سے سناٹے دم توڑتے تھے، نہ ہی ان سے ضد کرتی تھی اور نہ ہی فرمائشیں، اس کا ساتھ ان کا حوصلہ نہیں بڑھاتا تھا کہ چلو بڑھاپے کی لاٹھی ایک ہی سہی موجود تو ہے، مگر یہ لاٹھی تو خود دیمک زدہ تھی، جس کے سہارے وہ چند قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے، بلکہ وہ تو خود سہارے کی محتاج تھی۔

”نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، اسفر مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے اور نہ ہی دوسری شادی کریں گے۔“

ہر عورت کی طرح اس کے اندر کی عورت نے اسے تسلی دی، اس کے شانے کو تھپکا، دل پیگماں کو خوش فہم سا بنایا، وہ اپنی محبت پر نازاں تھی، اپنی محبت پر مان جو تھا۔

”کوئی خاص بات ہے، آپ اب روز جانے لگے ہیں، یا پھر وہ روز بلانے لگے ہیں۔“ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے پھسلا۔

مشعل جانتی تھی کہ وہ لوگ اس کی برین واشنگ کیے بغیر اسے رخصت نہ کرتے ہوں گے، مشعل اب بھی ماں نہیں بن سکتی، معذور بچی کے طعنے، اور وارث کی خواہش تو وہ یوں کرتی ہوں گی جیسے بیچ کے دانے گن گن کر کوئی ذکر کثرت سے کیا جاتا ہو۔

”بس وہی باتیں، وہی موضوع، جانتی تو ہو تم۔“ اسفر کا لہجہ کسی کھوکھلے شجر جیسا تھا جواب اکھڑنے کے قریب دکھائی دے رہا تھا کیونکہ زمین کے ساتھ مزید وابستہ رہنے کی نیت اس میں ہمت تھی اور نہ ہی حوصلہ، مشعل کا دل دھڑکنے لگا۔

”باتیں وہ غلط نہیں کہتی اسفر، آخر وہ آپ کی ماں ہیں، آپ کی فکر کرتی ہیں۔“ دل کڑا کر

اجازت ملنے کی دیر تھی اور وہ اسے منٹوں میں جپٹ کر جائے۔

”جی بالکل ایسا ہی۔“ آتش دان سے نکلنے والی حرارت نے لمحوں میں کمرہ گرم کر دیا مگر مشعل کو اپنے وجود کی ٹھنڈک اب ٹھنڈھانے لگی تھی، وجود کو باریف کی سل بنا ہوا تھا جس پر ساری پیش اور گرمائش بے اثر ہو چکی تھی، نیوٹن یہ پیمکی مسکراہٹ اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو واضح کرنے لگی تھی مگر وہ اسے مخفی رکھنا چاہ رہی تھی۔

”اچھا، اگر ایسا ہے تو پھر مشعال۔“ چاکلیٹ کی پلیٹ جھپٹ کر اس بچے نے اپنی گود میں رکھ لی تھی۔

اسفر کے لمحے میں اب شوخی اور گفتگو کا راج تھا، اب وہ یوں محو گفتگو تھا جیسے بہت لطف اندوز ہونے والا ہے، گفتگو کا سارا روکھا اور کھر دراپن اب ملازمت میں تبدیل ہو چکا تھا، اس نے مشعال کے ٹھنڈے برف کی مانند ہاتھوں کو تھام لیا، جو سرد بھی تھے اور بے جان بھی، مگر اسفر کے پاس محسوس کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔

”مشعال، امی نے دو تین رشتے تو دیکھے ہیں۔“ وہ بولا۔

آہ تو ہم ہی ناواقف و نادان تھے کہ سمندر کی سطح پہ کھڑے تھے ورنہ بات تو گہرائیوں اور تہوں تک پہنچ چکی تھی، مشعال کے دل سے ہوک اٹھی، محمد آنکھوں میں اب امید کا کوئی دیا نہیں تھا، حقیقتیں خود بخود آشکار ہونے لگی تھیں، وہ جسے مضبوط ڈھال سمجھتی تھی، اپنا مان جانتی تھی وہ جو سمجھتی کہ اسفر کوئی مشکل اس پر آنے نہ دے گا، اب لگا کہ وہ تو تنہا کسی ڈھال کے کھڑی رہ گئی تھی، جس کا دل چاہے وار کرے کوئی روک ٹوک نہیں۔

”مگر؟“ بہت دیر بعد اسفر کے منہ سے یہ

لفظ نکلا تو مشعال چونکی۔

”مگر کیا؟“ محمد آنکھوں میں اب نہ زندگی تھی اور نہ ہی امید، بس استغہای خاموشی تھی۔

”ایک مسئلہ بیچ میں حائل ہے۔“

”کیا مسئلہ؟“

”مشعال امی نے لڑکی تو پسند کر لی ہے مگر

انہیں میرے بارے میں بتایا ہے کہ.....“ الفاظ ٹوٹنے لگے تو چہرے پر خفت سی نمایاں ہونے لگی، نظریں چرائی پڑیں۔

”کہ لڑکا تنویرا ہے۔“ اسفر نے خود ہی بے ربط جملوں کا اکٹھا کیا۔

دوسری جانب سکتے کی سی کیفیت تھی، مشعال نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑائے، اسے اب پیش کی خواہش نہ تھی۔

”مجھے غلط نہ سمجھو مشعال، میں تمہیں ہرگز طلاق نہیں دوں گا، مگر یہ سب میری مجبوری ہے۔“ وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔

”تو میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔“

انکھوں کو پوری طاقت سے نکلنے سے روا، وہ کمزور نہیں دکھائی دیتا چاہتی تھی، وہ پھرائی ہوئی آنکھوں سے اس سنگدل کو دیکھ رہی تھی جس نے ایک جھٹکے میں محبت کا بان چکنا چور کر دیا تھا اور بے خبر تھا، دل تو چاہ رہا تھا کہ خوب شور مچائے مگر خود کو روک کر رکھا۔

”تم گڑیا کو لے کر اپنے والدین کے پاس کینیڈا چلی جاؤ۔“ اب کی بار وہ لجاجت سے بولا۔

مشعال کے ہاتھ ایک بار پھر اس کی مضبوط گرفت میں تھے، جو اس کی اندرونی حالت کا اظہار تھا، قطرہ قطرہ مینہ برسنے سے پتھر میں شکاف ہو جاتا ہے ماں بہنوں کی باتوں نے اسفر

”میں نے آپ کو آزمانے کے لئے دل پہ پتھر کیا رکھا اسفر آپ نے تو مجھے سر تا پا چٹانوں تلے دبا دیا، میں نے تو صرف زبان سے کہا مگر آپ تو دلی طور پر تیار بیٹھے تھے دوسری شادی کے لئے۔“ یوں پہ منگراہٹ سجائے اسے دیکھتی رہی اور پھر ہولے سے اثبات میں سر ہلادیا۔

”واہ اسفر واہ زندگی سے فرار کا کیا خوب طریقہ نکالا آپ نے، ذرا سی محرومی پر آپ نے تو اپنی زندگی کا فیصلہ کر لیا مگر عورت کہاں جائے، وہ تو محرومیوں کا رونا بھی نہیں رو سکتی، اولاد کی محذوری کو وجہ بنا کر اس سے نجات بھی حاصل نہیں کر سکتی، اسفر آپ تو واقعی کامیاب وکیل ٹھکے، مان گئی آپ کی وکالت کو، اپنا ہی کیس کس مضبوطی سے لڑا کہ مدعی کی زبان کو ہی تنگ کر دیا، نہ ہی کوئی وکیل صفائی تھا کہ جراح کرتا اور نہ ہی کوئی فاضل جج جو (Objection) لگاتا اور یوں کیس تو پہلی پیشی میں ہی مکمل ہو گیا۔“ لڑکھڑاتے وجود کو سنھالنے کی ہمت ہی نہ ہوئی کیونکہ بھیدوں تلے ڈھلتی زمین نے ارد گرد کا ہر منظر غیر واضح کر دیا، دھند ہی دھند چاروں طرف پھیلتی چلی گئی۔

”واقعی وہ ایسا مسیحا تھی جس کے دست شفا میں اپنے لئے شفا نہ تھی، جس پر اپنی مسیحا کی بے اثر ہو چکی تھی۔“ دنیا بھر میں حکم الہی سے شفا ماننے والی اب تمام عمر اس رستے ہوئے ختم کے ساتھ گزارے گی، ٹھنڈ کے باعث دھند گہری ہونے لگی تو سارا ماحول ہی دھند میں چھپنے لگا تھا اور اس کا اپنا وجود بھی اب دھند کے اندر غائب ہونے لگا تھا۔“

کہا تھا نہ دل بنا عادی اس بے وفا کی بانہوں کا اب بتا کیا کردوں میں ان دبیر کی سرد ہواؤں کا

☆☆☆

کے دل کو بھی پکھلا دیا تھا، زندگی کی محرومی اب شدت سے محسوس ہونے لگی تھی، کہ گڑیا کا وجود اس فکشی کو دور نہیں کر پا رہا تھا، کیا وہ بے نام و نشان دنیا سے چلا جائے گا، وہ مرد تھا۔

آخر کب تک اس جہود تلے زندگی گزارتا اور مرد کہاں محرومیوں کو برداشت کرتا، ایک نیا جہان آباد کرنے کے لئے نکل پڑتا ہے، یہ تو عورت ہوتی ہے جو اولاد کی ہر محذوری اور کمزوری کو سینے سے لگائے رکھتی ہے، اپنی محبت کے سائے تلے زندگی گزارنا چاہتی ہے روحی سوکھی کھا کر بھی اپنے مجازی خدا کے قدموں میں پڑی رہتی ہے، اولاد کی محرومی کا سبب مرد ہو تو بھی صرف شکایت زبان پر نہیں لاتی، اس کے لئے تو مرد کی محبت اس کی توجہ اس کا قرب ہی سب کچھ ہوتا ہے، چاہے جتنی ریت پہ ہی بے سایہ و سائبان ساری عمر گزارنی پڑے۔

عورت اس وقت بالکل ٹوٹ جاتی ہے کہ جس مضبوط دیوار کا سہارا لے کر وہ امر نیل بنی تیزی سے چڑھنے اور پھیلنے لگتی ہے وہی دیوار کھوکھلی ہو کر اسے خود سے ہی الگ کر دے اسفر نے بھی مشعال کو خود سے الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، بس احسان عظیم یہ تھا کہ ایک مرد کا کہ وہ طلاق کی گالی نہیں دے رہا تھا۔

”بس تھوڑے عرصے کے لئے مشعال میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اور گڑیا کو اپنے پاس بلا لوں گا، یہ سب تو میں صرف امی کی خوشی کے لئے کر رہا ہوں میری جان۔“ مرد کی بھی عجیب منطق ہے عورت کے جسم سے روح بچ کر اسے بے دم کر کے کہتا ہے کہ میری جان تو صرف تم ہو۔

اسفر ملائمت بھرے لہجے میں بولے جا رہا تھا اور مشعال بے حس و حرکت اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

حدیث نبوی ﷺ

دے۔

- محبت کرنا اور محبت کو کھود دینا محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔
- عقلمند کہتا ہے میں کچھ نہیں جانتا مگر بے وقوف کہتا ہے میں سب کچھ جانتا ہوں۔
- کسی کو اتنا بھی نہ چاہو کہ بھلا ناچا ہو تو بھلا نہ سکو۔
- جو اپنے محسن کا ناشکرا ہے وہ اپنے اللہ کا ناشکرا ہے۔

شاذ بہ رفیق، اسلام پورہ لاہور
طلباء کی نفسیات

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کو عموماً بند رکھتے ہیں وہ عام طور پر مغرور ہوتے ہیں مگر تنہائی پسند ہوتے ہیں۔

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کو کھولتے اور بند کرتے رہتے ہیں وہ عموماً تالائق ہوتے ہیں مگر گھریلو مسائل بڑی خوبصورتی سے حل کر لیتے ہیں۔

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کھول کر رکھتے ہیں مگر لکھتے کم ہیں وہ عموماً ذہین ہوتے ہیں مگر وہ دوسروں کو اچھا مشورہ نہیں دیتے۔

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کی نب جان بوجھ کر دوسروں کو چھوتے ہیں وہ عموماً حاضر جواب ہوتے ہیں مگر انہیں زندگی میں کامیابی بڑی دیر بعد ملتی ہے۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔
”اللہ تعالیٰ کا خیال رکھ وہ تیری حفاظت کرے گا، جب تجھ کو مانگتا ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگ اور یقین کر لے کہ اگر تمام گروہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تجھ کو کسی بات کا نفع پہنچا دیں ہر گز تم کو نفع نہیں پہنچا سکتے، بجز ایسی چیز کے جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دی ہے، اگر وہ سب اس پر متفق ہو جائیں کہ تجھ کو کسی بات سے ضرر پہنچا دیں تو تجھ کو ہرگز ضرر نہیں پہنچا سکتے بجز ایسی چیز کے جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دی ہے۔“ (ترمذی شریف)

رابعہ علی، فیصل آباد

کام کی باتیں

- زندگی میں وہ راہیں اپناؤ جہاں سے کچھ حاصل کر سکو۔
- تیل کی طرح سہارا مت ڈھونڈو بلکہ درخت کی طرح سہارا بنو۔
- دوست ہزار بھی کم ہیں دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
- اگر روٹی سے عقل حاصل ہوتی تو دنیا کے بے وقوف بھوکے مر جاتے۔
- چھوٹے چھوٹے اخراجات کا خیال رکھو کیونکہ معمولی سوراخ پورے جہاز کو ڈبو دیتا ہے۔
- اس خوشی سے دور رہو جو کل غم بن کر دکھ

۳۔ شاعر وہ سپیرا ہے جس کی پٹاری میں
سانپوں کی بجائے انسانوں کے دل بند ہوتے
ہیں۔

عافیہ رحیم، سکھر

بڑی باتیں

- سخاوت بہشت کا ایک درخت ہے جس کی
شاخیں زمین پر جھکی ہوئی ہیں، جس نے اس
کی شاخ کو تمام لیا وہ اسے جنت میں لے
جائے گی۔ (حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
- تعجب ہے اس شخص پر جو خدا تعالیٰ کو جانتا
ہے اور پھر غیروں کا ذکر کرتا ہے اور ان پر
بھروسہ بھی کرتا ہے۔ (حضرت عثمان غنی)
- زبان کو شکوہ سے روک، لٹخوشی کی زندگی عطا
کی جائے گی۔ (حضرت ابو بکر صدیق)
- جو شخص اپنی قدر آپ نہیں کرتا اس کی قدر کوئی
دوسرا نہیں کرتا۔ (حضرت علی)
- سب سے زیادہ عقلمند شخص وہ ہے جو اپنی بات
کو اچھی طرح ثابت کر سکے۔ (حضرت عمر
 فاروق)

واجدہ امبر، حیدر آباد

سوچنے کی باتیں

- ☆ سورج کی طرح اپنی شخصیت بناؤ جو ہمیشہ
روشنی بکھیرتا ہے۔
- ☆ اپنا زخم اس کو مت دکھاؤ جس کے پاس مرہم
نہ ہو۔
- ☆ ہمت ایک ایسا ہتھیار ہے جو بزدل کو بھی
بہادر بنا دیتا ہے۔
- ☆ بوڑھے آدمی کا مشورہ جوان کی قوت بازو
سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔
- ☆ جو نام دل کی ڈائری پر نقش ہوا ہے کاغذوں
کی ڈائری پر تحریر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران بین کو خواہ مخواہ
استعمال کرتے رہتے ہیں اور انٹی سیدی می
لیکریں کھینچتے رہے ہیں، وہ عموماً حاضر
جواب ہوتے ہیں مگر ان کی پڑھائی میں
لچکپی کم ہوتی ہے۔

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران بین کو بار بار
منہ میں رکھتے ہیں وہ عموماً ہوشیار ہوتے ہیں
مگر کسی کی چیز کو حفاظت سے نہیں رکھتے۔

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران بین کا ڈھکنا
دوسرے ہاتھ میں رکھتے ہیں وہ عموماً لیکچر کو
سمجھ لیتے ہیں، مگر ان کے جذبات سرد ہوتے
ہیں۔

☆ ایسے طلباء جو کسی مسئلے کو حل کرتے وقت بین
کو بار بار کتاب پر مارتے ہیں وہ ریاضی میں
کمزور ہوتے ہیں مگر بہترین دیکنل ثابت ہو
سکتے ہیں۔

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران صرف خاص
خاص باتیں نوٹ کرتے ہیں وہ عموماً امتحان
میں اچھے نمبر حاصل کر سکتے ہیں مگر وہ کسی
کے صحیح دوست نہیں ہوتے۔

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پنسل کو دانتوں
میں دباتے رہتے ہیں وہ عموماً آرٹ میں
ماہر ہوتے ہیں مگر وہ جذباتی حوالے سے
بڑے حساس ہوتے ہیں۔

طاہرہ آصف، ساہیوال

قابل غور

- ۱۔ گر جانا بزدلی کی بات نہیں بلکہ گر کر نہ اٹھنا
بزدلی ہے۔
- ۲۔ کسی شہنشاہ کے تاج سے زیادہ ہمت قیمتی
موتیوں سے زیادہ چمکدار اور چاندنی رات سے
زیادہ پرکشش کوئی چیز ہے تو وہ وفا ہے۔

☆ کسی کا دل نہ دکھاؤ ہو سکتا ہے اس کے آنسو تمہارے لئے سزا بن جائیں۔
☆ زندگی خدا کی نعمت ہے اسے دوسروں کے وقف کر دو۔
☆ ایسا پھول مت بن جو خوش نما ہو مگر اس میں خوشبو نہ ہو۔

سعدیہ سرور، ملتان

بے چارہ سماج

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سماج کو قصور وار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو وہ منہ بسور کر کے گا کہ یہ سماج کا قصور ہے کوئی کمزور ہوا تو کہے گا کہ یہ سماج کی برائی ہے اور اگر کوئی بہت موٹا ہو گیا تو بھی سماج کو ہی کو سنا جائے، بالآخر طالب علم امتحان میں نفل ہونے کی وجہ سماج کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے، یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں۔

خدا کرے تجھ پر سماج کا ظلم ٹوٹے، یا اللہ اسے سماج کے بچے میں گرے یہ یا تمنا ہے چاہا تو سماج سر پر چڑھ کر بولے گا اور دعائیں بھی اس قسم کی ہوں گی، پیسہ دیتا جا بابا، خدا تجھے سماج سے بچائے، یا میرے اللہ مجھے سماج کی ظالم ہوا سے بچائیو، وغیرہ۔

فاطمہ محمود، لیہ

اللہ کی رسی

سورۃ آل عمران کی آیت 103 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
”اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور فرقوں میں نہ بیٹ جاؤ۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو نصیحت فرمائی ہے کہ اس رسی کو مضبوطی سے تمام لو جو اللہ نے قرآن حکیم اور سنت رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں عطا فرمائی ہے، اس رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان انفرادی اور اجتماعی سطح پر خدا کے وحدہ لاشریک ہونے پہ دل کی پوری صداقت سے ایمان لائیں اور اس ایمان پر راسخ رہیں غیر اللہ کو وہ مال و دولت ہو کہ اقتدار اہل و عیال کی محبت ہو کہ چاہر حکومت کا خوف، خود پر غالب نہ آئے دیں ہر چیز ان کے ایمان باللہ کا تابع رہے گی، وہ اللہ ہی کی عبادت کریں گے صرف اس کی امداد و استقامت پر بھروسہ کریں گے راہ حق میں ہر سختی، ہر آزمائش کو مبر اور استقامت سے برداشت کریں گے سابقہ امتوں کی طرح فردعات میں الجھ کر فرقوں میں بٹ کر نہیں رہ جائیں گے۔

عابدہ خان، روالپنڈی

اقوال زریں

- محبت جب دفاع میں ڈھلتی ہے تو امر ہو جاتی ہے۔
- خاموشی سے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔
- خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھو۔
- محبت وہ سلطنت ہے جہاں کوئی حکمران نہیں ہوتا۔
- مقصد کے بغیر زندگی ایسی ڈولتی کشتی ہے جسے اپنے ساحل کا پتہ نہ ہو۔

- جھوٹا سب سے پہلے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔

- غصے میں ایسی بات نہ کرو جس سے بعد میں ندامت ہو۔

- دنیا میں ہر شخص ایچھے آدمی کی تلاش میں رہتا ہے لیکن خود اچھا آدمی نہ بنتا۔

نصیب شیخ، کراچی

☆☆☆

ام خدیجہ
اگر ہوں پھول پر دہلی تو مت چھو بیوفا ہوں گے
وطن کے ہوں اگر کانٹے تو بھر لے اپنے دامن میں

تیز بارش کا مزہ لوٹنے والوں پہ نہ جا
وہ تیری خستہ مکانی کو سمجھتے کب ہیں

وقت کے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں
آئینہ گردشِ دوراں کو دکھانے والے
منم حیدر لاہور

اب میں یہ کہہ سکتا ہوں
ہجر کے صدمے سہہ سکتا ہوں
تو مچھڑا تو کیوں نے جانا
میں تنہا خوش رہ سکتا ہوں

احباب کو رہی میری عیوب کی جستجو
میں پر غلوں ان کے ہنر تو لا رہا

چاہ کر تم کو ہر خوشی گنوا دی ہم نے
زندگی تم کو سمجھا تو زندگی لٹا دی ہم نے
خواب تیرا سجایا پلکوں میں جب
چٹکیوں سے آنکھ کی روشنی گنوا دی ہم نے
زیبا ظفر سکھر سندھ

لحہ موجود کے اندر بھی لحہ امکان رہتا ہے
مجھے اکثر خود سے بھی بڑھ کر اس کا دھیان ہے
جو سرشاریاں عطا کرتا ہے ذہنوں کو
میرے پاس آ کر وہ کیوں بے جان رہتا ہے

یاد آتا ہے اس سے متعارف ہونا
خوشبو کا ہوا سے تعارف ہونا
دکھ کے آنسو کیوں بہتے ہیں غزل
ارماں تھا دل کا محبت سے واقف ہونا

دیران ہے تیرے بغیر یہ مگر
آ جاؤ کہ زندگی ہے مختصر
لوٹ کے پھر کب آیا ہے انجم
وقت گیا ہے جو اک بار گزر
سونیارہانی جام پور

تو جو مل جائے تو زندگی سنور جائے
نہ کر دسم اتنے کہ کوئی مر جائے

تیرا ملنا اک خواب جیسا
اور جینا ہے عذاب جیسا

اس طرف سمندر کے خوفناک تیز ہیں
اور ہم گھروندوں میں سپہاں سجاتے ہیں
دشتوں کے صحرا میں کون یہ بتائے گا
کس کو یاد رکھتے ہیں کس کو بھول جاتے ہیں
ناظمہ احمد کوئٹہ کینٹ

میں نے پوچھا زندگی کیا ہے
نہں پڑے پھول رو پڑی شبنم

یہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسل دی کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

بہت یہی تیز تھی یارو غم حیات کی دھوپ
لا جو زلف کا سایہ تو سو گئے ہم بھی

برا نہ مانے لوگوں کی عیب جوئی کا
انہیں تو دن کا بھی سایہ دکھائی دیتا ہے
فاطمہ محمود
بے وفا ہے ہو زمانے بھر کا
پھر بھی اچھا ہے زمانے بھر سے

فکر اک عمر میں احساس میں حل ہوتی ہے
بڑی مشکل سے طاقوں میں دیئے جلتے ہیں

فرصت شوق بن گئی دیوار
اب کہیں بھاگنے کا رستہ نہیں
عابدہ خان
فلک نے سر پہ کڑے وقت ہاتھ کب رکھا
جو خیر کی ہو توقع جہاں شر سے مجھے

فرصت ملے تو اپنی سماعت کر
میرے غموں کی لے بھی تیرے ہمتوں میں ہے

کھٹی دلوں کی محبت تو شہر بونے لگا
مٹے جو گھر تو ہویدا ہوئے مکاں کیا کیا
نصیب شیخ
گئے دنوں کا بھی مجھ سے یہی سلوک رہا
یہ رنگ دیدہ دل میں نے کب نہیں دیکھے

گنبد کا کیا قصور اسے کیوں کہوں برا
آیا جدھر سے تیز ادھر ہی پلٹ گیا

☆☆☆

کب تک بنے گا ذہن میں لفظوں کے دائرے
میں مسئلہ نہیں ہوں تو سوچا نہ کر مجھے
طاہرہ آصف
عشرت غم نے پھیر لیں آنکھیں
اب تیری یاد آ کے بہلائے

عطا میں یوں بھی گیا اپنی عمر سے آگے
کہ میرے ساتھ میری حسرتوں کا لشکر تھا

عشق گم گشتہ تو شاید ہی ملے تم کو جا
جینا چاہو تو جیو دوسری صورت لے کر
عافیر رحیم
عمر بھر ذہن میں چکا نہ کوئی فکر کا چاند
چاندنی اب ترے شعلوں میں جلایا جاؤں

اب ڈوب گئی ہیں وہ صدائیں
لوگوں سے کہو کہ لوٹ جائیں

اگر گرا تھا کوئی پرندہ لبو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
واجدہ امیر
اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برے

اب انہیں پرش حالات گزراں گزرے گی
بدگمانی ہے تو ہر بات گراں گزرے گی

افق یہ دیکھتا تھا میں قطار قازوں کی
مرا رقیق کہیں دور جانے والا تھا
سعدیہ سرور
ایک اجنبی کے ساتھ میں کہاں نکل آیا
یہ تو میری بستی کا راستہ نہیں لگتا

مجھے فکر ہے تو صرف اس کی
ج: جواب حاضر ہے۔

یہ راہ محبت کہتے ہیں پر خار بھی ہے اور دور بھی ہے
لیکن دل مضطرب کیا کیجئے مشتاق بھی ہے مجبور ہے
طاہرہ آصف -----

س: کبھی لمبے صدیوں جتنے ہو جاتے ہیں
کبھی سال یہ لمحوں میں مک جاتے ہیں

ج: دنیا بے ثبات میں ہر شے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے اور صبح کی ہے شام

س: کبھی آنسوؤں سے تھیلیوں پر پڑے چھالے
کبھی کوئی بے بسی سے انہیں چھپالے

ج: نازک خیال ال بھی ہیں موجود اے فلک
خالی رہا نہیں کبھی دریا حباب سے

عافیہ رحیم -----
س: انسانیت کی معراج کیا ہے؟

ج: انسان بننا۔
س: دنیا کا مشکل مرحلہ کیا ہے؟

ج: آدمی کا انسان بننا۔
س: تدبیر اور تعبیر میں کتنا فاصلہ ہے؟

ج: بہت ٹھوڑا۔
واحدہ امیر -----

س: پیہ چلتے چلتے رک کیوں گئے؟
ج: تم نے آواز جودی۔

س: سوچ لو پھر نہ کہنا؟
ج: سوچ بھی لیا کچھ نہیں کہوں گا۔

سعدیہ سرور -----
س: یہ دنیا والے بڑے بے وفا ہوتے ہیں؟

رابعہ علی -----
س: حنا کی محفل میں شرکت چاہتی ہوں پلیز

اجازت دیجیے؟
ج: اجازت ہے۔

س: حصول رزق حلال عبادت ہے آج کل کیسے
سمجھایا جائے؟

ج: ٹوٹ دے کر۔
س: جو لوگ حسد کی بجٹی میں جلتے ہیں ان کا علاج

بتائیں؟
ج: ان کو جلتے دو جب جل جائیں گے تو خود ہی
ٹھیک ہو جائیں گے۔

س: آپ کے پاس سے جلتے کی بو کیوں آ رہی
ہے سچ بتاؤ کون ہے وہ؟

ج: تم ہی تو ہو جو جل رہی ہو۔
س: میں نے سنا ہے آپ کی عینک بہت موٹی

ہے، ویسے کیا نمبر ہے؟
ج: کیا تم اپنی عینک گھر بھول آئی ہو جو میری

لگاتا چاہتی ہو۔
شازبہ رفیق -----

س: اسلام پورہ لاہور
س: نگون بھی خواب ہوا نیند بھی ہے کم کم،
کیوں؟

ج: بد بھنسی کی وجہ سے ہے۔
س: کیوں جان پر بن آئی ہے چھڑا ہے اگر وہ؟

ج: اس سے بھی پوچھو کہ تم سے کچھ کر وہ کتنا
خوش ہے۔

س: شعر کا جواب دیں۔
سب کو فکر ہے مگر اپنے آپ کی

نہیں؟

ج: لیکن میرے پاس جواب دینے کو بہت کچھ ہے۔

عالیہ وقاص ----- بہاؤ نگر

س: یہ بزرگ لوگ ہر وقت اپنے جوانی کے قصے کیوں سناتے ہیں؟

ج: اس کے سوا ان کے پاس اور ہوتا ہی کیا ہے۔

س: وہ پہلے سے آیا کچھ نہ کہا اور چلا گیا؟

ج: اس نے کسی کے آنے کی آہٹ سن لی ہوگی۔

س: میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں کروں یا نہ کروں چلو نہیں کرتے آپ بھی کیا یاد کریں گے کسی رئیس سے باللا پڑا تھا؟

ج: اپنے منہ میاں مٹھونے کی کوشش نہ کرو۔

س: عین عین جی تم آخر ہو کیا شے؟

ج: بس عین عین ہوں جو سمجھتا ہے سمجھ لو۔

ج: میں اب تک یہ سمجھ نہیں سکی کہ آپ سوالوں کے جواب کیا دیتے ہیں؟

ج: جواب سمجھنے کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

س: چلو جی مان لیتے ہیں کہ آپ بڑے عظیم ہیں لیکن ہم بھی کسی سے کم نہیں؟

ج: یہ میں نے کب کہا ہے آپ کسی سے کم نہیں ہیں تو میں ہی ہوں۔

س: سنو سنو اے دنیا والوں عین عین کی امر کہانی؟

ج: آپس کی باتیں دوسروں کو نہیں بتاتے۔

☆☆☆

ج: مجھے تو دنیا والوں میں شامل نہ کرو۔

س: کل میں نے اسے ڈانٹا تو یہاں نے بیانے لگا؟

ج: چھوٹا بھائی ہے پیار سے بھی بات کریں اس سے۔

س: میں جب بھی اس کی طرف دیکھتی ہوں تو نظریں جھکا لیتا ہے؟

ج: ابتداءے عشق جو ہے نا۔

س: میرا دل زور زور سے ہنسنے کو چاہتا ہے؟

ج: بڑی خطرناک علامت ہے۔

س: چپ چاپ میری بات سنو؟

ج: شکر ہے کچھ سنانے کا خیال تو آیا۔

س: یہ روگ مجھے اس جوگی سے لگا ہے؟

ج: سانپ کی چال نہ چلیں کیونکہ جوگی پڑ لیتے ہیں۔

س: یہ زندگی افسانہ ہے ناول ہے یا ناولٹ؟

ج: کچی کہانی بھی ہو سکتی ہے۔

عابدہ خان ----- روالپنڈی

س: میں کیا کروں مجھ سے کچھ نہیں ہو پاتا؟

ج: سارا دن لیٹے رہنا یہی حال ہوگا۔

س: میں نے سنا ہے کہ وہ؟

ج: کیا سنا ہے اس کے بارے میں۔

س: میں بھی کتنی نادان ہوں؟

ج: چلو اب پتہ چل گیا۔

نسب شیخ ----- کراچی

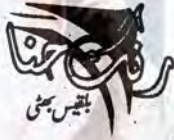
س: لوگ آسمان سے کیا چاہتے ہیں؟

ج: گرمیوں میں بارش اور سردیوں میں دھوپ۔

س: یہ دنیا والے محبت محبت تو کہتے ہیں لیکن محبت کرنے والوں کے دشمن ہوتے ہیں؟

ج: اسے فعل اور کردار میں فرق کہتے ہیں۔

س: اب میرے پاس پوچھنے کے لئے کچھ بھی



پروفیسر صاحب اطمینان سے بولے۔
”تم فکر مت کرو روچیں کبھی اپنے پرانے
جسم میں واپس نہیں جاتیں۔“

راجہ سعید، لاہور

شجرہ نسب

ابن انشاء اپنے شجرہ نسب پر روشنی ڈالتے
ڈالتے ایک پتے کی بات کر جاتے ہیں کہ آدمی
کے لئے کیا ایک ہی حوالہ کافی نہیں کہ وہ ابن آدم
ہے وہ کہتے ہیں۔

”پروفیسر محمد ایوب قادری ایک محقق آدمی
ہیں، شجرہ نسب مانگ رہے تھے ہمارے ہاں کہاں
سے آتا۔“

ہم نے کہا کہ ”بزرگوں میں ہمیں اپنے والد
کا نام دیا ہے ایک اور مورث اعلیٰ کا کہ اپنے
زمانے کے مشہور پیغمبر تھے، بولے کون؟“

ہم نے حضرت آدم کا نام بتایا تو عقیدت
سے ادھ موئے ہو گئے۔ (ابن انشاء کی تصنیف
”خمار گندم“ سے)

عاصمہ رضوان، خانیوال

گھاٹا

کرتے کرتے وہ یہ بات بھی کر گیا
مری محبت میں اسے گھاٹا پڑ گیا
پچھلے سال تھا جیب میں لاکھ روپیہ
سال کے بعد جیب میں سناٹا پڑ گیا
پچھلے سال چلتا تھا سپر اسٹور
اب کے سال ٹھیلہ فٹ پاتھ پر پڑ گیا

نکتہ چیں

ایک شخص کو بیوی کے کاموں میں نکتہ
چیں کرانے کی عادت تھی، ایک روز وہ دفتر سے
لوتا تو اس کی بیوی نے انڈہ ابال کر دیا جس پر اس
نے کہا۔

”آج تو میں نے آلیٹ کھانا تھا؟“
دوسرے روز بیوی نے آلیٹ بنا دیا تو وہ

بولے۔

”میں نے تو ابلا ہوا انڈہ کھانا تھا۔“
تیسرے روز بیوی نے سمجھداری سے کام
لیتے ہوئے ایک ساتھ آلیٹ اور ابلا ہوا انڈہ پیش
کیا جس پر شوہر ناراض ہونے لگا۔

”کر دیا ناں ستیاناس جس انڈے کا آلیٹ
بنانا تھا اسے ابال دیا اور جسے ابالنا تھا اس کا
آلیٹ بنا دیا۔“

عالیہ وقاص، بہاولنگر

فکر

لیکچر روم میں پروفیسر صاحب لیکچر دے
رہے تھے کہ ایک بات پر بحث شروع ہو گئی کہ
انسان کے مرنے کے بعد روچیں نہیں مرتیں، بلکہ
زندہ رہتی ہیں۔

کچھ شاگردوں کا نظریہ تھا کہ روچیں مرنے
کے بعد کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں،
اسی دوران ایک لڑکے نے اٹھ کر سوال کیا کہ۔

”اگر میرے مرنے کے بعد میری روح
کسی گدھے کے جسم میں چلی گئی تو پھر کیا ہوگا؟“

اس وقت ڈریسنگ روم میں ہیرن کے ساتھ کولڈ ڈریسنگ رہا تھا۔

”کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟“

کارندہ نے ایک چٹ پروڈیوسر کو دے دی، اس پر لکھا تھا۔

”میرے بتایا جاتے پچھلے پردے کے نیچے سے دے جاؤ ورنہ میں گولی کھانے کے باوجود نہیں مروں گا۔“

صنم حمید، لاہور

نشے باز

ایک شرابی نشے کی حالت میں ایک عورت سے ٹکرا گیا، عورت غصے کی ذرا تیز تھی، گالیوں کے ساتھ ساتھ اس نے شرابی کے دو ہاتھ بھی جڑ دیئے، شرابی کو بھی جواباً غصہ آ گیا اور وہ جل کر گویا ہوا۔

”میں نے پوری زندگی میں تمہارے جیسی بد صورت عورت نہیں دیکھی۔“ عورت شرابی کے اس جملے پر بولی۔

”میں نے بھی اپنی پوری زندگی میں تمہارے جیسا گھٹیا نشے باز نہیں دیکھا۔“

”میرا نشہ۔“ شرابی ذومتی انداز میں مسکرایا۔

”میرا نشہ تو صبح تک اتر جائے گا۔“

زویا ظفر، سکھر سندھ

☆☆☆

کل تک کھاتا تھا میں مگر فانیو اشارے کے آج مجھ کھانا لنگر سے پڑ گیا مری کوٹ پتلون سب مٹی ہیں بک نقطہ مرے پاس کرتا رہ پچامہ گیا مگر کر دیا جب سے میں نے تیرے نام سونا مجھے جب سے سڑک پر پڑ گیا حنا خان، شجاع آباد

ماہر امراض نسوان

ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھتے ہی بولے۔

”آپ کو تو عینک کی بہت عرصے سے ضرورت ہے لیکن آپ آج نظر چیک کرانے آئیں ہیں۔“

مریض نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”کمال ہے، آپ کو یہ بات میرا معائنہ کرنے سے پہلے ہی معلوم ہو گئی، آپ تو یقیناً تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

”تجربے کی تو اس میں کوئی بات نہیں ورنہ آپ بورڈ پڑھ لیتے، میں ماہر امراض نسوان ہوں۔“

ام خدیجہ، پشاور

مناسب موقع

اسٹج ڈرامے کے دوران ایک کارندہ ہانپتا ہوا دوڑا دوڑا پروڈیوسر کے پاس پہنچا، پروڈیوسر

”اعتزاز“

اس ماہ نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول ”پریت کے اس پار کہیں“ کی قسط اپنی طبیعت کی تاساری کی وجہ سے لکھ نہیں پائیں، انشاء اللہ نومبر میں ناول کی قسط شامل اشاعت ہوگی۔

میری ڈائری ہے

صائمہ محمود

رابعہ علی: کی ڈائری سے ایک نظم
”دستخط“

جب سے میرے
دل کے کورے کاغذ پر
تو نے دستخط کیے ہیں

تب سے
میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ

یہ میری نفرت کی ربڑ سے
مٹ جائیں، ختم ہو جائیں
لیکن میں ناکام ہو چکی

نہ یہ ہٹتا ہے اور

نہ کسی اور کا نام اس پر لکھا جاتا ہے
شاز یہ رفیق: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

میں اپنی ذات

انا اور خودداری کے سپرد کیے

منزل پہ منزل چلتی جا رہی تھی

یہ سوچے بنا کہ

کبھی کبھی ذات کی حفاظت کے لئے

انا اور خودداری بھی قربان کرنا پڑتی ہے

کبھی اک لمحہ کی خوشی کی خاطر

بڑا لمحوں کی غموں کی مسافت

کبھی طے کرنا پڑتی ہے

طاہرہ آصف: کی ڈائری سے ایک غزل

تم بن لیتے ہو ریشمی خواب

دھماکے کچے بھی ہوا کرتے ہیں

کہتے ہیں ناں چند لوگ محبت کو دعا

جذبے سچے بھی ہوا کرتے ہیں

اک جھوٹ قائم نہیں دنیا ساری
لوگ سچے تجھی ہوا کرتے ہیں
ماتا کہ ٹوٹا کرتے ہیں وعدے پیار کے
بندھن کچے بھی ہوا کرتے ہیں
بدنام تو زمانے نے کیا انہیں آڑ
دل والے اچھے بھی ہوا کرتے
عافیہ رحیم: کی ڈائری سے خوبصورت نظم
”مشورہ“

اپنی سب خواہشوں کا گلا گھونٹ کر

جسم و جاں کو نئی زندگی بخش دے

وقت یونہی نہ رورو کے ناشاد کر

یوں نہ اپنی جوانی کو برباد کر

بیٹے لمحوں کو ہر بل نہ اب یاد کر

خدا کی یاد سے دل کو آباد کر

مجھ سے بہتر طے گا تجھے مسافر

اے میری جان جان!

گز نہ ہو تیں مرے پاؤں میں بیڑیاں

ہنا کے دلہن تجھے لانا میں اپنے گھر

اے مری دلربا باب نہ آنسو بہا

بیٹے لمحوں کو جان و وفا بھول جا

بیٹے لمحوں کو جان و وفا بھول جا

یوں سمجھنا کہ ماضی اک خواب تھا

اک حسین خواب تھا

واجدہ امیر: کی ڈائری سے ایک نظم

تم سے اچھا تو یہ چاند ہے

جو نظر نہ آتا ہے

تم سے اچھے تو یہ ستارے ہیں

جودل کی بات تو سنتے ہیں
تم سے اچھے تو یہ آنسو ہیں
جوسدا آنکھوں میں رہتے ہیں
تم سے اچھی تو تمہاری یاد ہے
جو بھولتی ہی نہیں

مگر پھر بھی دل کہتا ہے
کہ تمہارے جیسا کوئی بھی نہیں
اس جہاں میں تمہیں بھی نہیں

سعدیہ سرور: کی ڈائری سے وہی شاہ کی غزل
اپنے احساس سے چھو کر مجھے مندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو
نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کے چاہو مجھے پاگل کر دو
تم ہتھیلی کو مرے پیار کی مہندی سے رنگو
اپنی آنکھوں میں مرے نام کا کاجل کر دو
اس کے سائے میں مرے خواب دیکھ اٹھیں گے
مرے چہرے پہ مہکتا ہوا آئینہ کر دو
دھوپ ہی دھوپ ہوں میں ٹوٹ کے برسوجھ پر
اس قدر ہر سو میری روح میں جل نکل کر دو
فاطمہ محمود: کی ڈائری سے ایک غزل

باندھ لیں ہاتھ پہ سینے پہ سجائیں تم کو
جی میں آتا ہے تعویذ بتائیں تم کو
پھر تمہیں روز سنواریں بڑھتا دیکھیں
کیوں نہ آنگن میں چنبیلی سا لگا لیں تم کو
کیا عجب خواہش اٹھتی ہیں ہمارے دل میں
کر کے منا سا ہاتھوں میں اچھالیں تم کو
کبھی خوابوں کی طرح آنکھ کے پردے میں رہو
کبھی خواہش کی طرح دل میں بلائیں تم کو
اس قدر ٹوٹ کے تم پہ ہمیں پیار آتا ہے
اپنی بانہوں میں بھرے مار ہی ڈالیں تم کو
عابدہ خان: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم
سوچ مگر کے باسیو

مت مرادل پریشان کرو
وہ لوٹ نہیں آئے گا
مت دل میں چراغ جلایا کرو
وہ آیا بھی تو

دلہیز سے لوٹ جائے گا
جب بھی مرے مگر آئے گا
مرادل بھی اب تو ہے
قید و بند بھرے میں
وقت کی فصیل کا

لگا ہے تالاسا
وہ لوٹ نہیں آئے گا
مت چینیغ امید جلایا کرو
نسب خ: کی ڈائری سے ایک نظم

اسے اپنے قرار کی فکر تھی
وہ جو میرا واقف حال تھا
وہ جو اس کی صبح عروج تھی
وہ ہی میرا وقت زوال تھا
میری بات کیسے وہ مانتا
میرا حال کیسے وہ جانتا
وہ تو خود منزل کے سفر میں تھا

اسے روکنا بھی محال تھا
کہاں جاؤ گے مجھے چھوڑ کر
میں پوچھ پوچھ کر تھک گئی
وہ جواب مجھے نہ دے سکا
وہ تو خود سراپا سوال تھا
کیا اس کا بیت حسن تھا
کیا اس کا رنگ جمال تھا
وہ ستارہ کہاں کھو گیا

جو اپنی مثال آپ تھا
وہ ملا تو صدیوں بعد بھی
میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا
میری چپ نے اسے رلا دیا

چکن جیلفز ری

سوس کا استعمال ضرور کریں سپیکٹھی
چکن اور پراؤن ا

آدھا کلو	چکن بغیر ہڈی کے
تین کپ	چکن بخنی
دو عدد کٹی ہوئی	پیاز
ایک کپ	ٹماٹر پیسٹ
Grated	خیر
آدھا چمچ	سفید سرکہ
ایک چمچ	سویا سوس
ایک کھانے کا چمچ	کالی مرچ پسلی ہوئی
ایک چائے کا چمچ	ادرک پسلی ہوئی
ایک پاؤڈر کا پیکٹ	ٹوڈل
پاؤڈر کپ	کھن
آدھا پاؤڈر	میدہ
ایک عدد	گاجر کٹی ہوئی ابلی ہوئی
آدھا کپ	مزا بلے ہوئے
دو عدد	شملہ مرچ کٹی ہوئی
حسب ذائقہ	نمک
ایک چائے کا چمچ	چائیز سالٹ
	ترکیب

کیل کو گرم کر لیں اور حسب ذائقہ پسلی ہوئی
ادرک ڈال کر بھون لیں تاکہ وہ براؤن ہو
جائے، اس میں مرغی ڈال کر براؤن ہونے تک
فرانی کریں، آج بھلی رکھیں تاکہ مرغی گل جائے۔
اس کے بعد ساری سبزیاں، کالی مرچ،
چائیز سالٹ، کھن، بخنی اور ٹماٹر پیسٹ مرغی

اشیاء
چکن (بغیر ہڈی)

آدھا کلو	گرم مصالحہ
چوتھائی کھانے کا چمچ	ادرک پسا ہوا
آدھا کھانے کا چمچ	لہسن پسا ہوا
آدھا کھانے کا چمچ	کالی مرچ پسلی ہوئی
آدھا کھانے کا چمچ	سویا ساس
دو کھانے کے چمچ	پیاز کٹی ہوئی
تین عدد	ٹماٹر کٹے ہوئے
تین عدد	بری مرچ
تین عدد	شملہ مرچ کھڑوں میں کٹی ہوئی ایک عدد
دو کھانے کے چمچ	شکر یا سفید سرکہ
ایک چائے کا چمچ	چلی سوس
	ترکیب

کیل گرم کر لیں اور مرغی کو اس میں فرانی کر
لیں، براؤن ہو جانے پر مرغی کو نکال کر ڈائریٹ
کاغذ میں جذب کر لیں، پھر کسی برتن میں ڈال کر
بھلی آج پر چولہے پر رکھ دیں پھر اس میں ادرک،
لہسن، پیاز، ٹماٹر، شملہ مرچ ڈال کر تھوڑی دیر
پکائیں اس میں نمک، کالی مرچ اور ہلدی پاؤڈر
بھی ملا دیں اس کے بعد ٹماٹر پیسٹ، سرکہ اور سویا
سوس اور چلی سوس شامل کر کے دس منٹ تک
مزید پکائیں، چولہا بند کرنے کے بعد اوپر سے پسا
ہوا گرم مصالحہ چھڑک دیں۔

بچے مزیدار چکن جیلفز ری تیار ہے،
کھانے کی لذت بڑھانے کے لئے شکر یا چلی

شکر یا سرکہ اور شکر یا سویا ساس ڈال دیں اور
ہلکا براؤن کر لیں پھر اس میں کئی ہونی بزیں بھی
شامل کر لیں اور تھوڑی دیر تک پکائیں
لیجے مزید ارچن شاٹلک تیار ہے، گرم گرم
پیش کریں۔

چکن فرائیڈ رائس

اشیاء
چاول
مرغی بغیر ہڈی کے ایلو ہونی سوگرام
اٹھ
سویا ساس
سفید سرکہ
گاجر کٹی ہوئی
چائیز سالٹ
نمک
کالی مرچ پسلی ہوئی
ہری پیاز
بند کوکھی
ترکیب
دو عدد
پانچ کھانے کے چج
دو کھانے کے چج
دو عدد چھوٹی
آدھا چائے کا چج
حسب ذائقہ
آدھا چائے کا چج
دو عدد کٹی ہوئی
آدھی کٹی ہوئی

چاول ابال کر الگ کر لیں خیال رہے کہ
چاول آدھے کچے اور آدھے ابلے ہوئے ہوں،
تیل گرم کریں اور اٹھ تل کر اس کے چھوٹے
کلوے کر لیں، چکن کے کلوے، ہری پیاز، بند
کوکھی، گاجر، کالی مرچ، نمک، چائیز سالٹ،
سویا سوس، سرکہ بخنی میں ملائیں اور پانچ سے
سات منٹ تک پکائیں، چاول شامل کر کے دم
آتے تک چھوڑ دیں، چکن فرائیڈ رائس تیار ہیں،
سلاد اور پٹلی سوس کے ساتھ خوش فرمائیں ذائقے
کو بڑھاتے گا۔

☆☆☆

میں شامل کر دیں اور اس کو مسلسل چمچے سے ہلاتی
رہیں اور اس وقت تک پکائیں جب تک پانی
خشک نہ ہو جائے۔

نوڈلز کو علیحدہ سے پانی میں ابال لیں اور
ٹھنڈا ہونے پر مرغی اور بزیوں کے ساتھ مکس کر
لیں اور تھوڑی دیر میں کسی برتن میں نکال لیں۔

برتن میں نکالنے کے بعد اس کے اوپر
Grated پیاز ڈالیں اور پانچ سے سات منٹ
کے لئے اوون میں رکھ دیں۔
لیجے مزید ارچن اٹھ
ذائقہ حاصل کرنے کے لئے سویا ساس کے ساتھ
پیش کریں۔

چکن/شاٹلک

اشیاء
چکن
نمک، مرچ
کالی مرچ، لال مرچیں
سفید سرکہ
سویا ساس
تیل
ٹماٹر
پیاز
شملہ مرچ
چائیز سالٹ
ادرک پیسا ہوا
لہسن پیسا ہوا
ترکیب
آدھا کلو
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
ایک کھانے کا چج
ایک کھانے کا چج
دو کھانے کے چج
آدھا کلو
آدھا کلو
آدھا کلو
ایک کھانے کا چج
ایک کھانے کا چج
ایک کھانے کا چج

چکن کو ایک کھانے کا چج لہسن اور ادرک کا
پیست ڈال کر ابالیں، پیاز، شملہ مرچ اور ٹماٹر کو
ایک سائز کے چھوٹے کلوں میں کاٹ لیں، تیل
گرم کر کے مرغی کا ہلکا فرائی کریں پھر اس میں
نمک، کالی مرچ، چائیز سالٹ، لال مرچیں،

ترقی بہت ضروری ہے، قصہ، طبیعت کی سختی بخلی،
بدگمانی حسد اور ہر قسم کا تعصب وہ بد صورت
روپے ہیں، جو زندگی کا حسن چھین لیتے ہیں، نہ
صرف دوسروں کی بلکہ انسان کی اپنی زندگی کی
خوبصورتی کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔

اپنا بہت سا خیال رکھئے گا، ان کا بھی جو
آپ کا خیال رکھتے ہیں آپ سے محبت کرتے
ہیں۔

آئیے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے
ہیں، دردِ پاک، استغفار اور مکمل طبیعت کا درد کرتے
ہوئے، یہ پہلا خط کنزیا محمد کا وہاڑی سے
موصول ہوا ہے وہ لکھتی ہیں۔

اکتوبر کا شمار سات کو ملا، مردِ ورق پسند نہیں
آیا معذرت، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری
باتوں سے روح کو تازہ کیا، انشاء نامہ میں انشاء
جی نے تاریخ کے مختلف ادوار سے متعارف
کروایا، آپنی مجھے آپ سے دو شکایت ہیں، ایک
یہ کہ آپ میرا خطوط شامل نہیں کرتیں اور دوسرا یہ
کہ یہ آپ نے کیا سلسلہ شروع کر لیا ہے، ہر تحریر
کے اینڈ پہ باقی اگلے ماہ منہ چڑا رہا ہوتا ہے
ناولٹ ہے تو وہ بھی اور مکمل ناولٹ ہے تو وہ بھی،
خدا کے لئے ایسا نہ کریں پورا مہینہ بندہ اسی
اجھن میں رہتا ہے کہ آگے کیا ہوگا تحریر میں، ایک
ہی نشست میں مکمل ناولٹ پڑھنے کا اپنا ہی حسن
ہے پلیر اس پہ ضرور غور کیجئے گا۔

”تم میرے پاس رہو“ دشمن کی تحریر، پہلی
قسط پسند آئی کرداروں سے پتا چل رہا ہے کہ یہ

السلام علیکم!

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے
ساتھ حاضر ہیں آپ سب کی صحت و سلامتی کی
دعاؤں کے ساتھ۔

دنیا جتنی بھی آگے بڑھی ہے، انسان نے
آج تک جتنی بھی ترقی کی ہے، انسان کا مقصود و
منہی، مادی آرام و آسائش اور مادی سہولتوں کا
حصول رہا ہے، اگر غور کیا جائے تو وحشی اور فکری
رج پر انسان میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی، تمام تر
سائنسی ترقی اور ایجادات کے باوجود انسان مادی
منافرت اور خود غرضی کی دنیا میں بھجک رہا ہے،
عہدِ حاضر کی بھگتی دوڑنی دنیا کے ساتھ دینے کی
کوشش نے جو افراطی کی فضا پیدا کی ہے، اس
میں سوچنے اور اپنے اندر کی حالت کو بہتر بنانے کا
عمل ہم بھول چکے ہیں۔

اقدار، اختیار، دولت، زندگی کو بہتر بنانے
کی خواہش غلط نہیں، زندگی کا لازمی حصہ ہیں لیکن
اس کے لئے درست راہ کا انتخاب کرنا ضروری
ہے۔

اپنی سوچوں میں رویوں میں نیکی، دیانت
اور سچائی..... سچ وہ ہے جو ہر تعصب سے بالاتر
ہو، کسی سے نفرت، کسی کو کم تر یا حقیر سمجھ کر رویوں کا
تعیین نا انصافی کی آخری حد تک لے جاتا ہے۔

درست رویے ہی زندگی کو کامیابی کی شاہراہ
تک لے جاتے ہیں اور خود آگہی سے خدا آگہی
کی منزل تک پہنچاتے ہیں، حقیقی خوشی کے لئے
اندر کا طمینان اور سکون قلب کے لئے روحانی

بھی چار پانچ اقساط سے کم نہیں ہوگا، ”تیرے عشق نچایا“ سدرہ اعجاز نے بے حد خوبصورتی سے مکمل کیا، بہت اچھی تحریر پسند آئی، جبکہ سونیا چوہدری کا ناول ”محبت کا فسوں“ بھی اچھا ہے بس اسے دو اقساط میں ختم ہو جانا چاہیے تھا، ناولٹ میں تحمین اختر ”شہر دل کا راستہ“ لکھ رہی ہے، پچھلی تحریروں کی نسبت یہ تحریر زیادہ پسند نہیں آئی جبکہ ”مئی رقص“ کو بشری آپنی بلاوجہ طول دے رہی ہیں، شارٹ جتنا اچھا تھا اب اتنا ہی پوریت کا شکار ہو رہا ہے۔

سلسلے وار ناول، دونوں ہی بہترین ہیں، افسانوں میں اس ماہ ایک نیا نام زر قاسم کا نظر آیا، امید ہے آگے چل کر تھاکے لئے اچھا اضافہ ثابت ہوں گئیں، اس کے علاوہ اسماء بدر، فوزیہ سرور، سباس گل اور فرحت انصاری نے بھی اچھی کوشش کی، سلسلے بھی اپنی اپنی جگہ بہترین تھے۔

کنزیا محمد خوش آمدید آپ کا نام بہت خوبصورت ہے، اس ماہ کا سرورق آپ کو پسند نہیں آیا، محضرت چاہتے ہیں آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے، جہاں تک بات ہے آپ کی شکایت کی تو چند ایہ پہلا خط ہی ہمیں ملا ہے آپ کا جو شائع بھی ہو رہا ہے جہاں تک ناول اور ناولٹ کی بات ہے تو ہم مجبور ہیں مصنفین ہمیں لکھ ہی اتنا طویل رہی ہیں کہ ہمیں یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا، کہ تحریر کو دو یا تین اقساط کی صورت شائع کرنا پڑا، امید ہے اب آپ کی شکایت دور ہوگئی ہوگی، ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکر ہے۔

فریحہ گل: فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔

”پریت کے اس پار کہیں“ میں بہت ہی مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں نایاب آپنی میں نے آپ سے جہاں کی زیادہ اسٹوری لکھنے کا کہا تھا

آپ نے تو اور ہی کم کر دی خیر شرہ کو اپنوں کے پاس دیکھ کر خوشی ہوئی پلیز آپنی یہ جو پلوٹج ہو رہا ہے اس میں جہاں دار کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔

”دل گزیدہ“ بھی اچھا جا رہا ہے ”مئی رقص“ میں قاریلط اور عروہ کوئی ملائے گا عیشی کا کردار مجھے بالکل پسند نہیں ہے، ”تیرے عشق نچایا“ بے حد طویل ناول تھا، سدرہ اعجاز آپنی اسے ذرا جلدی ختم کرنی خیر اچھا تھا، ”محبت کا فسوں“ بھی شاعرانہ رہا، ”تم میرے پاس رہو“

نے دل چھو لیا، ”شہر دل کے راستے“ بہترین تھا، ”رنگ خوشبو اور بہار“ میں اپنا عکس نظر آیا، رمشا محنت آخر رنگ لے ہی آئی، تو مجھے یقین ہے کہ میری محنت بھی رنگ لائے گی اور آپ میری کہانی بھی اپنے شمارے میں شامل کریں گی، ”بھرم“ میں بھی ماں باپ کی قربانیوں کا اندازہ ہوا کہ ماں باپ اپنی اولاد کی خاطر سب کچھ کر گزرتے ہیں، ”امید کے دیئے“ اور ”ابھی وقت ہے“ بھی اچھے تھے، مگر ”جنوں کا سفر“ دل چھو گیا بے شک اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اپنے بندوں کی سب سے بڑی حفاظت گاہ ہے مہک بے قصور ہو کر بھی جس مصیبت میں پھنسنے جا رہی تھی اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی عیبی مدد سے بچا لیا مگر اسے اس راہ پر لانے والی ٹیچر صدف وسیلہ بنی اووہ آج سرخرو تھی۔

فریحہ گل آپ کی اکتوبر کے شمارے کے لئے پسندیدگی کا شکریہ، افسانہ ابھی پڑھا نہیں قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا، آپ کی برائے مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے شکریہ۔

تبسم بشر حسین: ڈنگہ سے لکھتی ہیں۔

کہ فوریہ آپنی کیا ہم سے کوئی ناراضگی چل رہی ہے جو جون کے بعد ہمارا کوئی خط ہی شامل نہ کیا، ہمارا دل تو کرتا ہے کہ ہر ماہ حنا کی

خوبصورت محفل میں میرا نام ہو، حتا سے میری محبت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے ناراضگی کی وجہ سے ایسا اس ماہ تو خط لکھنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا پرنسٹن ٹو درشن آئی جنہوں کی تحریر نے آنے پر مجبور کر دیا ویکم بیک سن آئی، بہت انتظار کیا آپ کی تحریر کا، پلیز جلدی جلدی حتا میں انٹری دیا کریں اب ذرا حتا کی تحریروں پر بات ہو جائے، حتا اس دفعہ بہت لیٹ ملا دس گھنٹہ اور پورا ایک رات میں پڑھ ڈالا، ٹائٹل بورنگ لگا، لائن کٹرز کے خوبصورت ٹائٹل دیا کریں، اس کے بعد ”کچھ باتیں ہماریاں“ میں سردار طاہر محمود انکل کی بہن کے لئے دعائے مغفرت کی اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کریں آمین۔

حمد و نعت دونوں تو یہ پھول نے زبردست لکھیں، ”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ ہمیشہ کی طرح میٹھی میٹھی رہی، اس کے بعد انشاء نامہ بھی خوب رہا، پلیز ان کی شاعری دیا کریں، ”دل گزیدہ“ ڈائری مریم ایسا آپ میری موٹ فوٹ رائیٹر ہیں آپ کا لکھا میرے لئے ہمیشہ پسندیدہ رہا ہے مگر یہ تحریر..... افسوس کے ساتھ بالکل بورنگ ہے ذرا بھی اچھی نہیں ہے، میری گزارش ہے کہ اس ناول کا جلد از جلد اختتام کریں پلیز اور ایک نیا ”میرے سارے کچھ“ جیسا رومانٹک سا لکھئے، ایک فین کی ریکوئسٹ ہے اپنا ”پریت کے اس پار کہیں“ نایاب جیلانی جی آپ کی اسٹوری مجھے ذرا پسند نہیں ہے اب تو بہت طویل ہو چکی ہے اس کا اینڈ کریں پلیز، مکمل ناول بھی مکمل نہیں ہوتے یہ کیا سسٹم اشارت کر دیا ہے آپ نے اپنا، افسانوں کے علاوہ سارے اگلے ماہ؟ یہ تو بہت زیادتی ہے پلیز مصنفین سے بات کریں، اس طرح تو مزہ بھی نہیں آتا ہے اور دماغ کہانیوں میں ہی انکار ہوتا ہے۔

”تم میرے پاس ہو“ درشن نئی تھی تے گریٹ ہو، پہلی قسط لا جواب رہی اور اگلی قسط کا انتظار شدت پکڑ گیا، ”محبوبوں کا فسون“ سونما کی تحریر کی ساری اقساط ایک ساتھ پڑھوں گی، ”تیرے عشق نچایا“ سدرہ اعجاز کی تحریر کا اختتام پسند آیا، شکر ہے کہ طویل نہ کھینچا، اب حتا اصغر سے کہیں کہ ایک ناول لکھ ڈالیں، ناولٹ دونوں نے ہی مزہ خراب کر رکھا ہے بس اگلے ماہ، بڑھائے ہی جا رہے ہیں، ”شہر دل کے راستے“ شروع میں مزہ آ رہا تھا پڑھ کر اب تو دل اکٹا گیا ہے، بشری بھی بلا وجہ ناول کو طویل کیے جا رہی ہیں، اتنی طوالت سے بیزاریت پیدا ہو جاتی ہے، اس طرح تو حتا کا نام حتا نہیں جا رہی ہے پڑھ جائے گا، امید ہے کہ برا نہیں مانے گی آپ؟ افسانوں میں سپاس گل نے بیوی کی اہمیت بہت خوبصورتی سے لکھا، مجرم، جنون کا سفر، رنگ خوشبو اور بہار، ونڈر فل، امید کے دیئے، زرقا سکندر نے بھی اچھا لکھا لگتا ہے کہ نئی رائٹر ہیں، پراچھا لکھا تمام سلسلے لا جواب رہے بس ہمارا نام کہیں نہیں ملا، حاصل مطالعہ، میرا مڈورٹ ہے سارے سلسلوں سے منہا، رافعہ، ریجہ گل، طوبی کے خط پڑھ کر مزہ آیا، اب آخر میں ایک بات ہے وہ یہ ہے کہ مجھے حتا کی رائٹرز بہت پسند ہیں میں بھی ان کا حصہ بننا چاہتی ہوں، آپ نے کئی نئے لکھنے والوں کو موقع دیا ہے مجھے بھی دے دیں، دو ماہ پہلے میں نے اپنے مین افسانے بیچے تھے مگر پلیز پڑھ کر بتائیے گا کہ کیا قابل اشاعت ہیں۔

تبسم بشیر کیسی ہو؟ ارے یہ بات تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا کوئی آپ کی ہم سے ناراضگی ہے جو آپ اپنی رائے نہیں سچ رہیں حتا کی تحریروں کے متعلق، اکتوبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تحریر قابل اشاعت ہوئی

تو ضرور شائع ہوں گئیں، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔
منحہ رمشا: نے اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبولؐ اور پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں پڑھیں، اس خط کے ساتھ میں بھی ایک نعت شریف ارسال کر رہی ہوں پلیز شائع کیجئے گا، سب سے پہلے اپنی فیورٹ رائٹر ام مریم کی ”دل گزیدہ“ پڑھی، اس قسط میں غانیہ کی دعائیں بارگاہ الہی میں مقبول ہوئیں، اور حرم خیر و عافیت سے گھر آ گئی، لیکن عمر اور حجاب کو ملانے کے لئے آپ آپ سرمد کو حرم کیوں دے رہی ہو مجھے تو لگا تھا کہ ایزد جو کہ قدر کا بھائی ہے وہ اس کا ہیرو ہے، شکر ہے شانزے گھر سے نکلی ادیس کا بھی عبرت انگیز انجام ہونا چاہیے، قدر کا شانزے کے سامنے بھیگی ملی بنتا ہضم نہیں ہوتا، ناول اختتام کی جانب کا مزن ہے، شکر ہے پیام نشرہ تک پہنچ گیا اب اگلی قسط میں ان کے من کا انتظار ہے، پولوٹیج جلدی ہونا چاہیے اور شاہوار کہاں غائب ہے، ”تیرے عشق نہ پایا“ میں سدرہ آپلی علی عمر کو ہیرو ہونا چاہیے تھا عبدالباری کو شہید کر دیتیں، بہر حال اچھا ناول تھا، افسانے سبلی اچھے تھے لیکن رنگ خوشبو اور بہار پڑھ کے مزہ آیا، رمضہ کی کہانی شائع ہونے پر خوش ہوئی، آپی میرا نام بھی منحہ رمشا ہے اور میں بھی اپنی تحریر ”محبت کے رنگ نزلے“ ارسال کر رہی ہوں پلیز شائع کیجئے گا، انشاء اللہ میری تحریر قابل اشاعت ہوگی، ”افسانہ جنون کا سفر“ ہبک کا اللہ پر کامل یقین کا اچھا افسانہ تھا۔

منحہ رمشا اکتوبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کا افسانہ قابل اشاعت ہوا تو انشاء

اللہ ضرور شائع ہوگا، نعت شریف کے لئے ہم معذرت چاہتے ہیں اپنی رائے سے آگاہ کر لی رہیے گا شکریہ۔
انیلا طالب: گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں۔

دل کے سونے دیرانے میں کب سے یہ خواہش جاتی تھی کہ حنا کو خط لکھوں اور فوزیہ شفیق کی شفقت سے بنجر زمین پہ امید کی فصل کاشت کروں، محبت کے جگنو چاہت کے تھ پر سوار سرا کے ہوا کے دوش پر فوزیہ آپلی کو بھیج رہی ہوں مجھے یہ بھی معلوم نہیں آپ میری اس محبت کا جواب کس انداز میں دیں گی مگر میں سدا کی کم کدول کی باتیں دل میں رکھنے والی آج اپنی ساری عادت بھلائے اپنا دل آپ کے سامنے رکھ رہی ہوں پتہ نہیں کیوں میرا ڈیڑھ برس سے دل کرتا تھا آپ سے بات کروں، اپنی تحریریں بھجوانا تو محض ایک بہانہ ہے آپ سے تعلق بڑھانے کا ورنہ تو دیگر ڈائجسٹ شائع ہو چکے ہیں کچھ باری کے انتظار میں ہیں، ہائیکو شاعری کی کتاب ڈیڑھ دو مہینے تک آ رہی ہے مارکیٹ میں، ان مصروف گھڑیوں میں بے تاب دل سے آپ کو سندیدہ لکھ رہی ہوں، رہی بات میرے دو افسانوں کی وہ آپ جابیں اور آپ کا کام میں جواب کا انتظار کروں گی۔

انیلا طالب خوش آمدید اس محفل میں، ڈیڑھ سال آپ یہ سوچتی رہی کہ ”بات کروں یا نہ کروں“ ایسا کیوں ڈیر یہ آپ کا اپنا ماہنامہ ہے آپ کی رائے ہمارے لئے بہت اہم ہے، بہت شکریہ آپ کی پسندیدگی اور محبت کا، افسانے مل گئے ہیں قابل اشاعت ہوئے تو انشاء اللہ ضرور شائع ہوں گے شکریہ۔

☆☆☆